رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

۸۷

فروری ۱۹۶۱ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
ممالک غیر سے ۲۵ روپے

قیمت موجودہ شمارہ
تین روپے -/۳

ادارۂ فروغ اردو، لاہور

فہرس

مقالے

نظمیں، غزلیں

ناولٹ، افسانے، ڈرامے

نئی کتابیں

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبٹ روڈ لاہور سے شائع کیا

فہرس

مقالے

نظمیں، غزلیں

ناولٹ، افسانے، ڈرامے

نئی کتابیں

محمد طفیل پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

قرار داد رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان

"اراکین کا خیال عموماً یہ تھا کہ انتخابی پرچوں کی موجودہ روش سے اُردو کے سب رسالوں کی اشاعت پر اثر پڑ رہا ہے اور یہ صورتِ حال رسالہ نکالنے والوں کے علاوہ ادب کی اشاعت اور ترقی کے نقطۂ نظر سے بھی اچھی نہیں لیکن چونکہ یہ بات براہِ راست ادیبوں کا مسئلہ نہیں اس لیے یہ تجویز باتفاقِ رائے منظور ہوئی :۔

یہ طے ہوا کہ گلڈ چونکہ ادیبوں کی جماعت ہے اس لیے اس مسئلے کے صرف اس پہلو کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا چاہیے جس کا تعلق براہِ راست ادیب سے ہے۔ اور یہ طے پایا کہ انتخابی رسالوں سے کہا جائے کہ وہ کسی ادیب کی تحریر اس کی اجازت کے بغیر کسی رسالے سے نقل نہ کریں اور اسے حسبِ طلب رائلٹی کے طور پر معاوضہ بھی دیں۔ ہر تحریر کے لیے الگ اجازت نامے کی ضرورت ہو گی۔ عام اجازت حاصل کر لینا کافی نہیں۔"

(۲)

تمام انتخابی پرچوں کے نام سیکرٹری رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان کا مکتوب

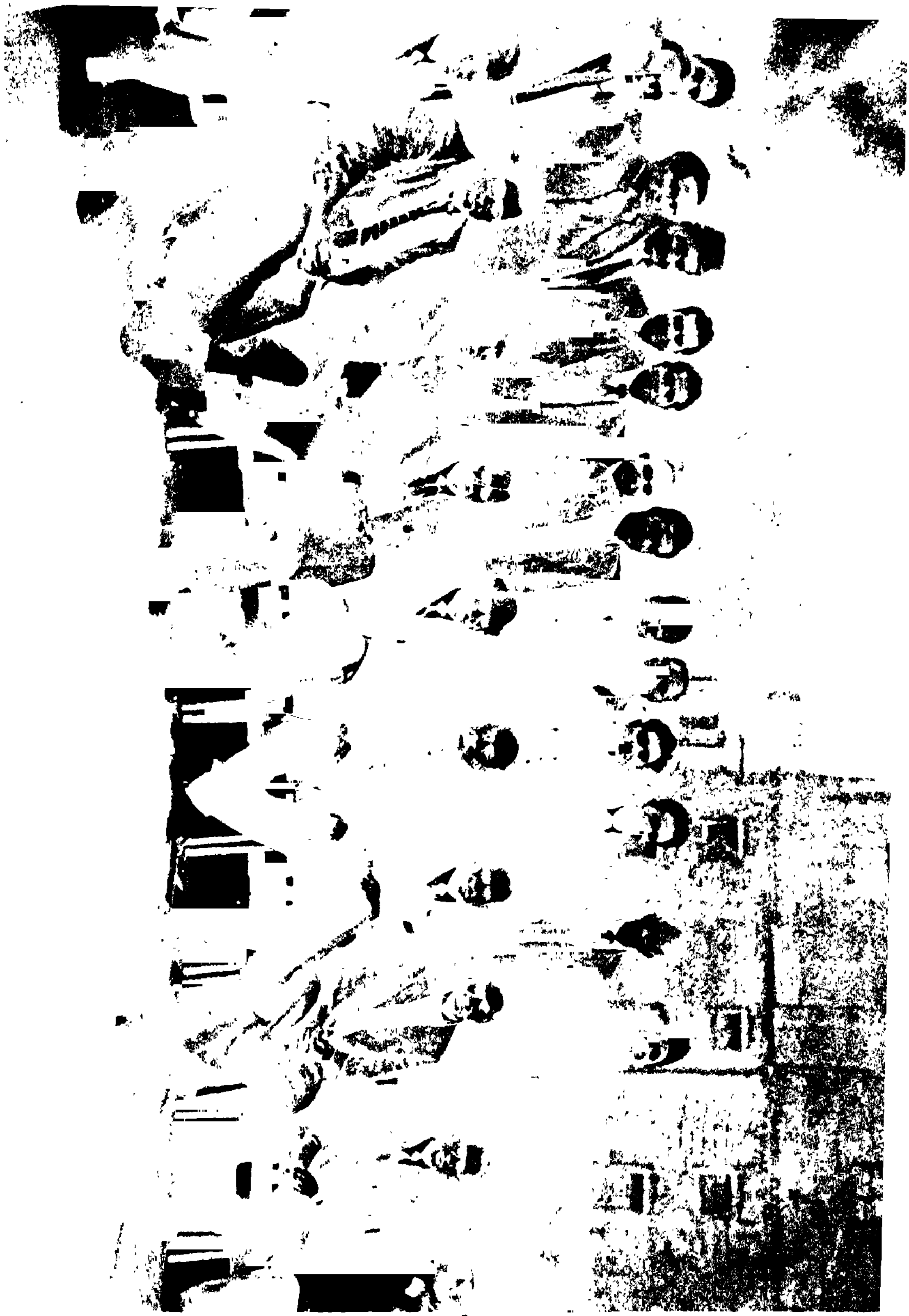
گلڈ کے ایک ممبر نے ہمارے پاس ایک تحریر بھیجی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ انتخابی پرچے ان ادیبوں کی تحریریں شائع نہ کریں جن کے اس تحریر پر دستخط ہیں۔ میں نے یہ تمام دستخط دیکھے ہیں۔ ان کی نقل آپ کی خدمت میں ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ ادیبوں کی اس خواہش کا احترام کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ کسی کی چیز اجازت کے بغیر نہ چھاپیں۔ اس لیے یقین ہے کہ اس کی طرف توجہ فرمائیں گے[1]

---

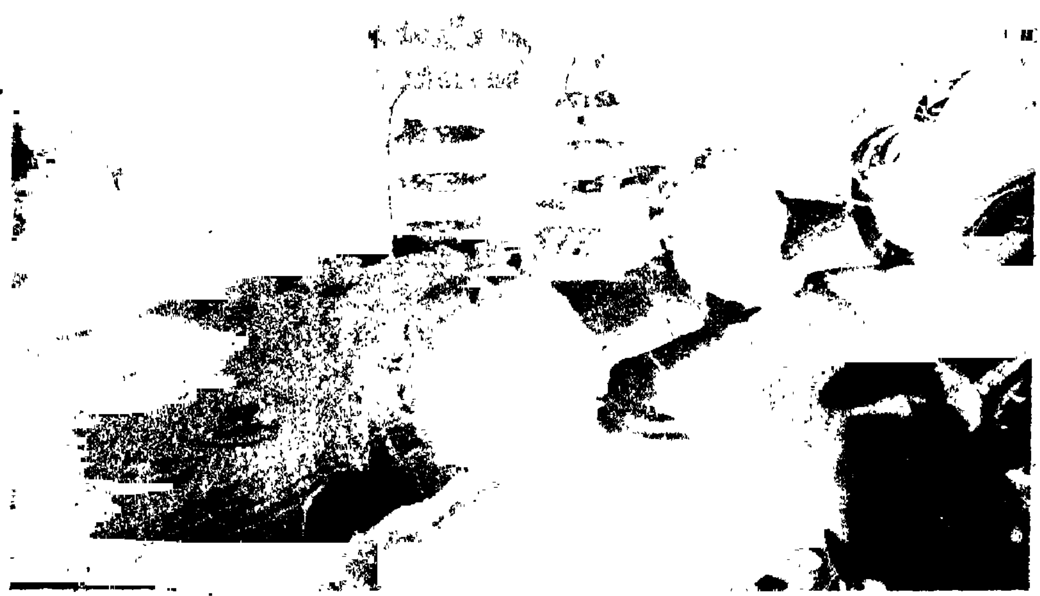
[1] ادیبوں کا عہد اور دستخط صفحہ ۳۰۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔



جوش ملیح آبادی ــ ادارہ نقوش میں







جوش صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں



تصویریں، اختر مرزا

ناقابلِ فراموش ادبی واقعات و شخصیات

مولانا عبدالماجد دریابادی

اپنے ہوش کی آنکھیں جب کھلیں، تو سمجھیے کہ اس بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ ادبی فضا پر حکمران اس وقت دو شخصیتیں تھیں۔ ایک شبلی، دوسرے شرر۔ سنجیدہ، علمی، فکری، و انقلابی قسم کے ادبیات کے فرماں روا شبلی نعمانی تھے۔ علی گڑھ کالج کے سابق استادِ عربی، الفاروق کے نامور مصنف، اور بڑے بڑے اہم اور معرکہ کے مقالوں کے مقالہ نگار۔ ان انگلیوں نے سب سے قلم پکڑنا سیکھا، روش اعظم گڈھ کے اسی مردِ عظیم کی، دل کو بھائی۔ اور پیروی اسی اسلوبِ نظم کی اپنے کو سرمایۂ فخر و افتخار نظر آئی۔ سرسید کی زندہ شخصیت کا آفتاب ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ اس چراغ سے اپنا چراغ جلا کر خود اُسے چمکتا دمکتا چاند بنا دینے والے، علاوہ مولانا شبلی کے کچھ اور بھی تھے۔ جیسے حالی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد۔ احترام ان سب کا پیشِ نظر رہا۔ لیکن حالی کی سادگی کچھ خشکی کے ڈانڈے چھوتی ہوئی نظر آئی۔ اور آزاد کی فلک پیما تخیل بلند پروازی کے آگے ہمت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بقول شخصے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔ عظمت اور اپنے ظرف و بساط کے مطابق ایک نذیر احمد نظر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شبلی کے بعد اگر کسی کے دربار سے کچھ تھوڑا بہت فیض حاصل ہوا، تو وہ نذیر احمد تھے، قرآن مجید کے مترجم اور مُبتلا و نصوح، ماما عظمت اور ہریالی، اصغری و اکبری کے چلتے پھرتے کرداروں کے خلاق۔

جب سن اور آیا، اور دماغ کو کالج کی ہوا لگی، تو دیکھا کہ فضائے ادب میں ایک نیا جھنڈا ابوالکلام آزاد کا بھی لہرانا شروع ہوا ہے۔ اس تنومند کی پہلوانی اور شہ زوری دیکھ زبان پر واہ وا تو بے اختیار آئی۔ لیکن دل و دماغ سے مشورہ کیا، تو ہمت ان کی راہ پر قدم اٹھانے کی نہ پائی ——— اُدھر انگریزی تعلیم نے دماغ میں طرح طرح کی آزادیوں اور آزاد خیالیوں کی ہوا بھری۔ مل اور اسپنسر اور ہکسلے، وقت کے بازارِ عقلیت میں چلتے ہوئے سکے تھے۔ انھیں اپنانے اور اُن کا چربا اتارنے میں ہاتھ نے خوب خوب اپنی صفائی دکھائی۔ افلاطون و ارسطو، ہیوم و بارکلے، ولیم جیمس اور ہنری برگسان کی بھی جیبوں پر ہاتھ ڈالنے کی نوبت کبھی کبھی آ گئی۔

دو الگ الگ دھارے ایک دوسرے کے متوازی بہہ رہے تھے۔ ایک دھارا، ذرا اونچے، علمی قسم کی بحثوں، موضوعوں کا، اس میں تو دلیلِ راہ شبلی نعمانی ہی رہے، کہنا چاہیے کہ شروع سے آخر تک۔ کیا الندوہ کے ایڈیٹر، اور کیا الکلام کے مصنف کی حیثیت سے۔ اور دوسرا دھارا، ہلکے پھلکے، ادبی افسانہ اور شعر و شاعری کے ادبیات کا۔ اس دوسرے قافلہ کے میرِ کارواں شرر صاحب ایک عرصہ دراز تک رہے، مع اپنے رومانی ماہنامہ دلگداز، اور اپنے ناولوں فردوس بریں، مقدس نازنین، حسن انجلینا اور فلورا فلورنڈا

کے ۔ لیکن اس ملک کی امیری و سرداری تنہا شرر صاحب کے حصّہ میں زیادہ عرصہ تک نہ رہی ۔ دوسرے بھی ان کی امارت میں حصّہ لگانے چلے گئے ۔ اُن میں ایک تو وہی مُتین اور معقول نذیر احمد دہلوی تھے، جن کا نام ابھی دو منٹ پہلے آپ سن چکے ہیں ۔ دوسرے راشد الخیری نکلے ۔ ان کا نمبر بھی کچھ کم نہ رہا ۔ ’’دو ورق انگریزی کے تو گویا بادشاہ تھے‘‘۔ ’’مصورِ غم‘‘ جس کسی نے انہیں کہا، وہ واقعی مردم شناس تھا ۔ تیسری ایک اور ایسی شخصیت خواجہ حسن نظامی کی نمودار ہوئی ۔ باغ و بہار نام کی ایک چھپی چھپائی کتاب سے تو آپ بھی واقف ہوں گے، یہ خواجہ صاحب اپنے قلمی چونچلوں کے لحاظ سے خود ایک مجسم باغ و بہار بلکہ سدا بہار نکلے! یہ سارے نام دلی والوں کے ہوتے لیکن اپنے ذہن نے نقش ان سے بھی کہیں گہرا لکھنؤ اور جوار لکھنؤ والوں ہی کا قبول کیا ۔ فسانۂ آزاد والے رتن ناتھ سرشار ۔ اودھ پنچ والے سجاد حسین کاکوروی ۔ ’’ریاض الاخبار‘‘ والے ریاض خیرآبادی اور حضرت اکبر الٰہ آبادی ۔ یہ سب زبان کے اُستاد تھے ۔ اور ان ناموروں کے علاوہ، ایک صاحب اور بھی تھے ۔ مولوی سید علی اصغر، کیننگ کالج لکھنؤ میں اورنٹیل ڈیپارٹمنٹ کے اُستاد ۔ یہ تھے تو عربی کے مُعلّم، لیکن درجہ میں تذکرے اکثر اُردو شعر و ادب کے چھیڑ جاتے ۔ اور یہ لکھنوی زبان کے خوب خوب نکتے، چٹکلے بیان کر جاتے ۔ لیکن غالب کا نام مولانا کے لئے ایک چڑھ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ شاگردوں کو یہ ٹٹکا اچھا ہاتھ آگیا تھا ۔ جب جس دن بھی سبق کا ناغہ کرنا منظور ہوا، نام غالب کا لے دیا ۔ اب مولوی صاحب ہیں کہ پڑھائی لکھائی چھوڑ، بس غالب کے پیچھے پڑ گئے ۔ بیچارے کی بات بات پر زبان پکڑنا شروع کر دی، اور پورے گھنٹہ اسی میں تمام ہو گیا ——— محسنوں کی فہرست لمبی ہوتی چلی جاتی ہے، اور سرِ فہرست کا نام لینے کی نوبت ہی نہیں آ رہی ہے ۔ یہ تھے مرزا محمد ہادی لکھنوی، جن کے تخلص مرزا سے لوگ کم، اور نثری لقب رسوا سے زیادہ واقف ہیں ۔ ’’امراؤ جان ادا‘‘ اور ’’ذات شریف‘‘ اور ’’اختری بیگم‘‘ والے ۔ ان کی زبان کی سلاست، نفاست، نزاکت کا نقش دل پر ایسا بیٹھا، اور بیٹھا کیا معنی، آج تک ایسا بیٹھا ہوا ہے، کہ اپنی اُردو دانی جب کبھی انگڑائیاں، جمائیاں لینے لگتی ہے، تو انھیں کی کتابوں کی ہوا اُسے تازہ دم کر دیتی ہے ۔

ادبی معرکوں کے قصّے کتابوں میں تو بہت پڑھے ۔ ناسخ و آتش کی لپٹ جھپٹ، انیس و دبیر کی چشمک، مصحفی و انشا کی ہاتھا پائی، وغیرہا ۔ لیکن بچپن میں دو معرکے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لئے ۔ ایک تو بہت بچپن میں، جب امیر و داغ کے شاگرد اور رشید اپنے اپنے اُستادوں کے ناموں کا رجز پڑھتے، لنگر لنگوٹ کس کر، اکھاڑے میں کود پڑے تھے ۔ اور دوسرا قصّہ بہت بعد کا ہے، غالباً سنہ [illegible] و سنہ [illegible] میں مثنوی گلزارِ نسیم پر لے دے شروع ہوئی تھی ۔ ایک فریق کے لیڈر جناب شرر اور پیام یار والے منشی نثار حسین تھے ۔ اور دوسری فوج کی کمان چکبست اور اودھ پنچ والے سجاد حسین کے ہاتھ میں تھی ۔ صاحب ایک طوفان تھا طوفان، لعن طعن کی وہ بھرمار، ایک دوسرے کی عزت و حرمت پر وہ یلغار، زبان و قلم پر وہ تو تکار، کہ اگر یہ کہنا خود بدتمیزی میں داخل نہ ہوتا تو ایک پورا طوفانِ بدتمیزی! پھر بھی ادبی پھول، بات بات پر جھڑتے رہے اور شعر و انشاء کی پھلجھڑیاں قدم قدم پر چھوٹتی رہیں

اپنی ادبی زندگی ہی کیا، جو اس کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات بیان میں لائیے اور اس ادل بدل آپ بیتی کے ٹکڑے اہلِ محفل کو سنا دیے ۔ محض تعمیلِ ارشاد میں سامعہ خراشی چند منٹ کیلئے کر دی گئی اور ہاں لیجئے جو بات بالکل شروع میں عرض کر دینے کی تھی وہ اب جا کر یاد پڑی ۔ خیر وقت میں ایک آدھ منٹ کی گنجائش باقی ہے ۔ اُردو کا اُنشا سیدھا ذوق یہ جو کچھ بھی نصیب میں آیا، اس میں بڑا دخل اس کو ہے کہ بچپن میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی اُردو ریڈریں پڑھنے کو مل گئی تھیں ۔ یہ ریڈریں دو چار سال نہیں کہنا چاہیئے کہ تین چار نسلوں کی مدت تک برابر لڑکوں کے کورس میں داخل رہیں ۔ ان کے ادبی شعور کو ذوقِ سلیم کے ڈھانچے میں ڈھالتی ہوئی سنوارتی ہوئی نکھارتی رہیں ۔

اُردو کا ایک ہند برطانوی شاعر اور اُس کا روزنامچہ

نثار احمد فاروقی

الگزنڈر ہیڈرلی آزاد (۱۸۲۹ء-۱۸۶۱ء)[1] زین العابدین خاں عارف (۱۸۱۷ء-۱۸۵۲ء)[2] کے شاگرد تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عارف کے انتقال کے بعد انھوں نے غالب سے بھی اصلاح لی تھی، چنانچہ اُن کے انتقال کے بعد جب اُن کا دیوان شائع ہوا تو اس میں انھیں اسداللہ خاں غالب کا شاگرد بھی ظاہر کیا گیا ہے:

"الگزنڈر ہیڈرلی ...... با محتشم الدولہ امیر الملک محمد اسداللہ خاں بہادر سہراب جنگ غالب متخلص و نواب زین العابدین خاں متخلص بہ عارف ...... بذریعۂ مراسلات و مکاتبات استمداد سخن داشتے"[3]

الگزنڈر ہیڈرلی کے باپ جیمس ہیڈرلی تقریباً ۴۰ برس تک کلکتہ، بریلی، مراد آباد، میرٹھ اور سہارن پور میں ملازمت کرتے رہے[4] اور ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے ۱۸۳۳ء میں نواب فیض محمد خاں آف جھجر کے دربار سے توسّل پیدا کر لیا، یہاں سے انھیں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مل جاتے تھے۔ جیمس یونانی طب میں بھی درک رکھتے تھے[5] انھوں نے اپنے بیٹوں کو بھی اس کی تعلیم دلائی تھی چنانچہ الگزنڈر ہیڈرلی آزاد بھی اپنا مطب کرتے تھے اور بقول لالہ سری رام:

"فنِ طب میں بھی اچھی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ مریضوں کا صرف علاج ہی نہیں کرتے تھے بلکہ دوا بھی اپنے پاس سے مفت دیتے تھے۔ اس طریقِ عمل سے شہرت بڑھتی اور دولت گھٹتی گئی، مجبوراً ملازمت اختیار کی جو اُن کی شان کے لائق ریاست الور میں مل گئی"[6]

۱؎ SAKSENA : European and Indo-Europeon peots of Urdu and Persian, p. 70.

۲؎ مالک رام: تلامذۂ غالب/ ۲۲۰ - ۳؎ دیوان آزاد مطبوعہ مطبع احمدی آگرہ (۱۸۶۳ء) تقریظ منشی شوکت علی فتح پوری۔ نیز نقوش (خاص نمبر ۷۷، ۷۸ دسمبر ۱۹۵۹ء)/ ۲۵۴، غالب کے یہ خطابات منشی شوکت علی کے دیئے ہوئے ہیں ورنہ دربارِ مغلیہ سے انھیں ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" کا خطاب ملا تھا (ذکر غالب/ ۹۰) ۴؎ ان کا نام تذکروں میں مختلف ملتا ہے رام بابو سکسینہ کی تحقیق ہے کہ صحیح املا جو پرانی خاندانی دستاویزوں میں بھی ملتا ہے HEATHERLY ہے۔ (رک: انڈو یورپین شعرا/ ۷۱) ۵؎ سکسینہ/ ۷۳ (بحوالہ منشی غلام نبی: تاریخ جھجر

۶؎ خمخانۂ جاوید جلد اول/ ۲۸

آزاد کا انتقال صرف ۳۲ سال کی عمر میں ہوا۔ لیکن انھوں نے جو مختصر سا دیوان چھوڑا ہے اس میں غزلیں، قصائد، قطعات اور مثنوی سب کچھ موجود ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان کی عمر وفا کرتی اور انھیں غور و فکر کے ساتھ شعر کہنے کا موقع ملتا تو وہ اُردو کے قابلِ قدر شاعروں میں ہوتے اب بھی ان کا مرتبہ اُردو کے یورپین اور اینگلو یورپین شعرا میں نہایت ممتاز ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ قادر الکلام شاعر تھے۔ لالہ سری رام نے ان کے حالات میں لکھا ہے:

"کپتان الگزنڈر ہیدرلی مسٹر جیمس ہیدرلی فرانسیسی[1] کے چھوٹے بیٹے، ایک مسلمان شریف زادی کے بطن سے تھے۔ ان کے والد اُن چند یورپین سے تھے جنھیں ہندستان جنت نشاں کی آب و ہوا خصوصاً دارالسلطنت شاہ جہاں آباد کی دلچسپیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ ہندستانی عورتوں سے شادی کر لینے کے باعث انھیں کی طرزِ معاشرت بھی اختیار کر لی تھی۔ الگزنڈر ہیدرلی کی تربیت و پرورش دہلی کے شرفائے اہلِ اسلام کی مانند ہوئی اور یہیں کی صحبتوں نے ان میں شعر و سخن کا مذاق پیدا کر دیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے ...... ۷ جولائی ۱۸۶۱ء میں ۳۲ برس کی عمر پا کر ملکِ جاوداں کو سدھارے اُن کے بڑے بھائی طامس ہیدرلی نے، جو ریاست بھرت پور میں ڈپٹی تھے، اپنے بھائی کے دوست میر شوکت علی فتح پوری کی مدد سے ان کا متفرق کلام جا بجا سے جمع کر کے ترتیب دیا اور ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی آگرہ سے شائع کرایا......"[2]

ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد سردار علی نے لکھا ہے:

"چونکہ آزاد فطرتاً ذوقِ شاعری اور ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے اس لئے انھوں نے ہر صنفِ کلام پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے کلام میں مضامین کی لطافت، الفاظ کی بندش، محاورات کی ترکیب (کذا) قابلِ داد ہے۔ آپ تشبیہیں اور استعارے بالکل نئے طریق پر استعمال کرتے ہیں۔ زبان بالکل صاف، روانیٔ بیان پختہ کار شاعر ہونے کی دلیل ہے"[3]

---

[1] رام بابو سکسینہ نے ہیدرلی خاندان کے بعض افراد سے ملاقات کی تھی اور ان کی خاندانی دستاویزوں سے فائدہ اٹھایا ہے ان کا بیان ہے کہ خمخانۂ جاوید کی یہ شہادت کمزور ہے کہ جیمس ہیدرلی فرانسیسی اصل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان بلاشبہ برطانوی نسل سے تھا۔ (رک: سکسینہ صفحہ ۱۷)

[2] - خمخانۂ جاوید جلد اوّل / ۲۷-۲۸ -

[3] محمد سردار علی: یورپین شعرائے اُردو (حیدر آباد دکن ۱۳۴۴ھ) / ۱۴

رام بابو سکسینہ نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

He is certainly in the first ranks of Anglo-Indian poets and can legitimately claim to be a very good second class poet in the range of writers of Urdu verje (3)

اور خمخانۂ جاوید کے مؤلف نے آزاد کی شاعری پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے ۔

"دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں رنگینی اور مضمون آفرینی کا خاصا مادہ تھا۔ زبان بھی سلیس پائی تھی۔ سنگلاخ زمینوں میں صفائی بیان ، رسائی خیال کا لطف دکھایا ہے قطعات میں بھی کہیں کہیں اچھوتے خیال ، پاکیزہ بول چال کا پتہ لگتا ہے" [۲]

الگزنڈر ہیدرلی کے غالب سے بھی تعلقات تھے ، اس پر پہلی شہادت خود مرزا غالب کے بعض خطوط میں ملتی ہے ۔

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

"الگزنڈر ہیڈرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا ،" [۳]

اسی مکتوب الیہ کو دوسرے خط میں لکھا ہے :

"... میں اس خیال میں تھا کہ اور کا کچھ حال معلوم کروں اور کپتان الگزنڈر کا خط آئے اور میں اس کو میر سرفراز حسین کے مقدمے میں لکھوں ، تو اس وقت تمہارے خط کا جواب لکھوں ، چونکہ آج تک ان کا خط نہ آیا میں نے سوچا کہ اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا میر مہدی خفا ہوگا۔" [۴]

آزاد کا انتقال کسی وبائی بیماری (غالباً ہیضے) میں ہوا تھا ، چونکہ وہ ریاست الور میں ملازم تھے اور وہاں سے غالب کو فتوح کی امید رہتی تھی اس لئے آزاد ان کی کار برآری میں معاون ثابت ہوتے تھے ۔ اُن کے اچانک انتقال کو بھی غالب نے اپنے طالع کی شومی سمجھا ۔ میر مہدی کو لکھا کہ

"الور میں بھی وبا ہے ۔ الگزنڈر ہیڈرلی مشتہر بہ آزاد صاحب مر گیا ۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا ۔ اس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا ۔ خیر یہ عالم اسباب ہے اس کے حالات سے ہم کو کیا ،" [۵]

---

۱ SAKSENA: PAGE 71

۲ خمخانہ جاوید ج ۱/ ۲۸

۳ اردوئے معلیٰ (لاہور ۱۹۳۰ء) / ۱۳۶

۴ اردوئے معلیٰ / ۱۲۳

۵ ماسبق / ۱۳۹

ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب سے آزاد کی خط و کتابت رہتی تھی اور قرینہ ہے کہ عارف کی وفات (۱۸۵۲ء) کے بعد وہ غالب ہی سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کی تصدیق میر شوکت علی فتح پوری کی اس تقریظ سے بھی ہوتی ہے جو آزاد کے دیوان (مطبوعہ ۱۸۶۳ء) میں شامل ہے۔ یہ دیوان آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیڈرلی کی نگرانی میں شائع ہوا تھا غالب سے اُن کا تلمذ اگر بے اصل بات ہوتی تو کبھی اس میں نہ لکھی جاتی۔[1]

مناسب ہوگا کہ ہم یہاں آزاد کے چند اشعار بھی درج کر دیں جس سے اُن کی شاعرانہ خوبیوں کا اندازہ ہو سکے:

ہم نے دکھا دکھا تری تصویر جا بجا ــــ ہر اک کو اپنی جان کا دشمن بنا لیا
سن چکے حال بس ترا آزاد ــــ ہم سے آگے سنا نہیں جاتا
ہیں شمع صفت انجمن دہر میں آزاد ــــ سرگرم رہ وادیٔ اقلیم فنا ہم
جان تم اپنی بچاؤ گے کہاں تک آزاد ــــ یا مرو عشق میں یا عشق کا دعویٰ چھوڑو
سوزشِ دل نے الٰہی کون سی کی تھی کمی ــــ جو جلانے کو مرے داغ جگر پیدا ہوا
کیا لطف ہے بے لطف ہو گر عیش تمھارا ــــ محفل میں اگر مجھ سے نہ شرماؤ تو آؤں
کیا گھر میں تمھارے در و دیوار کو دیکھوں ــــ تم اپنی جو صورت مجھے دکھلاؤ تو آؤں
یہ بزم، بزمِ مغاں ہے ادب سے بیٹھ اے شیخ ــــ جو ناچنا ہے تو جا کر کسی مزار پہ ناچ
پابند غم بتاں ہیں آزاد ــــ کیا قید سے جی چھڑائیں گے ہم

جیمس ہیڈرلی نے ایک شادی مسٹر وولینڈ کی لڑکی سے کی تھی، اور معلوم ہوتا ہے کہ دوسری شادی دہلی کے کسی مسلم گھرانے میں ہوئی۔ الگزنڈر ہیڈرلی آزاد کے دیوان میں دو قصائد اس عنوان سے بھی ملتے ہیں:

"در مدح خاں صاحب محمد حیات خاں ماموں صاحب خود" اور "در مدح نظام الدین خاں برادرِ خود"۔[2]

چنانچہ اب اس خاندان نے ہندستانی معاشرت اختیار کر لی تھی اور بقول لالہ سری رام دہلی کے مسلمان شرفا کی سی زندگی بسر کرتے تھے، اردو میں شعر کہنا، یونانی طب میں دستگاہ رکھنا، ہندستانی رسوم و رواج اور ذہن و مزاج سے باخبر ہونا ہی اس پر شاہد ہے۔ انھیں آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیڈرلی تھے جن کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کریں گے، لیکن اس سے پہلے اُن کے خاندان کا بھی تھوڑا سا حال جاننا ضروری ہے۔

---

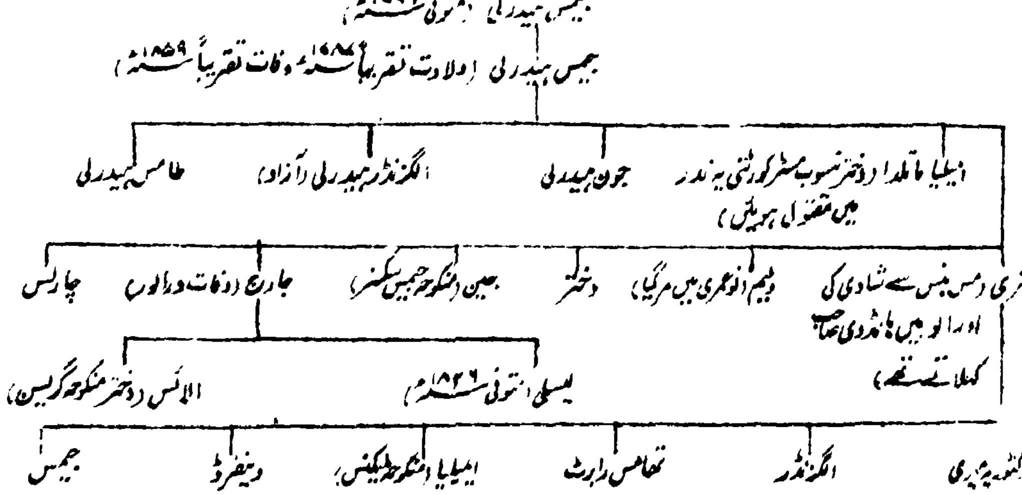
[1] محمد سردار علی نے بھی لکھا ہے کہ "کبھی کبھی مرزا غالب سے بذریعۂ خط و کتابت اصلاح لیا کرتے تھے"۔ (یورپین شعرائے اردو/۱۳) رام بابو سکسینہ، لالہ سری رام نے تلمذِ غالب کا تذکرہ نہیں کیا اور غالباً اسی لئے جناب مالک رام نے "تلامذۂ غالب" میں ان کا ترجمہ شامل نہیں کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اپنے مضمون "غالب کا ایک فرنگی شاگرد" (معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۳ء) میں تلمذ غالب کو بروایت میر شوکت علی فتح پوری قبول کیا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو مقالاتِ ماجد/۹)

[2] دیوان آزاد (بحوالہ سکسینہ/۴۷)

۲

۱۸۳۳ء میں جھجھر کے نواب فیض محمد خاں کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ نواب فیض علی خاں گدی نشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں جیمس ہیڈلی کے بڑے لڑکے (آزاد کے بڑے بھائی) طامس ہیڈلی سو روپیہ ماہوار تنخواہ پہ "ٹریژری افیسر" ہو گئے تھے۔[1] ۱۸۴۵ء میں نواب فیض علی خاں کا بھی انتقال ہو گیا اور نواب عبدالرحمٰن خاں مسند نشین ہوئے۔ یہ وہی ہیں جو ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد بغاوت کے الزام میں پھانسی پا گئے تھے۔ اصل میں ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے تھامس مٹکاف اور اس کے چند ساتھیوں کو پناہ نہیں دی تھی جب ۱۸۵۷ء کا فساد ہوا تو انگریزوں نے جیمس ہیڈلی کو بھی حراست میں لے لیا بعد میں جب انھوں نے یقین دلایا کہ اس زمانے میں خود نے نواب سے کوئی تعلق نہیں رکھا تو کپتان لارنس کی سفارش پر رہا ہوئے تھے۔ انگریزوں نے جھجھر کی ریاست ضبط کر لی اور جیمس ہیڈلی کو میرٹھ بھیج دیا اب یہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی یہیں ۱۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔[2]

جیمس ہیڈلی کے خاندان کا شجرہ رام بابو سکسینہ نے اس طرح درج کیا ہے۔



الگزنڈر آزاد کا ایک فرزند جون ۱۸۵۸ء میں مرا اور جھجھر میں مدفون ہوا۔ طامس ہیڈلی کا ایک لڑکا چارلس ۱۸۴۲ء میں مرا اور لڑکی تھامس گریسن سے بیاہی تھی اُس کے لڑکے (طامس کے نواسے) کی ولادت پر جارج پیش شور نے قطعہ بھی کہا تھا، جو اس کے دیوان میں شامل ہے۔

طامس کے بارے میں رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ اپنے والد کی حیات ہی میں انھوں نے نواب جھجھر کی ملازمت حاصل کر لی تھی وہ نواب فیض علی خاں کے لڑکے یعقوب علی خاں کے "تحویل دار خزانہ" تھے اور سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں انھوں نے جھجھر کی

---

[1] سکسینہ / ۳ء [2] ماسبق / ۳ء

ملازمت اور جے پور کے قریب کھیتری میں "مختار" ہو گئے۔ ۱۸۵۵ء میں لارڈ ڈلہوزی نے ڈھائی سو روپیہ ماہوار پر انہیں گوپال گڑھ (بھرت پور اسٹیٹ) کا تحصیلدار مقرر کر دیا۔ ۱۸۶۲ء میں وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور ان کا تبادلہ الور کو ہو گیا۔ پھر اسی عہدے پر وہ بھرت پور پہنچے اور یہاں "صدر محکمۂ مالگزاری" مقرر ہوئے، چار سو روپیہ تنخواہ ملنے لگی۔ وہ کھیتری اور کورٹ پٹی کے منصرم بھی تھے۔ ۱۸۸۴ء میں ریٹائر ہوئے اور سردھنہ میں مقیم ہو گئے ۱۸۹۱ء میں طامس کا انتقال ہوا اس کا علم جارج پیش شور[1] کے لکھے ہوئے اس قطعۂ تاریخ وفات سے ہوتا ہے جو شور کے دیوان ششم میں شامل ہے۔ شور نے اپنی منظوم سوانح عمری میں بھی طامس کے زمانۂ قیام الور کا تذکرہ کیا ہے۔

رام بابو سکسینہ نے ہیڈرلی خاندان کے پاس قلمی بیاض دیکھی تھی جس میں طامس ہیڈرلی نے مختلف امراض کے یونانی اور ویدک مجرب نسخے لکھے تھے سکسینہ کا بیان ہے طامس اپنی ڈائری بھی لکھتے تھے مگر وہ ضائع ہو گئی۔

He also maintained a diary which is now lost (2)

لیکن اس بات کا علم رام بابو سکسینہ کو بھی نہیں ہو سکا کہ طامس شاعر تھے یا نہیں۔ حضرت سردار علی نے اتنا لکھا ہے:

"آزاد کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی طامس ہیڈرلی نے ..... دیوان ترتیب دیا....
مختصر دیباچہ آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیڈرلی نے لکھا ہے دیباچے کی زبان بہت صاف
ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیڈرلی بھی اردو کے اچھے انشا پرداز
تھے"[3]

رام بابو سکسینہ نے تھامس کے بارے میں لکھا ہے:

Thomas Healtherly was a good scholar of Urdu and Persian and the preface to the "Dewan of Azad" is in the best style and impeccable Urdu (4)

---

[1] جارج پیش شور آ، وہ فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی میں بھی مہارت رکھتے تھے اردو میں ان کے چھ دیوان ہیں اور فارسی دیوان "گلشنِ فرنگ" کے نام سے مطبع شگوفۂ فیض میرٹھ سے ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکا ہے۔ اپنی سوانح عمری بھی منظوم لکھی تھی۔ یہ پہلے رحیم الدین حیا میرٹھی کے شاگرد تھے۔ پھر قطب الدین مشیر دہلوی اور ان کے صاحبزادے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لی۔ کریم الدین نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۴ء) میں میرے مکان پر مشاعرے ہوتے تھے تو شور اپنی غزلیں بھیجا کرتے تھے۔ محمد سردار علی نے اپنی کتاب "یورپین شعرائے اردو" (ص ۱۹) میں ان کا نام غلطی سے جارج برنس لکھا ہے۔ صحیح نام جارج پیش (GEORGE PUECH) ہے انھوں نے (۷۰) برس کی عمر پا کر ۲۳ فروری ۱۸۹۴ء کو انتقال کیا۔ ملاحظہ ہوں۔ (۱) رام بابو سکسینہ: یورپین اینڈ انڈو یورپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین/ ۲۲۸ و بعد (۲) محمد سردار علی: یورپین شعرائے اردو/ ۱۹ (۳) سری رام: خمخانۂ جاوید جلد ۵/ ۴۷-۳۷ (۴) رسالہ زمانہ کانپور اکتوبر ۱۹۴۳ء مضمون نواب صدر یار جنگ (۵) رسالہ ادبی دنیا لاہور اکتوبر ۱۹۳۷ء مضمون پیارے لال شاکر میرٹھی (۶) مالک رام: تلامذۂ غالب/ ۱۲۴ (حاشیہ)

[2] SAKSENA/P.76

[3] محمد سردار علی: یورپین شعرائے اردو/ ۱۴

[4] SAKSENA/P.76

لیکن ہماری خوش بختی سے طامس بیدرلی کی اس ڈائری کے کچھ اوراق دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ رہ گئے ہیں جس کی سکینہ نے نشاندہی کی تھی - مزید خوشی کا مقام یہ ہے کہ طامس کے دیوان کا بھی ایک مختصر انتخاب موجود ہے جو کسی یورپین نے بہت ہی شکستہ اردو میں ۱۸۹۱ء میں اپنے قلم سے نقل کیا ہے ۔ یہ دونوں نوادر ہم یہاں پیش کر رہے ہیں -

۳

طامس کے کلام میں کوئی خاص خوبی نہیں اس کی اہمیت یہی ہے کہ یہ ایک اینگلو انڈین شاعر کا کلام ہے اور اس کی دریافت سے اردو کے ان شاعروں کی فہرست میں اضافہ ہو جاتا ہے جو غیر ملکی ضرور تھے مگر انھوں نے ہندوستان میں رہ کر ایسی محنت اور محبت سے اردو زبان کی تحصیل کی تھی کہ اس میں بے تکلف شعر کہہ سکتے تھے ۔ دوسری بات یہ قابلِ غور ہے کہ طامس نے اپنے کلام میں ہندوستانی رسوم و روایات یہاں کی معاشرت اور طرزِ فکر کا عکس پیش کیا ہے ۔ اس کے شعروں میں "پردہ نشین" کا ذکر بھی خاص لطف رکھتا ہے ۔ اسی طرح بعض اشعار میں مستی، پان وغیرہ کا ذکر آیا ہے ۔ طامس بھی اپنے بھائی آزاد کی طرح نواب زین العابدین خاں عارف کے شاگرد تھے اور جب کبھی دہلی جانا ہوتا تھا ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اس کا ثبوت ایک جگہ ان کے روزنامچے میں بھی ملے گا ۔ ان کا پورا دیوان اب محفوظ نہیں صرف چند صفحوں کی ایک بیاض رڈی سائز پر معمولی کاغذ اور رجناتی خط میں لکھی ہوئی دہلی یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں پائی جاتی ہے اس کے بھی دو ورق آدھے ہی رہ گئے ہیں جن میں بعد کو پیوند لگایا گیا ہے ۔ نظر بظاہر یہ دیوان طامس کا انتخاب ہے ۔ ہم اسی انتخاب سے ایک انتخاب یہاں پیش کرتے ہیں -

• انتخاب کلام طامس بیدرلی طامس

(نقاب) ہے طرفہ شعلہ رو کے اودی نقاب منہ پر ۔۔۔ جس وجہ مہر کے ہو یا ردسحاب منہ پر
کہنے لگے بُرا تم، پھر بے حجاب منہ پر ۔۔۔ اچھا ہو، اب جو دیویں ہم بھی جواب منہ پر
مت جا طپش میں پیارے، نازک بدن ہے تیرا ۔۔۔ ڈھلتا ہے دن ٹھہر جا، ہے آفتاب منہ پر
دانتوں پہ تیرے اختر قربان لاکھ دل سے ۔۔۔ صدقے ہزار جاں سے ہے ماہتاب منہ پر
دیکھے سے گل بدن کے غش آگیا ہے مجھ کو ۔۔۔ بازو نہ میرا باندھو، چھڑکو گلاب منہ پر
بدنام و خوار و رسوا جو کچھ کیا سو تم نے ۔۔۔ کہتا ہوں حضرتِ دل، عالی جناب منہ پر
(رعایت لفظی) کیا کیا نشے میں اُس نے سیدھی سنائیاں ہیں ۔۔۔ اُلٹا جو پیتے پیتے جام شراب منہ پر
طامس جواب دوں گا کس منہ سے ڈر یہی ہے ۔۔۔ آوے جو بات واں کچھ روزِ حساب منہ پر

○

میرے پہلو سے جو اُٹھ کر وہ دل آرام گیا ۔۔۔ صبر و ہوش و خرد و طاقت و آرام گیا
بے قراری یہی گر ہے تو گئے ہم تجھ سے ۔۔۔ ہائے اک روز تو ہم سے دل ناکام گیا

طرفہ دکھلائی یہ پستی و بلندی اس نے
ہم گھر اس کے گئے، وہ اُٹھ کے لبِ بام گیا

آج تو عطرِ بیا جگی ہوئی آتی ہے صبا
سیرِ گلشن میں مگر ہے وہ گل اندام گیا

(لطف زبان) ٹوکتا ہے تو مجھے کس لئے ہر بار رقیب
اس کے کوچے میں گیا میں، تجھے کیا کام گیا ۱

نہیں بچنے کا رخ و زلف کا تیری بیمار
دم کا مہمان ہے یہ صبح گیا شام گیا

جب کہا میں نے کہ ہم کو نہ کیا یاد کبھی
بولے کس روز بلانے کا ہے پیغام گیا

باغ ہستی میں یہ مخلوق ثمر ہیں طاؤس
پختہ و تر کوئی پژمردہ کوئی خام گیا

○

کیا ارادہ ہوا اُلفت کا پھر اس یار سے آج
پھر ہوئے داغ مرے دل کے نمودار سے آج

چل بیاباں کو، نکل شہر سے، کیوں بیٹھا ہے
یہ صدا آتی ہے زنجیر کی جھنکار سے آج

(رعایت لفظی) اُڑ گئی نیند کہ اک پل نہیں لگتی ہے پلک
جا لڑی آنکھ یہ کس طالعِ بیدار سے آج

کل جو تھی نغمہ سرا بر سرِ ہر گل بلبل
کیا قفس میں ہے پڑی دور وہ گلزار سے آج

دیکھ کر سرو، جو وہ سروِ رواں یاد آیا
رہ گیا لگ کے میں بس باغ کی دیوار سے آج

کل کے وعدے پہ نہ آیا تو دم آیا لب پر
کہیو اے نامہ بر اس شوخ ستم گار سے آج

کس کو ہے کل کی خبر، دم کا بھروسا کیا ہے
اپنے، ملتا ہے تو مل، طالبِ دیدار سے آج

عاشقانہ کوئی پُر درد سی پڑھ اور غزل
غم غلط ہوتا ہے طاؤس ترے اشعار سے آج

○

تیری گالی کا میں اے یار بُرا کیا مانوں
تجھ میں عادت ہے یہ، ہر بار بُرا کیا مانوں

تلخ کہنے کو سمجھتا ہے تری میٹھی بات
لوں مٹھائی یہ مزیدار بُرا کیا مانوں

اور جی چاہے تو دو چار سُنا لے پیارے
تیری اُلفت سے ہوں لاچار بُرا کیا مانوں

کیا کروں میں تری ابرو کی کجی کا شکوہ
مجھ سے کھینچے جو وہ تلوار بُرا کیا مانوں

اے ستمگار تری زلفِ سیہ دامِ بلا
ابھی کرے جو گرفتار بُرا کیا مانوں

دل کو توڑا مرے، گھر تھا یہ ترا، خوب کیا
اپنے گھر کا ہے تو مختار، بُرا کیا مانوں

طلبِ بوسہ پہ طاؤس نہ سنوں کیوں دشنام
ہوا آپ ہی میں گنہ گار بُرا کیا مانوں

○

کہا جو میں نے نہ مل غیر سے کہا تو کون ہے
ہم اپنے دل کے ہیں مختار بھلا تو کون ہے

نہ پھیر تو مانگ کے کوستے ہیں آدھی رات کر کے دل
زبانِ شانہ سے آتی ہے یہ صدا تو کون ہے

ہمارے چاکِ گریباں سے ہے تجھے کیا کام
یہ حُسن و عشق کا جھگڑا ہے ناصحا تو کون ہے

(دل بہے) دکھائی بل بے نزی، کی جو میں نے کچھ تعریف — کہا کہ خیر بھلا ہوں میں یا نہ، تو کون ہے

○

(ہندستانی معاشرت) مرغ دل پھنسنے کو کیا کم ہے یہ دام کاکل — اور کا جل سے تو رخسار پہ دانا نہ بنا
عاشقی کا مری کس شہر میں شہرہ نہ ہوا — کون سی جا مری الفت کا فسانہ نہ بنا

○

بن گیا غیر کا وہ یار ہمارا نہ بنا — بن سکے جو کام کہ بگڑا وہ دوبارہ نہ بنا
کہتے ہیں دیکھ کے مژگاں ترے آہن گر چلبن — ہم سے ایسا کبھی خنجر ہی دو دھارا نہ بنا
نہ بنا کام دل اس شوخ سے تم کو کیا کام — یار واس میں بھی کسی کا ہے اجارا، نہ بنا
نت رہا شعلہ رخوں کا، دل مضطر مائل — حیف صد حیف کہ اکسیر یہ پارا نہ بنا

○

کچھ زبانی بھی نہ قاصد مُنہ سے بولا رہ گیا — ہائے اس نوخط نے میرے خط کو کھولا رہ گیا
(ابتذال) یہ تری اُٹھتی جوانی اور یہ اُبھری چھاتیاں — سولھواں سن، اب بھی تو اے شوخ بھولا رہ گیا
یہ تمنا تھی کہ پہنچیں اُڑ کے کوئے یار میں — باد کا جھونکا ہمیں دے کے جھکولا رہ گیا
آتشِ الفت سے سارا خانۂ تن جل گیا — ہائے دل پہلو میں میرے اک پھپھولا رہ گیا
تیغ قاتل سے گلے ملنے نہ پائے ولئے ہم — مجھ پہ اس نے دیر تک خنجر کو تولا رہ گیا
(ہندستانی شگون) یاد کس کو آ گئے تھے آج دور افتادہ ہم — ہچکیاں، بس کا تصور ایک دو لا رہ گیا
(ڈولا) اب ہوا مجھ کو یقیں طاؔمس کہ اپنے دن پھرے — صبح وہ خورشید رو منگوا کے ڈولا رہ گیا

○

(پان کا لاکھا) لالہ چمن میں کشتہ ہے تیرے دہان کا — لاکھا جما ہے کیا ہی غضب رنگ پان کا
بوسہ لیا جو مصحف رُخ کا تو کیا ہوا — ہاں چومنا ثواب ہے پیارے قرآن[1] کا
(ہندستانی کہاوت) آباد کر یہ خانۂ دل آ کے اے پری — رہنا بُرا ہے سنتے ہیں خالی مکان کا
شیریں لبوں کا ذکر ہے آٹھوں پہر مجھے — چُھٹتا نہیں پڑا جسے چسکا زبان کا
(ہندستانی زیور) چکرہی ہیں جیسے مہ و خورشید دیکھ کر — ہوں گے بڑے ستم جو یہ بالا ہے کان کا
(ہندستانی لباس) اوڑھا ہے "چاند تارے" کا اودا دوپٹہ آج — پیارے زمیں ہو کیوں نہ جواب آسمان کا
طاؔمس امرا جو تیر سا بھاگے ہے مجھ سے دل — کیا جانے ہے نشانہ کس ابرو کمان کا

---

[1] قرآن بروزن "پران" اردو کے قدیم شعرا نے بھی استعمال کیا ہے۔ معہذا قدیم فارسی شعرا کے یہاں بھی آیا ہے۔ طاؔمس اس کے استعمال پر ماخوذ نہ کیے جائیں۔

○

کب سلجھتے ہیں یہ سلجھانے سے تقدیر کے پیچ ہیں گلوگیر مرے اپنی ہی تقدیر (کذا) کے پیچ
سبزۂ حسن پہ لہراتے ہیں کافر کیا کیا کم نہیں کالے سے اس زلفِ گرہ گیر کے پیچ
(تلمیح) بات شیریں کی تو افسوس نہ سمجھا فرہاد تھا جو کچھ تجھ سے منگانے میں جوئے شیر کے پیچ
(ہندوستانی تلمیح) تو ہی اپنے دلِ صد چاک کو سلجھا رانجھا نہ کھلے شانے سے سب موئے سرِ ہیر کے پیچ
کیا ہی لسّانی سے باتوں میں وہ الجھاتا ہے اللہ اللہ رے کافر تری تقریر کے پیچ

○

اشک ڈھل جائیں نہ کیوں دیدۂ تر میں آکر نظری ہو گئے ہم اس کی نظر میں آکر
فکر تھا یار کی تعریف سراپا لکھوں دل گیا ہاتھ سے مضمونِ کمر میں آکر
سیم و زر بھی جو خدا دے تو برنگِ نرگس بے خود انسان نہ ہو نشۂ زر میں آکر
اے غمِ یار یہ گھر ہیں ترے مختار رہے تو خانہ دل میں رہے خواہ جگر میں آکر
(معاشرت) میں نے بے تاب ہو اس پردہ نشیں سے یہ کہا (ق) وہ بھی دن ہو کہ تو بیٹھے مرے بر میں آکر
بولی پھر شام کو آنا تو بزیرِ لبِ بام جھانک لیں گے تجھے ہم دور سے در میں آکر
پر خبردار خدا کے لئے او خانہ خراب مجھے بدنام نہ کرنا مرے گھر میں آکر
طبع زاد[1] اب غزل اس بحر میں لکھو عاصی رہیے خاموش نہ اربابِ ہنر میں آکر

○

سہ غزلہ

نہیں برسات کا برسوں میں ہے اس گھر توڑا بارشِ چشم نے مژگاں کا پل اکثر توڑا
ہم تو ہیں عاشقِ مفلس، نہ ملو سیم برو یاں کہاں اشرفیوں کا ہے میسر توڑا
(اصطلاحاتِ موسیقی) آکے مطرب بچے نے باغ میں محظوظ کیا گت کا جنگلے کے مجھے کیا ہی سنا کر توڑا
سخت جانی سے ہوں نادم کہ تڑپ کر دمِ ذبح آہ کیسا مرے قاتل کا ہے خنجر توڑا

○

دل مرا سنگِ ستم سے جو ستمگر توڑا کیا کیا تو نے عجب لعل یہ خوشتر توڑا
اب نکل جاؤں میں زندانِ فلک سے کیوں کر کہ یہ جاتا ہی نہیں گنبدِ بے در توڑا
میں نے کیوں دل کو لگایا بتِ سنگیں دل سے حیف کیا مفت یہ پتھر سے جواہر توڑا

---

[1] یہ غزل کیا ترجمہ تھی؟ پھر طبع زاد کہنے کا کیا محل ہے!

○

کل مجھے شوخ نے تنکا جو دکھا کر توڑا — ہائے پیمانِ محبت سے بنے خنجر توڑا
طالب اک جام کا تھا میکدۂ گلشن میں — کاسۂ سنبل و گل کا صبا مار کے ٹھوکر توڑا
کیا بھلا زور بھرا ہے تری رگ رگ میں جنوں — آج فصّاد کا نشتر پہ سے نشتر توڑا
مر گئے ہم ہیں یہ کس پردہ نشیں کے غم میں — دلِ مضطر نے جو تربت کا مجمّر توڑا (پردہ نشیں)
لکھ تو طامس غزل اک اور الگ ٹوٹوں کی — ہاں جو ہیں چاہیئے اب کہہ سخن ور توڑا

○

جنگ ہے مجھ کو گریبان کے ہر تار سے آج — دامن الجھے ہے مرا دشت میں ہر خار سے آج
انکھڑیاں سرخ ہیں و چیں بہ جبیں ہے وہ شوخ — برہمی کے نظر آتے ہیں کچھ آثار سے آج
جا بھڑا زلف سے دل، جلد خبر گیر مدد — اک مسلمان مقابل میں ہے کفار سے آج
مہ وہ شاید ہی ملے شیخ ملا ریش دراز — شگونِ بد مجھ کو ملا اختر دیدار سے آج (شگون)

○

ہمارے زخم درد دل کو وہ جلاد کیا جانے — میں جانوں یا مرا دل، وہ ستم ایجاد کیا جانے
اڑا دی خاک بھی میری صبا نے اس کے کوچے سے — کدھر کو لے گئی کر دی کہاں برباد کیا جانے
بنا پھرتے ہیں دیوانہ، کوئی کیسا ہی عاقل ہو — وہ کیا جادو بھرا ہے شہرِ حسن آباد کیا جانے
مثل مشہور ہے طامس کہ "جی خوش تو جہان خوش ہے" — خوشی گر سارا عالم ہو دلِ ناشاد کیا جانے (ہندستانی مثل)

○

ہم سے کرتا ہے وہ اس لئے دلبر پردہ — یعنی ہے خوب ملاقات جو ہو در پردہ (پردہ)
بیٹھوں اس پردہ نشیں پاس تو کہتی ہے ہوس — اک نظر دیکھ بھی لے اس کو اٹھا کر پردہ
پردۂ شرم سے باہر نہیں یوں آتے ہو — کھینچ لوں میں ابھی دالان کا اٹھ کر پردہ (دالان)
خوف رسوائی ہے ظاہر میں تمہیں اے طامس — گاہے گاہے کی ملاقات رکھو در پردہ

○

میں وہ مجنوں ہوں کہ چلتے ہوئے اے لیلیٰ وش — پاؤں پڑتے ہیں مرے خارِ بیاباں کتنے
پیچ میں آ گئے ہم کیا ترے اے زلفِ یار — ہوں گے آشفتہ ترے ہم سے پریشاں کتنے
بے وفاؤں سے بھی امیدِ وفاداری ہے — ہیں بھلے اے حضرتِ دل آپ بھی ناداں کتنے
ہو گیا آرزوئے وصل میں افسوس وصال — لے چلے ہم بھی غم و حسرت و ارماں کتنے (تجنیس زائد)
سنگِ رہ بالشِ سر، خاک درِ یار لباس — آپ کہتے ہیں مجھے بے سر و ساماں کتنے (کتنا)

چاہ کر تم کو یہ طاؤس نے تعجب پایا　　ہوئے عزت کے کئی، جان کے خواہاں کتنے

○

(سہ غزلہ) چین دل کو نہیں آتا کسی عنوان کہیں　　غم سے چھٹ جاؤں، نکل جائے اگر جان کہیں

عقل کہتی ہے میں حیران ہوں جاؤں تو کدھر　　عشق لینے نہیں دیتا مجھے اوسان کہیں

میں تو ہر کاٹ مروں پر یہ خیال آتا ہے　　لوگ تجھ پہ نہ کریں خون کا بہتان کہیں

(تلمیح) لوگ تعریف جو یوسف کی بہت کرتے ہیں　　حسن تیرا سا رکھے تھا مہ کنعان کہیں

○

اشک تھم تھم کے جو آنے لگے کچھ آنکھوں سے　　کوئی لخت جگر اٹکا نہ مژگان کہیں

صدمۂ عشق سے سب ہو گئے درہم برہم　　دل کہیں، ہوش کہیں، عقل کہیں، جان کہیں •

ہر طرف سے یہ صدا آتی ہے، لیلیٰ لیلیٰ　　ہے دلا مدفن مجنوں یہ بیابان کہیں

قتل اپنے سے مجھے ڈر نہیں پر خوف ہے یہ　　خوں سے بھر جائے نہ قاتل ترا دامان کہیں

○

نظر آتا ہی نہیں صبح کا ساماں کہیں　　انتہا بھی ہے تری کچھ شب ہجراں کہیں

(انتظاری) انتظاری میں نہ جیتا ہوں نہ مر سکتا ہوں　　تم یہاں آؤ تو مشکل ہو یہ آساں کہیں

تیرے سودائی کا محفل میں یہ عالم ہے کہ اب　　کان احباب کی باتوں پہ ہیں اور دھیان کہیں

دل تو دے بیٹھا ہوں اب جان فقط باقی ہے　　لیجئے اس کو بھی، رہ جائے نہ ارمان کہیں

محتسب توڑ گیا کل مئے گلگوں کا قدح　　خون پی جاؤں جو مل جائے وہ شیطان کہیں

چھوڑ کر یار کے کوچے کو پھروں صحرا میں　　کوئی مجنوں کی طرح میں بھی ہوں نادان کہیں

تاخت تاراج کیا تیغ نگہ نے دل کو　　کچھ ہمیشہ سے نہ تھا ملک یہ ویران کہیں

○

جن دنوں تجھ کو دلا، عشق کا آزار نہ تھا　　چین سے کٹتی تھی کچھ غم سے سروکار نہ تھا

میرے مرجانے کی جونہی خبر اُن کو پہنچی　　بیے لے دلئے کچھ ایسا تو وہ بیمار نہ تھا

نیم بسمل ہی مجھے چھوڑ کے تڑپانا تھا　　آپ کے ہاتھ میں کیا خنجر خوں خوار نہ تھا

○

جو توڑا دل ہمارا، دلستاں کے ہاتھ کیا آیا　　کیا بے چین، اس آرام جاں کے ہاتھ کیا آیا

مرے ہی عشق کا سنتا ہوں ہے ہر اک جگہ چرچا　　ہوا بدنام میں یارو، جہاں کے ہاتھ کیا آیا

ہوا وہ اور برہم روز کی فریاد و زاری سے　　ہمارے نالہ و شورِ فغاں سے ہاتھ کیا آیا

○

(بل بے)

بل بے ترا اوج ، سرد کی آہ — سورج میں اثر ہے سنگری کا

عاشق ہوں اک ایسے دلربا پہ — اُلفت جسے ، ڈھب نہ دلبری کا

بس طول کلام چڑھ سے طاقس — قائل ہوں کلام مختصری کا

○

دن کو بھی دہی ذکر، وہی شب کو تصور — اے دل تو عجب ذاکر و شاغل نظر آیا

○

دوغزلہ

مے پینے سے کچھ رنگ ترا اور بھی چمکا — خورشید سے جوں ، ماہ سوا اور بھی چمکا

(قشقہ) آئینے میں تو دیکھ ذرا چاند جبیں کا — قشقے سے ترا اے بُت ، بجلا اور بھی چمکا

(موباف) موباف زری کو ذرا چوٹی کے تو دیکھو — کیا رات اندھیری میں ، بلا اور بھی چمکا

تھی تو وہ نگہ تیز پہ سرمے نے کیا قہر — اب سان پہ تیغا جو لگا اور بھی چمکا

پیراہن گلگوں کا پڑا عکس جو کافر — وہ جسم ہے مانند طلا اور بھی چمکا

ہے وصل کی شب آتش حسرت سے مرے دل کی — تو ہو کے نہ پابندِ حیا اور بھی چمکا

○

محفل میں سخن اب تو مرا اور بھی چمکا — تحسین کا پایا جو صلا اور بھی چمکا

کیا مطلع انوار گلو ہے ترا پیارے — پھر ہوتے ہی وا بندِ قبا اور بھی چمکا

بھڑکا دیا کس نے کہ مجھے دیکھ کے وہ شوخ — تھا ایک تو پہلے ہی خفا اور بھی چمکا

○

وہ ہم پہ مہرباں نا مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا — اگر دشمن ہمارا اک جہاں ہوتا تو کیا ہوتا

○

دیکھ کر ہم کو ، نہیں خالی تبسم زیرِ لب — کچھ بُرا کہتے ہو ، آہستہ مگر تم زیرِ لب

شرم کب تک بس خدا کے واسطے توڑو حجاب — یہ بھی کوئی بات ہے صاحب تکلم زیرِ لب

○

دلِ آوارہ کہاں کا ہے نہ یاں کا ہے نہ واں کا ہے

خرابانی جہاں کا ہے نہ یاں کا ہے نہ واں کا ہے

ہندوستاں)

فقیری بھیس، طامس نام، عرب کا یا عجم کا ہے
مگر ہندوستاں کا ہے نہ یاں کا ہے نہ واں کا ہے

○

نظر آیا ہے ہم پر جب سے تو باغ خوبی
اپنی نظروں میں تو بے رنگ ہیں سارے گلشن

○

حرف سب میٹ دیئے مہر و وفا کے تم نے — کس سے سیکھے ہیں یہ انداز جفا کے تم نے
تم نہ آؤ گے تو کیا موت بھی آنے کی نہیں — راستے روک دیئے میری قضا کے تم نے

۴

رام بابو سکسینہ نے حیدری خاندان کے ایک فرد کے پاس ایک قلمی بیاض دیکھی تھی جو طامس حیدری نے اپنے قلم سے لکھی تھی اس میں مختلف امراض کے مجرب دیدک اور یونانی نسخے تھے۔ سکسینہ کا بیان ہے کہ طامس زیبی ڈائری بھی لکھتے تھے جو ضائع ہو گئی۔[1] اس کا ہم حوالہ پہلے دے چکے ہیں۔ طامس حیدری کی اس ڈائری سے کسی نے صرف ان اندراجات کا انتخاب کیا تھا جن کا تعلق طامس کے ذاتی اور خاندانی حالات سے تھا۔ اس لئے یہ انتخاب یورپین شعرائے اردو پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بہت اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس روزنامچے کی حیثیت کئی پہلوؤں سے اہم ہو جاتی ہے ایک تو یہ کہ اب تک اردو کے جتنے روزنامچے دریافت ہو کر طبع ہوئے ہیں ان میں مولوی مظہر علی سندیلوی کا روزنامچہ قدیم ترین سمجھا جاتا تھا جو فلسکیپ سائز کے تقریباً آٹھ ہزار صفحات کو محیط ہے اور ۲ جنوری ۱۸۶۷ء سے شروع ہو کر روزنامچہ نگار کی تاریخ وفات ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء تک پوری پابندی کے ساتھ لکھا گیا۔ ان کئی ہزار صفحوں کا خلاصہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے کیا اور انھیں مختلف عنوانوں کے تحت تقسیم کر کے اسے رسالہ اردو (سہ ماہی)[2] میں طبع کرایا تھا۔ بعد میں ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سے یہ تلخیص کتابی صورت میں شائع ہوئی ہے[3]۔ روزنامچے لکھنے کا رواج ہندستان میں بہت زمانے سے ہے لیکن یہ سب فارسی میں لکھے جاتے تھے چنانچہ قلعۂ معلیٰ کا روزنامچہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک لکھا گیا یہ بھی فارسی میں ہے[4]۔ کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ کتب خانہ ریاست رامپور میں محفوظ ہے اور وقائع عالم شاہی کے نام سے طبع ہو چکا ہے[5] یہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ خود میر تقی میر کی سوانح عمری

۱؎ سکسینہ ص ۷۶

۲؎ رسالہ اردو سہ ماہی جنوری ۱۹۳۹ء تا جنوری ۱۹۴۰ء

۳؎ نور الحسن ہاشمی (مرتب): ایک نادر روزنامچہ (لکھنؤ ۱۹۵۴ء)

۴؎ اس کی ایک جلد (قلمی) کتب خانہ نذیریہ دہلی میں محفوظ ہے اس میں ۱۸۴۷ء کے حالات ہیں۔

۵؎ مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی طبع ۱۹۴۹ء۔

"ذکرِ میر" جو ۱۸۱۳ء سے تقریباً ۱۸۲۰ء تک کے حالات و کوائف کو محیط ہے، میرے اندازے کے مطابق روزنامچے کے طور پر لکھی گئی تھی اور میر نے اسے بعد کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔[1] رامپور کے مولوی عبدالقادر خمکین کا قلمی روزنامچہ کتب خانہ حبیب گنج میں، اور اس کی ایک نقل رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے یہ بھی فارسی میں ہے۔ "غدر" ۱۸۵۷ء سے متعلق جو روزنامچے جیون لال، معین الدین یا عبداللطیف کے لکھے گئے وہ بھی فارسی میں قلم بند ہوئے۔ اس طرح گویا ۱۸۵۷ء تک ذاتی ڈائریاں بھی لوگ فارسی میں لکھنا پسند کرتے تھے اس لئے کہ یہ اہلِ علم کی زبان سمجھی جاتی تھی خود مولوی مظہر علی سندیلوی نے پہلے اپنا روزنامچہ فارسی میں لکھنا شروع کیا پھر ۱۸۵۷ء میں انھیں خیال آیا کہ اب فارسی کا رواج بالکل اٹھتا جا رہا ہے اور زبان اردو کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، تو انھوں نے بجائے فارسی کے اردو میں لکھنا شروع کیا۔

طامس بیدرلی کی ڈائری کا یہ مختصر سا انتخاب جو دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی کی ملکیت ہے غالباً اب تک دریافت ہونے والے اردو روزنامچوں میں قدیم ترین سمجھا جانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ یہ ۱۸۴۲ء کے اندراجات سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۵۳ء پر ختم ہوا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس قدیم ترین روزنامچے کا سہرا بھی ایک برطانوی نژاد اردو دوست کے سر پر بندھا ہے۔

اس روزنامچے سے اس دور کی سیاسی، تاریخی اور سماجی حالت کا کوئی واضح نقشہ تو مرتب نہیں ہو سکتا لیکن کچھ جھلکیاں ضرور ملتی ہیں خصوصاً اس عہد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے اندرونی جوڑ توڑ اور سیاسی ماحول کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ زیرِ نظر روزنامچہ کسی ہندوستانی کے قلم سے نہیں ایک برطانوی نژاد کا لکھا ہوا ہے اور ظاہر ہے پرائیویٹ ڈائری سے زیادہ کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتا، پھر بھی اس کا اردو زبان میں ہونا روزنامچہ نگار کی اردو زبان سے محبت پر گواہ ہے۔ اس نے عام فہم سادہ اور سہل زبان لکھی ہے جس میں کوئی ادبی چاشنی نہیں ہے لیکن اینچ پینچ کی عبارت بھی نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس انتخاب کے نقل کرنے والے نے بدخطی کے وہ وہ کمالات دکھائے ہیں کہ بعض الفاظ انتہائی کوشش کرنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتے مجبوراً ایسے الفاظ کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا ہے پھر بھی میں نے اکثر مقامات پر قیاسی تصحیح کی ہے۔ بعض سطریں آب زدہ اور حواشی ایسے دریدہ بھی ہیں کہ مطلق کچھ نہ پڑھے جا سکے۔ روزنامچے میں بہت سے مقامات پر حواشی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن یہ کام دیر طلب بھی تھا اور طوالت کا خوف بھی مانع رہا اس لئے قصداً حواشی نہیں لکھے گئے۔

اس کے املا کی چند خصوصیات یہ ہیں کہ ہائے مختفی اور ہائے ملفوظ کا فرق مطلقاً نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح قدیم طرزِ املا کے مطابق یائے معروف و مجہول میں بھی تمیز نہیں کی گئی ہے۔ مفرد الفاظ کو عام طور سے ملا کر لکھا گیا ہے نقطے لگانے میں حد درجہ کفایت شعاری سے کام لیا ہے اور با وجودیکہ پنسل سے سطریں کھینچ کر نقل کیا ہے پھر بھی کوئی سطر شاید ہی سیدھی لکھی ہو۔ اب اس تاریخی روزنامچے کا متن ملاحظہ فرمائیے:

ڈائری طامس بیدرلی

(ورق الف) . . . . طامس بیدرلی صاحب بتاریخ بست و ششم جولائی ۱۸۲۰ء کو پیدا ہوئے اور دہم ستمبر سنہ مذکور را دوست . .

---

[1] یہ پہلے ۱۹۲۸ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہوئی پھر اس کا اردو ترجمہ راقم الحروف نے ۱۹۵۷ء میں "میر کی آپ بیتی" کے نام سے مکتبہ برہان اردو بازار دہلی کی طرف سے شائع کرایا۔ اس کے قلمی نسخے پروفیسر محمد شفیع (لاہور)، پروفیسر مسعود حسن رضوی (لکھنؤ) رضا لائبریری (رامپور) اور جواہر میوزیم (اٹاوہ) میں پائے جاتے ہیں۔

ہنری فشر صاحب غسل تعمید پایا۔ خدائے تعالےٰ نے اولاد مفصلۂ ذیل عطا کری۔

ہدرلی - میری - آمی (کذا) - جوزف - چارلس - جین - ولیم - ہنری

..... اور اپنے چچازاد برادر جان ہدرلی کے ساتھ ..... (؟) میں باغیان کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ جوزف ہدرلی بعمر دو سال عارضۂ چیچک سے فوت ہوا اور جھجر میں مدفون ہوا۔

چارلس ہدرلی بعمر ۱۱ ماہ بعارضۂ چیچک فوت ہوا

ولیم ہدرلی بتاریخ ۱۲ ار نومبر ۱۸۵۹ء پیدا ہوئے

مسز ہدرلی بتاریخ ۱۸ ار اگست ۱۸۵۵ء پیدا ہوئے

اب حال مسٹر طامس ہدرلی صاحب، ان کے روزنامچوں کے خلاصے سے درج کیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۸۴۳ء

والد سے رنجش | یہ سال نہایت رنج و تردد میں گذرا۔ خواہ مخواہ کے مفسدے برپا ہوئے۔ حتیٰ کہ میرے سبب والد اور جناب ماموں صاحب کی ترک ملاقات ہوگئی آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ سبب پیدا کر دیا کہ بماہ ستمبر سنہ حال راجا مان سنگھ والی جودھپور کے انتقال کی خبر آئی اور راجا دھونکل سنگھ مقیم چارگڑھ نے ارادہ دعویٰ مسند نشینی کرنے کا کیا اور ہم کو نواب صاحب بہادر[1] سے مانگ کر ہمراہ لیا۔ چنانچہ بتاریخ پندرہ ستمبر کو والد سے رخصت ہوا۔ بمقام ریواڑی، راؤ تلارام اور راؤ نانھورام اور ابوالحسن خاں جاگیردار..... دو حکیم عین الدین اور طرہ باز خاں رشتہ دار رئیس دوجانہ، و دیگر شرفا سکنہ ..... (؟) و دوجانہ وغیرہ شریک راجا دھونکل سنگھ کے ہوئے۔ (یہاں تین سطریں کرم خوردہ و دریدہ ہیں اس لئے پڑھی نہیں جا سکتیں)۔

(ورق ب) نوازدہم ستمبر کو کوچ کر کے ..... کوٹ پتلی و شاہ پورہ و گوبند گڑھ و کرن شیر و ہدوانہ ..... ۳۰ ستمبر کو اجمیر داخل ہوئے۔ ہم سرائے میں فروکش ہوئے اور بیمار ہو گئے۔ چونکہ دھونکل سنگھ کو جواب صاف مل گیا، ہم بتاریخ ہفتم ماہ اکتوبر اجمیر سے روانہ ہو کر، بیستم اکتوبر کو جھجر آئے، قدم بوس والدین حاصل کیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ ہمارے عقب سے ہماری بے قصوری والد کو ثابت ہوئی۔

ٹڈی دل | امسال ٹڈی دل یعنی ملخ کی اس قدر کثرت ہوئی کہ ہانسی اور تمام ضلع ہریانہ سے لے کر تا بہ اجمیر.. تمام زراعت پامال ہوئی۔
اسی سال میں بسفر اجمیر، طرہ باز خاں کا جو ہمراہ دھونکل سنگھ تھے، بمقام اجمیر انتقال ہوا

سنہ ۱۸۴۴ء

پچاس روپیہ ماہوار | ابھی ہم صرف پچاس روپے ماہوار کے نوکر ہیں۔ صرف نواب صاحب فیض علی خاں صاحب بہادر کو سلام کرتے ہیں اور دوسری جا بھی تلاش معاش کر رکھی ہے۔

---

[1] یعنی نواب جھجر، نواب فیض علی خاں بہادر۔

ماہ جنوری میں، فوج سرکار ابد پائدار انگریزی نے لشکر گوالیار کو شکست دی اور درانی گوالیار بحضور لارڈ صاحب پناہ لائی۔ ہم وہیں والد بہت بیمار رہے تھے۔ کل سرداری (کذا) مزاج پرسی کو آتے تھے۔

چھ مئی کو نواب صاحب بہادر ہمارے مکان پر تشریف لائے اور فرمایا کہ ہر روز حاضر ہوا کرو۔

ماہ جون میں حسن علی خاں بہادر نے جو نواب صاحب پر دعوے کیا ہے، صاحب ایجنٹ نے ان سے اسنادِ ثبوت طلب کری ہیں۔

ماہ جولائی میں منور خاں تھانیدار کا لڑکا گذر گیا

نواب یار خاں قاتل طوائفان نے دہلی میں پھانسی پائی۔

۵ ار جولائی کو غوث محمد خان مع لواحقان (کذا)[1] خود موقوف ہوئے اور وطن کو گئے۔ اسی ماہ میں نواب صاحب سے تین گاؤں پانچ سال کو ٹھیکے میں لئے مع چڑھوانہ کا پٹہ اور موضع ریڈھوداس اور موضع نوادہ کا پٹہ ہمارے نام ہوا۔

میاں جی ضیاء اللہ[2] داروغہ باورچی خانہ مقرر ہوا۔

ماہ اگست میں لارڈ ان برا ولایت کو گئے اور لارڈ ہارڈنگ (اس کے بعد تقریباً تین سطریں کرم خوردہ ہو رہی ہیں اور پڑھی نہیں جا سکیں)

پہلا مقدمہ | (ورق ۲-الف) .... نے پروانہ خوشنودی کا عطا کیا، یہ اوّل مقدمہ تھا جو ہم نے فیصل کیا۔

۱۱ ستمبر کو مبارک محل میں لڑکا پیدا ہوا۔

ماہ اکتوبر و نومبر میں کار جمع بندی دکھیوٹ[3] وغیرہ دیہات مستاجرہ کا کرتا رہا۔

۱۴ ار نومبر کو پروانہ نواب صاحب کا صادر[4] ہوا کہ پرگنہ بڈھوانہ جا کر نقشہ سر دہ (کذا) ربیع اور تعداد جاہات مجاریہ وغیر مجاریہ کل پرگنہ طیار کر کے لاؤ۔ چنانچہ ۱۵ تاریخ کو ہم روانہ ہوئے اور یکم دسمبر کو بڈھوانہ سے چل کر مکان پر آیا اور نقشہ طیار کر کے سرکار میں پیش کر دیا۔ سرکار خوشنود ہوئے۔

اسی ماہ دسمبر میں نواب صاحب نے مقدمہ ترکہ کا جس کا دعویٰ علی حسن خاں صاحب کر رکھا، فتح پایا۔ خان صاحب ہار گئے۔

۳۰ ر دسمبر کو نواب صاحب نے ہم کو باضافہ تیس روپیہ منصرم ملاقہ لاخراجی دروزینہ داران و فیصلانہ داران مقرر کیا۔

سنہ ۱۸۴۵ء

بماہ جنوری کاروبار کچہری خود اور دربار داری نواب صاحب بہادر کرتا رہا۔ اسی ماہ میں راجا بلونت سنگھ رئیس تجارہ کا انتقال ہوا۔

انگز نڈر ہیدرلی | یکم فروری پروانہ نواب صاحب کا صادر[5] ہوا کہ اپنے برادر خورد انگز نڈر ہیدرلی کی لیاقت کا حال لکھو۔ چنانچہ بذریعہ

---

[1] اصل: لواحقان۔ [2] اصل: ضیاء اللہ۔ ممکن ہے ثناء اللہ ہو۔ [3] اصل: ککھوٹ
[4] اصل: صدر [5] اصل: صدر

عرضی لکھ دیا۔

۱۸ فروری کو نواب صاحب کی ایک دختر کا انتقال ہوا اور اسی روز سرکار طرف سانبلہ (کذا) کے تشریف لے گئے ۱۹ کو واپس آئے۔ بوقت سواری سرکار نے فرمایا کہ اپنے والد کے لیے کرمکان پر آؤ۔ چنانچہ والد کو سرکار ہیں لے گئے۔ معلوم ہوا کہ بمقام نجف گڈھ لفٹننٹ گورنر جنرل بہادر سے ملاقات قرار پائی تھی۔

دربار میں نواب اکبر علی خاں باؤدی والا سے ملاقات ہوئی۔

منصرم خزانہ | ۷ مارچ۔ آج حساب خزانچیوں کا طے ہوا یہ حساب والد کے سپرد تھا۔ عرصہ ایک ماہ سے تجویز شکستگی خزانہ قدیم و تجویز جدید در پیش تھی چنانچہ تب سے ...... سرکار ہم سے قانون خزانہ لکھوایا کرتے تھے بعد طے حساب از خزانچیاں و تکمیل و دفعات قانون، آج بتاریخ ۱۸ مارچ کو نواب صاحب نے ہم کو منصرم خزانہ کل ریاست مقرر کیا اور عملہ حسب خواہش ہماری مقرر ہو گیا۔

... کو بعد تقرر عملہ فوطہ داراں و ...... و برہمن وغیرہ ... غوث محمد خاں کچہری خزانہ ..... وغیرہ سہ صد مردم کے جمع ہوئے اور نواب صاحب .... نے دوشالہ بطور خلعت عطا فرمایا۔ (یہ تین سطریں دریدہ ہیں اور صرف اتنے ہی الفاظ پڑھے جا سکے)

(ق ۲ ب) ۱۴ اگست کو سرکار نے تجویز پیمائش پرگنہ بادل (کذا) کی فرمائی چنانچہ ایک صاحب (کذا) مع امین وغیرہ ہمارے تعلق فرمائے (کذا) واسطے جانچ پڑتال کے۔

۲۸ اپریل کو نواب صاحب کے عیش محل میں لڑکی پیدا ہوئی۔

مسماۃ بھی (کذا) نیز مسمی بھوپا پدر ساد وسنگھ کو پرگنہ دادری میں اس کے برادرزادوں نے قتل کیا۔

ماہ جولائی - آخر کار سرکار نے خزانچیاں سابق سے صفائی کر لی اور بدستور ٹھیکہ خزانے کا کر دیا اور ہمارے واسطے تجویز تحصیلداری بڈھوانہ کی مگر ہم نے منظور نہ کیا اور سرکار کو جملہ خزانہ اور دفتر اور دفتر علاقہ لاخراجی سپرد کر کے صافی نامہ حاصل کیا۔ بباعث قبول نہ کرنے تحصیلداری بڈھوانہ کے نواب صاحب خیلے آزردہ خاطر ہو گئے چونکہ ہم بھی ان کی عنایت پر ناز کرتے تھے لہذا ہم نے ایک ماہ کی رخصت سرکار سے لی اور ارادہ الور جانے کا کیا اور والد بزرگوار سے بھی اجازت حاصل کر لی۔

الور | ۱۳ اگست - دو روز میں انتظام دیہات مستاجروں کا کر کے آج بطرف الور روانہ ہوا اور براہ گڑیانی و ریواڑی و بادل اور پیپل کھیڑہ ۱۷ تاریخ کو الور آ کر سرائے میں فروکش ہوا۔

۱۹ اگست کو لال دروازہ ایک مکان کرائے کا لیا اور مرزا اسفند یار بیگ صاحب سے ملاقات حاصل کی۔

۲۲ و ۲۳ کو پیٹر نبزلی صاحب کپتان پلیٹن اور جان رسٹل صاحب اور جناب آغا صاحب سے ملاقات کی۔

۵ ستمبر کو ٹھاکر گلاب سنگھ کیسرولی والا اور ٹھاکر لکھدی سنگھ جی سے ملاقات کی۔ یہ اول ملاقات لکھدی جی سے ہوئی۔

۱۰ ستمبر کو مہاراجا راجا جے سنگھ بہادر سے معرفت اسفند یار بیگ صاحب ملازمت حاصل ہوئی۔

۱۲ ستمبر کو والد کا خط آیا کہ نواب صاحب بہت بیمار ہیں۔

۱۳ ستمبر کو مہاراؤ راجا صاحب کے محل میں لڑکا پیدا ہوا، یعنی شیودان سنگھ جی پیدا ہوئے۔ ہم نے راؤ راجا صاحب کی خدمت

ہیں حاضر ہو کر نذر گذرانی اور مبارکباد دی۔ نذر منظور ہوئی۔ چار گھڑی تک محفل رقص میں حاضر رہا۔ عبداللہ کا ناچ تھا۔

نواب فیض علی خاں

۱۵ ستمبر کو والد کا خط قاصد لایا کہ نواب فیض علی خاں صاحب بہادر نے وفات پائی۔ اسی روز راؤ صاحب کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ راؤ راجا صاحب نے خلعت دے کر فرمایا کہ جب چاہو آؤ۔ تمہارا گھر ہے۔

۱۶ کو گریہ و زاری کرتا ہوا جھجر کو روانہ ہوا۔ ۱۸ تاریخ کو گھر آ کر قدم بوس والدین حاصل کیا۔

(ورق ۳۔ الف) ۱۹ تاریخ کو قلعے میں جا کر نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب کو نذر گذرانی۔ حسن علی خاں اور علی محمد خاں نے دعویٰ ریاست کا کیا ہے اور عبدالرحمٰن خاں کو مستحق نہیں بتاتے ہیں۔ سب اہل کار اور والد کوشش میں ہیں۔

۲ اکتوبر کو والد بسواری فیل واسطے درستی مقدمہ کے دہلی گئے اور ۵ تاریخ کو واپس آئے۔

۸ اکتوبر کو کاک صاحب، یعنی صاحب ضلع روہتک بموجب حکم لفٹننٹ گورنر بہادر برائے تحقیقات جھجر میں آئے اور اظہار مسماۃ جواہر (کنیز) والدہ عبدالرحمٰن خاں صاحب اور اظہار میاں کلو خاں و عنایت خاں اور رستم خاں اور مہر باز خاں وغیرہ کے لیے۔

پلنگ میں آگ

۳ اکتوبر کو ہم واسطے بندوبست دیہات مستاجری نو آئے تھے رات کو بڑی خبر گذری کہ ہمارے پلنگ میں آگ لگ گئی تھی۔ جب کہ نصف چارپائی کا بان، و سوزنی اور ہوس (توشک؟) جلا تب بیدار ہوا، ورنہ تمام جل جاتا۔

۴ نومبر کو نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب کی خلعت کی منظوری آئی۔

نواب صاحب نے ۵ نومبر کو دربار اور محفل رقص کری چناں چہ ہم اور بابا صاحب اور برادر عزیز الک اور رابرٹ کورٹنی جا کر شریک محفل ہوئے اور جملہ اراکین حاضر تھے۔

۱۴ نومبر کو والد مع نواب صاحب دہلی کو گئے اور ۱۵ تاریخ لارڈ ہارڈنگ صاحب نواب گورنر جنرل داخل دہلی ہوئے اور ۱۶ ماہ ہذا کو نواب صاحب بہادر کو خلعت نوابی کا عطا ہوا۔

۱۹ نومبر کو سرکار دہلی سے واپس آئے اور سب نے نذر گذرانی

۲۰ نومبر کو نواب صاحب نے بابا صاحب کو خلعت خوشنودی عطا کیا:

دوشالہ یک — مالائے مروارید یک — تھان کمخواب یک — تھان ململ یک — تھان مخمل یک — شملہ یک

قلمدان نقرہ یک — نقد ایک ہزار الف

ایک دوشالہ سرکار نے ہم کو بھی عطا کیا۔

۲۴ نومبر کو نواب صاحب نے جیو طوائف سے نکاح کیا۔

..... نومبر کو اندر سنگھ سر رشتہ دار مال اور رام رچھپال سر رشتہ دار رخ مقید ہوئے۔ ان سے محاسبہ ..... بنا مصادرہ ..... شروع ہوئی ..... کو جناب غوث خاں نے انتقال کیا۔ بہت شریف آدمی تھے۔ (یہ دو سطریں آب زدہ اور بوسیدہ ہیں اتنے ہی الفاظ پڑھے جا سکے)

(ورق ۳ ب) اسی ماہ دسمبر میں دریافت ہوا کہ ۱۲ر دسمبر کو دس ہزار سوار اور پچیس ضرب توپ سکھاں لاہور کی طرف سے آمادۂ فساد ہوئے ہیں بموجب حکم لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر فوج سرکار برائے جنگ طیار ہوئی۔

نواب صاحب سے جمعیت سوار و پیادہ طلب ہوئی تھی چنانچہ جرنیل محمد خاں (کذا) اور ابراہیم علی خاں بسر کردگی فوج مقرر ہوئے۔

اسی ۲۰ر دسمبر کو والد صاحب ہمشیرہ کی شادی کرنے کے واسطے میرٹھ روانہ ہوئے اور ہم نے تین روز تک مکان پر شغل رقص و سرود شروع کری۔ از خط جناب والد صاحب دریافت ہوا کہ شادی ہمشیرہ عزیزہ کی دوم جنوری کو قرار پائی۔

۱۸۴۶ء

دوم جنوری کو شادی ہمشیرہ عزیزہ امیلیا کی ہو گئی۔

۱۵ر جنوری کو جناب والد صاحب اور برادر عزیز الک صاحب اور والدہ صاحبہ میرٹھ سے آگئے۔

۱۶ر جنوری کو عبد العزیز خاں کا گھوڑا ہمارے نام سے نوکر ہو گیا۔

جنگ لاہور اخبار سے آج ۶ر فروری کو معلوم ہوا کہ بمقام علیوال (کذا) بتاریخ ۲۶ر جنوری جنگ عظیم ہوئی۔ جمعیت سکھوں کی قریب چوبیس ہزار کے تھی اور سرکاری فوج دس ہزار کے قریب تھی۔ آخر ش سکھوں نے شکست فاش پائی۔ قریب چھ ہزار سکھ کشتہ اور زخمی ہوئے اور تخمیناً چار سو آدمی سرکاری زخمی اور کشتہ ہوئے اور بارہ سو شتر غلّے کے اور دیگر اسباب مع ۵۶ توپ قبضۂ سرکار میں آئے۔

نواب صاحب نے دس ہزار روپیہ اندر سنگھ اور سات ہزار منشی رام رچھپال سے بصاورے کے طلب کرے ہیں۔

۱۱ر فروری کو جنازہ یعنی تابوت نواب فیض علی خاں مرحوم کا قطب صاحب کو گیا ہم بھی سونار والا تک ہمراہ گئے تھے۔

۱۵ر فروری کو معلوم ہوا کہ ۱۰ر فروری کو پھر ایک جنگ سکھوں سے ہوئی اور ۶۶ توپ سکھوں کی چھوٹ گئیں۔ فوج سکھاں فرار ہو گئی۔

(ورق ۴ الف) ۲۱ فروری کو گیانی رام وغیرہ معتمدان رام کھتری (کذا) ہمراہ بسنت رائے قانون گو[1] آئے۔ اور ہم سے سوال وکالت کی نوکری کا کرا، اگرچہ والد صاحب کی صلاح نہیں تھی مگر ہم نے ایک واجب العرض لکھ دی ہے اگر . . . . . . منظور کر لے تو مضائقہ نہیں۔

اخبار سے واضح ہوا کہ ۱۶ر فروری کو راجا گلاب سنگھ بخدمت لارڈ صاحب بمقام قصور[2] آیا۔ اور یہ بات قرار پائی کہ ستلج کے اس طرف کا ملک قصور اور پھلور اور تمام علاقہ پار کا سرکار انگریزی کے قبضے میں رہے اور ڈیڑھ کروڑ روپیہ بعوض زیر باری فوج خرچ دیویں جس میں سے پچاس لاکھ نواب اور ایک کروڑ کی قسط مقرر ہوئی۔

میرٹھ چہارم مارچ کو بحصول رخصت پندرہ یوم میرٹھ کو روانہ ہوا۔ ہمشیر اور رابرٹ سے ملا۔ سیر ہولی کی دیکھی۔ بعدہ ۱۵ر مارچ کو مع ہمشیر جھجر کو روانہ ہوا اور ۱۸ر مارچ کو گھر پہ آیا مگر والد صاحب کو نہ پایا وہ . . . کی پیشوائی کو گئے ہیں۔

۲۳ر مارچ کو شمشیر خاں صاحب کا انتقال ہوا۔

---

[1] اصل: قانون گوی　[2] اصل: کسود

۱۱؍ اپریل کو رابرٹ میرٹھ سے آیا اس کی زبانی معلوم ہوا کہ بمقام آگرہ مائیکل کو رٹنی کو دیوانے کتے نے کاٹا ہے۔

۲۵؍ اپریل ویں دلارام رچھپال پر قید میں بہت سختی ہے لہٰذا ہم رات کو رتن لعل صاحب کے پاس گئے اور نصف شب تک ان کو سمجھایا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخرش ہم کہہ کر چلے آئے کہ ہم نے رئیس جدید کے منہ کو خون لگا دیا ہے یہ روز تم کو بھی نصیب ہو گا۔

یکم مئی کو جرنیل صمد خاں مع فوج از جانب سرسٹہ جھجھر آئے۔

نہم مئی کو ہم نے نوکری سے نواب صاحب کو استعفا دے دیا اور برادر عزیز الک[1] کو بجائے خود نوکر کرا دیا۔

۱۶؍ مئی کو مع لالہ برتھبہ دیال اور قلندر بخش و عبدالعزیز خاں جھجھر سے روانہ ہوا اور براہ ریواڑی و تپل (کذا) و الور ۱۸ تاریخ کو بمقام کیسرونی آیا۔

جے پور | (ورق ۴ ب) ۲۳؍ مئی کو روانہ ہو کر براہ راج گڈھ وغیرہ بتاریخ ۲۶؍ مئی جے پور آیا۔ مگر راستے میں شدت گرمی سے بہت تکلیف پائی۔

یکم جون کو ایجنسی میں جا کر خریطہ راناوت جی کا پیش کیا۔ لاؤ صاحب ایجنٹ نے وکالت نامنظور کر لی۔ کرنیل صدرلین (کذا) صاحب ایجنٹ گورنر جنرل یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ وہاں سے واپس آ کر حویلی دیا بھگتن (کذا) کی کرایہ لی۔

۵؍ جون کو ہندومل وکیل بیکانیر سے ملاقات کی۔ ان سے بہت تسلی کی ہے (مشورہ؟) اور نیز منشی جیالعل ایجنسی اور قادر علی جمعدار وغیرہ آدمیوں سے رابطہ پیدا کیا۔

۶؍ جون ـــ لغایت ۱۱؍ جولائی ہم نے بکمال محنت ہندومل وکیل اور جملہ سرداران و اہلکاران راج سے اور دل شیو سنگھ جی سے مل کر تدبیر درستی معاملہ کر لی۔ یقین تھا کہ فتح یاب ہوتے مگر ریسمہ[2] (کذا) نے ہماری تجویزات کو قبول نہ کیا مگر یہ کہتے رہے کہ ہم جو کچھ کریں وہ ایجنسی میں دے دیا کرو اور تنخواہ لئے جاؤ۔ ہم نے یہ بات منظور نہ کی کیونکہ بجز بدنامی کے کچھ حاصل نہ تھا پس سب سے مل کر روانگی کی کر لی۔

۱۲؍ جولائی کو جے پور سے روانہ ہو کر براہ اچرول دھالھیرہ وغیرہ ۱۶؍ جولائی کو جھجھر آیا اور قدم بوس والدین حاصل کیا یہاں آ کر معلوم ہوا کہ لالہ شوقی رام بسنتی والا (کذا) دیوان ریاست ہوئے۔

۱۹؍ جولائی کو ایک لڑکا نواب عبدالرحمن خاں صاحب کا گزر گیا۔

ہمارے آنے سے پیشتر لالہ رام رچھپال اور اندر سنگھ نے رہائی پائی۔ کچھ دینا نہ پڑا۔ یہ سب جناب والد صاحب کی کوشش سے ہوا۔

۲۸؍ جولائی کو نواب صاحب کا پروانہ آیا کہ حساب خزانے کا بابتہ منصرمی خود (؟) عہد نواب فیض علی خاں بہادر شوقی رام کو سمجھا دو۔ چنانچہ ہم نے چوکی خانہ جا کر معافی نامہ نواب صاحب مرحوم کا دکھا دیا جب خاموش ہوئے۔

(ورق ۵- الف) یکم اگست۔ گھر میں یک بیک بیمار ہو گئی۔ ماسوریہ (کذا) وغیرہ کیا گیا۔

اس ماہ میں برخوردار جارج بیمار ہوا اور تمام ماہ بیمار رہا۔

الک کی شادی | ۲۸؍ ستمبر کو والدین واسطے کرنے شادی الگزنڈر ہیدرلی کے میرٹھ کو تشریف لے گئے۔

---

[1] یعنی الگزینڈر ہیدرلی آزاد۔ [2] سرشتہ؟

۴ر اکتوبر کو چڑوانہ وغیرہ دیہات ٹھیکہ کا کن (کذا) شروع کیا۔
۱۵ر اکتوبر کو سیتارام چودھری پرگنہ بادلی کہ نہایت معزز آدمی تھا، گذر گیا۔
۲۷ر اکتوبر کو والدین والک والنزا دولہن کو لے کر جھجھر آئے۔ بخیر و خوبی شادی ہو گئی۔
یکم دسمبر کو رابرٹ کورنی کی چٹھی آئی کہ وہ خود اور نیز ہمشیر امبی والہ عرف ہوپ ٹاؤن میں ہر دو بیمار ہیں۔ چونکہ بباعث بیماری ہمارا ارادہ پنجاب کو جانے کا تھا والد نے فرمایا کہ رابرٹ اور ہمشیر سے مل کر جاؤ چنانچہ ارادہ دہرہ دون کا کیا۔
امبی والہ | ۱۱ر دسمبر کو ہم جھجھر سے روانہ ہوئے اور براہ سنپت و جہردلی (کذا) و شاملی و سہارن پور و کھیڑی
۱۸ر تاریخ کو دہرہ دون آیا اور ۱۹۔ کو بمقام امبی والہ آیا اور ہمشیر اور رابرٹ کو تندرست پایا۔
۲۴ر دسمبر کو لنزی صاحب مالک گرنٹ آئے اور ان سے ملاقات ہوئی۔ رابرٹ نے لنزی صاحب سے کہا کہ کسی طرح ان کو ٹھہرا لو تو میں کام تحصیل کا سیکھ لوں چنانچہ لنزی صاحب نے فرمایا کہ تم دو تین ماہ قیام کرکے یہاں کا کام درست کرو۔ تب ہم تم کو سفارش بطرف پنجاب لکھ دیں گے۔ خیر ہم نے بپاس خاطر رابرٹ قیام کیا۔ لنزی صاحب نے بطور دست خرچ دو روپیہ روز مقرر کر دیا اور خود بطرف بریلی روانہ ہوئے۔
۳۰ر دسمبر کو بسواری فیل مع مددخاں جمعدار لالہ ہینگن لال صاحب تحصیلدار دہرہ دون سے جا کر ملاقات کری اور نیز سیر محرم کری آج ۱۰ محرم ہے۔

سنہ ۱۸۴۷ء

(ورق ۵۔ ب) یکم جنوری سے کاروبار کچہری و خبر گیری تردد زراعت (کذا) اور نوشت خواند جمع خرچ وغیرہ شروع کیا۔
۱۵ر جنوری کو راس صاحب حاکم دہرہ دون اور ہینگن لال صاحب تحصیلدار واسطے ملاحظہ سرحد ہوپ ٹاؤن تشریف لائے چنانچہ بکمال خیر خواہی سرحد بندی کرا دی بلکہ کسی قدر زمین چند ربی کی اپنے علاقے میں آئی۔
ماہ دسمبر ۱۸۴۶ء یعنی ماہ گذشتہ میں سوائی خان (کذا) کو بطرف پٹیالہ روانہ کیا تھا واسطے دیوان نہال چند کو دو سطر روزگار کے لکھا تھا مگر ۱۹ر ماہ حال کو سوائی خاں پٹیالہ سے واپس آیا دیوان مذکور نے عذر لکھ دیا۔
۲۲ر جنوری کو مائکل کورٹنی مع قبیلہ خود اس جگہ یعنی امبی والہ وارد ہوئے۔
۲۴ر کو والد کا خط آیا لکھا ہے کہ برخوردار چارج کے خارش ہو گئی تھی اور اسپ مادہ سفید والد کی سواری کی مر گئی اور طبیعت ہر دو قبلہ و کعبہ (کذا) علیل ہے۔
کولھو | ۲ر فروری۔ ہم نے حوار (کذا) یعنی کولھو ولایتی کا کام جو پانی کے ذریعے سے چلتا ہے واسطے نیشکر کے جاری کیا۔ ۲۴ روپیہ روز کی مدد مع حلوائی وغیرہ لگا کر ہر دو کولھو میں ۷۵ من راب روز تیار ہوتی ہے۔
۲۱ر فروری۔ فتا مقدم چڑھوانہ کا مع خطوط والد جھجھر سے آیا ہے۔
۱۵ر مارچ۔ کپتان وہائٹ صاحب ہمشیر زادہ لنزی صاحب گرنٹ میں آئے ہیں۔

۱۹ مارچ کو دوپٹہ کے راجا سے ملاقات کری۔
اسی ماہ میں لالہ ہینگن لال تحصیلدار نے کئی بار اقرار کیا کہ چٹھی سفارش راس صاحب سے اور پلادون صاحب کمشنر سے لکھا دوں گا مگر ہمارے مقسوم میں آج کل روزگار نہیں لہٰذا کچھ ظہور میں نہ آیا۔ اسی ماہ میں ایک لڑکا حکیم قاسم علی خاں کا گذر گیا۔
۲۲ مارچ کو صاحب رام بزاز جگھر والا کا انتقال ہوا۔

میلہ ہردوار | ۸ اپریل کو ہم اور کپتان وہائٹ صاحب واسطے سیر میلہ ہردوار بسواری فیل نہنت جی گوردوارہ والا، ہردوار میں آئے[1] اور بمقام بھیم گوڑہ خیمہ کھڑا کیا۔

۱۴ اپریل کو واپس ہردوار سے آکر والد کا خط پایا، معلوم ہوا کہ نیل ولی محمد کو فالج ہو گیا۔
۳۰ اپریل کو براہ دیہات کدارا والا (راجا والا علاقہ بھگوان پور میں کہ یہ جنگل شیروں اور ہاتھیوں کا مسکن ہے (ورق ۶ - الف) وہاں جا کر آبادی اور ترددا (کذا) کو دیکھا۔
۲۲ مئی کو ایک عرضی پانی پت کو بامید روزگار بخدمت چارلس گبس صاحب تحریر کری مگر کچھ ظہور نہ ہوا۔
۳ مئی کو لنزی صاحب بریلی سے تشریف لائے۔
ان روز وں میں ایک ہاتھی چند خون آدمیوں کے کر چکا ہے اور کپتان وہائٹ صاحب اسی ہاتھی کے مارنے کو گئے تو چلا گیا مگر اتفاقاً رفل کی گولی وہائٹ صاحب کے کف پا میں پار ہو گئی۔

الک کی دختر | ۱۹ مئی کو عنایت نامہ والد صاحب سے دریافت ہوا کہ برادر عزیز الک کے گھر دختر پیدا ہوئی اور لکھا ہے کہ بہادر علی خاں پسر عبدالحمید خاں پٹیالہ نوکر ہو گیا۔

ہر چند لنزی صاحب سے عرض کیا کہ موافق وعدے کے چٹھی سفارش عطا کرو اور وہ اصرار کرتے رہے کہ ہمارے نوکری بدستور کرتے رہو۔ ہم نے انکار کیا۔ آخر کار صاحب موصوف نے چٹھی سفارش کی نہ دی اور مختصر سارٹیفکٹ لکھ دیا۔
۱۳ جون کو راجا سکیٹ منڈی والا آئے اور بر کوٹھی راجا ہندو راؤ فروکش ہوئے۔ راجا موصوف نے ایک نافہ عطا کیا۔

میرٹھ | ۱۴ جون کو امبی والا سے روانہ ہو کر ۱۶ جون کو میرٹھ آیا۔

دوم جولائی کو میرٹھ سے روانہ ہو کر ۵ جولائی کو جگھر آیا اور قدم بوس والدین حاصل کیا۔
۳ جولائی کو اسمتھ صاحب کے پاس سے جواب آیا کہ جس وقت ہم میرٹھ آویں اس وقت حاضر ہونا۔
ضلع شہجہانپور میں دو کلک جی فساد کر رہا ہے جا بجا وہارا (کذا) دیتا پھرتا ہے۔
۱۷ اگست۔ شوکت علی صوبہ دار اور شیخ احمد علی وغیرہ ہمارے روزگار کی سعی کر رہے ہیں اور دیوان شوتی رام بھی اقرار کرتے ہیں۔

نواب زین العابدین خاں عارف | ۲۲ اکتوبر کو سوار ہو کر دلی آیا اور لالہ اجودھیا پرشاد کے مکان پر قیام کیا اور نواب زین العابدین خاں عارف سے ملاقات کری۔ اسی ماہ میں امانت علی تحصیلدار کاشی کا انتقال ہوا۔

---

[1] اصل: ماسب علی (ثابت ؟)

۲۴؍ اکتوبر کو ہم گھر پر آئے دہلی میں نواب اکبر علی خاں سے سعی روزگار کی بابت چاہی تھی مگر کارگر نہ ہوئی۔
(ورق ۶ ب) ماہ نومبر میں لارنس صاحب ایجنٹ جے پور ولایت کو گئے اور جاکسن صاحب بجائے ان کے ایجنٹ مقرر ہوئے۔
اسی نومبر میں وولگ جی دہاری علحدی والہ (کذا) گرفتار ہوا۔

میرٹھ | ۱۹؍ نومبر کو سجن خاں کی عرضی سے واضح ہوا کہ اسمتھ صاحب کمشنر اپر بٹ شملہ سے میرٹھ آ گئے یہاں ہم ۲۲؍ اکتوبر کو روانہ ہو کر میرٹھ آیا اور معرفت منشی بنسی دھر صاحب اسمتھ صاحب سے ملاقات کری۔ ملاقات دوم میں کمشنر صاحب نے فرمایا کہ ہماری نوکری کرکے ہمارے علاقہ پتھری ندی کا بند و بست کرو ہم نے عرض کیا کہ ہم کو پربت میں نوکر رکھو تو ہم وہاں کا بھی بند و بست کر دیں گے۔ مگر یہ کاروزگار منظور نہیں ہے غرض کہ اسی بحث میں صورت روزگار کی نہ ہوئی۔ ابھی گردش رفع نہیں ہوئی ہے۔

سنہ ۱۸۴۸

بارہ محل | ۱۹؍ جنوری کو نواب صاحب ایک چھوکری علی محمد خاں کے محل سے لائے جس کی عمر سی و پنج (۳۵) سال کی ہو گی۔ اس کو حرم بنایا اب بارہ محل ہوئے۔

۲۴؍ جنوری، آج نواب صاحب ددھانہ والا سے ملاقات کرآیا اچھا رئیس ہے۔

۲۹؍ جنوری، دیوان شوقی رام مع تمامی اسباب خود دہلی کو بجانب خود روانہ ہوئے۔

۲۶؍ فروری کو لالہ رتن لعل صاحب بھی قید ہوئے چنانچہ جو ہم نے ۲۵؍ اپریل ۱۸۴۷ء میں بابت رام پھپال ان سے کہا تھا سو پیش آیا۔

اسی تاریخ کو چار پہرہ دیوان شوقی رام کے مکان پر تعینات ہوئے۔ مقید میں پہرہ موقوف ہو کر گھر کو گئے۔

۶؍ مارچ کو نواب صاحب نے ہم کو تحصیلدار بڈھوانہ کا کیا۔ شکر خدا کا بعد مدت روزگار کی صورت نظر آئی۔

۸؍ مارچ کو ہم بڈھوانہ کی تحصیل میں آ گئے۔

۱۲؍ مارچ کو پیارن بیگم ہمشیرہ نواب علی محمد خاں اور سعادت علی خاں پسر نواب حسن علی خاں کی شادی ہوئی۔

۷؍ مئی کو پنڈت گدار ناتھ مختار ریاست جھجر ہوئے۔

۸؍ مئی کو والد کا خط آیا، لکھا ہے کہ نواب صاحب مکان پر آئے تھے دو اشرفی جارج کو دے گئے۔

۱۱؍ مئی کو خبر آئی کہ دیوان شوقی رام دہلی جا کر انتقال کر گئے۔

(ورق ۷۔الف) ۲؍ جولائی نواب صاحب کے محل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔

۷؍ جولائی، نواب صاحب کے محل میں لڑکی پیدا ہوئی۔

سنہ ۱۸۴۹

فتح ملتان | ماہ جنوری میں خبر آئی کہ قلعہ ملتان فتح ہو گیا اور ایک میگزین غنیم کا کہ جس میں آٹھ ہزار من بارود ہے وہ اُڑا دیا گیا اور دیا

مول راج ملتان والا، سرکار میں حاضر ہو گیا اور ملتان فتح ہو گیا۔

۲ر مارچ کو نواب صاحب بڈھوانہ تشریف لائے اور ہماری کارگذاری دیکھ کر تعریف کی اور خوش ہوئے۔

کوہ نور | ماہ اپریل میں عمل دخل سرکار انگریزی کا لاہور میں ہو گیا اور جواہر کوہ نور ولایت کو بھیجا گیا۔

بماہ مئی سوائے رسالہ وغیرہ موجودہ تحصیل، اور ایک رسالہ حسب الطلب ہمارے جھجر سے برائے نہ کوئی بکمانے جھو جھو آیا۔

بماہ جولائی نواب صاحب نے واسطے گرفتاری جہتاب سنگھ وغیرہ فرزندان جیون سنگھ ناظم بہادر تم (کذا) موضع کھودانہ سے حکم دیا ہم مع دو رسالہ اور دو ضرب توپ ایک کمپنی تلنگان کھودانہ گئے اور دیہہ کو محاصرہ کیا مگر عند التلاشی کسی کو نہ پایا مچلکہ ایک ہزار روپیہ کا نمبرداروں سے لکھا کر فوج کو واپس کیا۔

اسی ماہ میں ماتھیوز صاحب کا دہلی میں انتقال ہوا۔

الک کے گھر فرزند | ۱۵ستمبر کو جناب والد صاحب کا خط آیا کہ برادر عزیز الک کے گھر اللہ سے ایک لڑکا پیدا ہوا اور نام اس کا حبان رکھا گیا۔

اسی ماہ ستمبر میں بھنورا وغیرہ بدمعاشوں نے پنڈت کدارناتھ کو اغوا کر کے ہماری واصلات کی تجویز کری مگر جب کچھ ثبوت نہ پایا تو پنڈت صاحب نے پشیمان ہو کر ہم کو رخصت کرایا۔

قحط عظیم | ماہ اکتوبر میں نواب صاحب نے پانچ ہزار روپیہ خزانچیوں سے صادرہ کا لیا۔ امسال قحط عظیم ہوا۔ خصوصاً تن کال کہ پورانے باجرے کی پرلیاں فی روپیہ ۲۵ پیسے تک بک گئے۔ ہم نے کئی ہزار من غلہ جو، قلعہ کانوند سے منگا کر بطور تقاوی کے دیہات میں تقسیم کیا۔ اس سال میں کثرت سے فوج سرکار انگریزی کی تبدیلی ہو کر براستہ پرگنہ ہذا گذر گیا۔ جہاں جو سب کو بخوبی رسد دی اور افسران کو خوشنود کیا۔

اسی سال بماہ دسمبر میں نواب دوندے خاں رئیس دوجانہ کا انتقال ہوا۔

سنہ ۱۸۵۰ء

(ورق ۷-ب) ماہ مارچ میں نواب صاحب کے توشہ خانے میں چوری ہوئی بہت اسباب چوری گیا۔

۶ر مئی کو یعنی ۲۳ ر جمادی الثانی ۱۲۶۶ھ یوم دو شنبہ کو برخوردار جوزف پیدا ہوا۔ ماہ جون میں ہم واسطے تلاش مال مسروقہ نواب صاحب جانب فرخ نگر و سہسرا و رسونہہ (کذا) وغیرہ گئے اور ہمراہی شیخ اسد علی تھانیدار متعین موضع دجھنہ و اکبرپور پرگنہ لوہ ضلع گوڑگاؤں میں تلاشی لی۔ فقط ایک راکھ کا ڈھیر سنار کے گھر میں دیکھا اور کچھ پتہ نہ لگا۔

۱۷ر اگست کو ہم بہ ترقی تنخواہ تحصیلداری کانوند پر تبدیل ہو کر آئے۔

ماہ ستمبر سے وبا ہیضے کی پھیلی ہم نے ایک عرق تجویز کر کے کشید کرایا وہ صدہا جگہ تقسیم ہوا بہت فائدہ ہوا۔

ماہ ستمبر میں ڈاک خانہ سرکار انگریزی جھجر میں قائم ہوا۔

۸ر اکتوبر کو جھجر آ کر جمع دو فصل خریف سرکار میں داخل کیا دس ہزار روپیہ اضافہ کے قبول کر کے واپس تحصیل کر آیا۔

ماہ دسمبر میں بمقام عیش بن یعنی چھوچھک داس میں شیخ نصراللہ صاحب نے ایک مکان جدید طیار کرایا تھا اس میں ان کی دختر اور داماد اور لڑکے اور دو عورت خدمتگار سوتی تھیں رات کو مکان مذکور خود بخود گر گیا اور سب دب کر مر گئے فقط شیخ نصراللہ صاحب باقی رہ گئے۔

ماہ ہذا میں ۵ ہزار ۷ سو روپیہ گلاب سنگھ چودھری اور عملہ تحصیل سے نواب صاحب نے مصادرہ کے لئے۔ گلاب سنگھ سیتارام باولی والا کا بیٹا ہے۔

سردار خاں تحصیلدار باولی سے نواب صاحب نے مصادرہ لیا۔

۱۸۵۱ء

۱۷ر جنوری کو عنایت نامہ والد صاحب کا آیا، لکھا ہے کہ احمد بیگ اور یوسف بیگ وغیرہ نے میری طرف سے نواب صاحب کو برہم کیا ہے۔

۱۹ر جنوری کو پروانہ نواب صاحب کا صادر ہوا کہ ما بدولت وہاں تشریف لاتے ہیں اسی جگہ بے باقی ہوگی (ورق ۸۔الف) ہم ۲۰ تاریخ کو کانوند سے روانہ ہوئے اور عملہ کو تحصیل میں چھوڑ آئے۔ ۲۱ر جنوری کو سرکار میں جا کر سلام کیا اور بعد دریافت کے عملہ تحصیل کو مع کاغذ بذریعہ سوار طلب کیا۔

نواب عبدالرحمٰن خاں | ۲۲ر جنوری کو نواب صاحب نے تخلیہ میں فرمایا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ طامس صاحب نے بارہ ہزار روپے کا تغلب کیا ہے سو ہمارا تمہارا معاملہ واحد ہے بہتر ہے کہ تم ہم سے تنہائی میں فیصلہ کر لو۔ عرض کیا گیا کہ یہ بات محض غلط ہے آپ مخبروں کی ضمانت لے لیں اور حسب قاعدہ تحقیقات فرمائیں اگر ثبوت ہوگا تو ہم دیں گے ورنہ بقدر دعویٰ آپ ان سے وصول کریں حضور کا فائدہ ہر دو طرح سے ہے۔

۲۳ر جنوری کو سرکار نے چھوچھک داس کو کوچ کیا سنا ہے کہ نواب صاحب نے ایک لاکھ روپیہ کا تکدمہ لکھا ہے کہ اب کے دورے میں یہ روپیہ ملازمین اور رعایا سے بطور مصادرہ اور نذرانہ وصول کریں گے اور ہمارے مقدمے میں کسان مندرجہ ذیل مستعد فساد ہیں: احمد بیگ، یوسف بیگ، میر منور، امیر بہادر علی، گلاب چوبدار، بندہ باز خاں پیشکار، چھتر ل قانون گو۔

۲۵ر جنوری کو ہم نے دو دور قہ بے باقی کا پیش کر دیا۔

۲۷ر جنوری کو نواب صاحب بمقام بڈھوانہ آئے اور ۲۸ر تاریخ کو سرکار نے جملہ قانون گو اور چودھریان کانوند کو مع صندل خاں اور ظاہر سنگھ باجنزہ والا (کذا) و دیگر کسان کل ۱۴ نفر کو پابجولاں کیا اور ہم کو حکم ہوا کہ بحراست ۱۴ سوار جھجر کو جاؤ اس پر ہم نے جواب صاف دیا کہ بلا تحقیقات اور بلا ثبوت ہم ہرگز حراست میں نہیں جاویں گے چونکہ یہ معاملہ آبرو کا تھا۔ ہم نے فوراً ہتھیار وغیرہ سے آراستہ ہو کر ارادہ مقابلے کا کیا تو تا دیر اہلکاران سرکاری درمیان گفتگو کرتے رہے۔ آخرالامر نواب صاحب نے فرمایا کہ ہم لشکر میں خیمہ کھڑا کرا دیں۔ اس میں قیام کرو۔ اس بات کو ہم نے منظور کر لیا۔

۲۸ر تاریخ کو نواب نے کل زمینداران پرگنہ بڈھوانہ کو طلب کر کے بزبان خود دریافت کیا کہ ڈھائی برس کی تحصیلداری میں تم سے طامس صاحب نے کیا کیا لیا؟ اور کیا کیا ظلم کیا؟ سب نے یوست کندہ کہا (کذا) کہ ہم نے ایک حبہ تحصیلدار کو نہیں دیا ہم اس سے بہت خوش ہیں

کچھ ظلم ہم پر نہیں کیا۔ اور قحط سالی میں غلہ دے کر ہم کو جلا وطن نہیں ہونے دیا۔

۱۳ر جنوری کو نواب صاحب نے معرفت سپہ دار خاں تحصیلدار بدھوانہ کے پیام صفائی کا دیا اور نذرانہ طلب کیا کہ اپنے عملہ تحصیل سے وصول کر دو۔ چوں کہ وہ موقع ایسا ہی تھا ہم نے مصلحت وقت سمجھ کر بعد طے شرائط ہم نے ۴۲ ہزار روپے کی نوشت لکھ دی اور اسی وقت گیارہ (ورق ۸ ب) بجے رات کو پروانہ بحالی کا اور دوشالہ رخصت کا حاصل اور جملہ آدمیوں کو قید سے رہائی دلا کر دو بجے رات کو کانوند روانہ ہوا۔

یکم فروری کو شہر کانوند داخل ہوئے حسب معمول پیشوائی کی۔

۴ر فروری کو رات کے وقت نواب نے ایک مہاجن طوطا رام کو گرفتار کر کے نذرانہ طلب کیا اس خوف سے کل ساہوکار فرار ہو گئے اور شہر میں ہڑتال ہو گئی۔

۷ر فروری کو سرکار نے ہم کو حکم دیا کہ ساہوکاروں کو جو علاقہ انگریزی میں چلے گئے ہیں لا کر آباد کر دو اور خود بدولت بخوف بدنامی نارنول کو تشریف لے گئے سنا ہے کہ نارنول کے عہدہ دار بھی روپوش ہو گئے۔

۹ر فروری کو ہم نے مہاجنان کو لا کر آباد کر دیا اور سب کی تسلی کر دی۔

۱۰ر فروری کو نواب صاحب جھجھر تشریف لے گئے کیوں کر (کذا) جہاں جاتے تھے وہیں سے خلقت بھاگ گئی تھی۔

استعفا | ۱۷ر فروری کو ہم نے استعفا لکھ کر سرکار میں بھیج دیا کہ ہم سے نذرانہ وصول نہیں کیا جاتا۔ ہم کو روزگار منظور نہیں ہے۔ سرکار نے اسی وقت بذریعہ سوار پروانہ بھیجا کہ جلد حاضر ہو چناں چہ ہم آئے۔ سرکار نے سمجھایا کہ استعفا مت دو۔ مگر ہم نے صاف کہہ دیا کہ ہم سے روزگار نہیں ہوتا اسی اثنا میں خبر آئی کہ کانوند سے بچول نکلی (کذا)

۲۱ر فروری کو تہور خاں قلعہ دار کی عرضی، کہ کل پرگنے کے نمبردار، رچودھری قانون گو کانوند سے نکل کر ریواڑی کو گئے ہیں سرکار نے ہم کو حکم دیا تم سمجھا کر سب کو لے آؤ۔ چناں چہ اسی وقت ہم ریواڑی کو روانہ ہوئے۔

دہلی | ۷ر مارچ کو ہم ہمراہ بچول کہ قریب ڈیڑھ سو آدمی کے تھے گوڑگاواں آئے یہاں شیخ طالب علی واسطے لے جانے بچول کے آئے۔

۸ر مارچ کو بچول نے دہلی کو کوچ کیا۔ ہم اور طالب علی بھی دہلی کو آئے۔ طالب علی کشن گنج میں مقیم ہوئے اور ہم عیدگاہ والی سرائے میں آئے۔ زمیندار طالب علی کی فرمائش کو خاطر میں نہیں لاتے۔

۱۰ر مارچ کو درگا پرشاد وکیل حاضر باش ایجنٹی ہمارے پاس آئے اور ہم نے صاف کہہ دیا کہ جب تک نواب صاحب ہم کو صافی نامہ نہ دیں گے ہم دہلی میں رہیں گے۔

(ورق ۹۔ الف) ۲۲ر مارچ، آخر کو نواب صاحب نے بتنگ آکر ہمارا استعفا منظور کیا اور صافی نامہ لکھ دیا اور ایک سند والد کو لکھ دی کہ اول تو تم کو موقوف نہ کریں گے اور جو تم کو علیحدہ کریں گے تو تم کو پنشن دیں گے۔

۲۴ر مارچ کو ہم جھجھر آ گئے۔ بچول والا بدستور دہلی رہے۔ بلکہ اور لوگ جن سے نواب صاحب نے مصادرہ لیا تھا سب دہلی میں جمع ہو گئے اور نالش شروع کر دی۔

چہارم مئی بروز یکشنبہ ۹ بجے دن کے برخوردار چارلس پیدا ہوا۔

آخر کار اسی ماہ اگست میں نواب لفٹننٹ گورنر نے نواب صاحب سے سب مستغیثوں اور فریادیوں کا راضی نامہ طلب کیا۔ لاچار نواب نے آگرے سے پنڈت کدارناتھ کو طلب کر کے دوشالہ مختاری کا دیا اور اس کی معرفت سب آدمی دہلی سے بلائے اور جن جن سے مصادرہ لیا تھا سب کو خزانے سے نقد واپس کیا اور راضی نامہ لیا اور سب نے اپنی داد پائی۔

۱۳ ستمبر کو خزانچیوں کو بھی دوشالہ دے کر بحال کیا اور زرِ مصادرہ واپس دیا۔

۵ دسمبر کو سامان سفر واسطے جانے جے پور کے تجویز کیا، بلا کسی ذریعے کے صرف توکل پر جانا تجویز کیا ہے۔

جے پور | ۷ دسمبر کو والدین سے رخصت ہوا۔ ہشتم کو کانوند آیا۔ ایک زمانہ ملنے کو آیا اس لئے دو مقام کرے۔

۱۱ دسمبر کو نارنول آیا اور ایک مقام کر کے براہ کوٹ پوتلی اور بھابھرا اچرول وغیرہ، ۱۶ تاریخ کو جے پور آیا اور سرائے میں مقیم ہوا۔ چند جگہ سے دعوت آئی۔

۲۹ دسمبر کو چونکہ کرنیل لو صاحب دورے میں تشریف لاتے ہیں راول شیو سنگھ ان کی ملاقات کو روانہ ہوئے اور ہم بھی ہمراہ لالہ بکتی رام کوتوال اور لالہ ٹھنڈی رام پسر لالہ ندکور بمقام "چاٹ سو" آئے۔

۳۱ دسمبر کو بمقام دھوراجپورہ آیا۔

یہ سال تمام بیکاری اور قرضداری میں گذرا مگر سب خیر رہی۔

سنہ ۱۸۵۲

یکم جنوری کو بمقام دھوراجپورہ راول شیو سنگھ جی مصاحب راج سوائی جے پور سے ملاقات حاصل (ورق ۹ ب) کر کے جے پور کو واپس روانہ ہوا۔

۲۷ جنوری کو والد کا خط آیا، لکھا ہے کہ رابرٹ کورٹنی جھجھر میں آ گیا اور بست سوم (۲۳) کو روانہ ہوگا۔

۳۱ جنوری کو رابرٹ کورٹنی ہمارے پاس جے پور آئے۔ خیریت خانہ معلوم ہوئی۔ طیاری سفر کی کری۔

اودے پور | ۲ فروری کو جے پور سے چل کر بمقام دھودھو آئے اور براہ بھگرو کشن گڑھ پانچ تاریخ کو اجمیر آئے۔

۹ فروری کو پشکر جی دیکھتے ہوئے گو بند گڑھ فروکش ہوئے۔ صباح موضع دہنریہ (کذا) تک جا کر معلوم ہوا کہ کرنیل لو صاحب اہرن پور کی چھاؤنی سے اودے پور کو روانہ ہوئے لہذا اسی سے گاؤں کے متصل مقام کیا اور راستہ کوہ آبو کا چھوڑ کر اودے پور کی راہ لی اور بتاریخ دہم بمقام بھابھرہ آئے۔ یہاں کے پہاڑ میں ابرک کی کان دیکھی اور بھابھرے سے چل کر بمقام نیا شہر آئے اور یہاں سے گھاٹ کیسو پورہ کو اتر کر موضع بدنور علاقہ اودے پور میں آئے۔ یہاں ایک راجا ہے اس کا اہلکار شیخ غوث بخش مع سامان رسد ملنے کو آیا۔ پھر مقامات مفصلہ ذیل کو گذر کیا۔ اسپند، رامی پور، لاوہ، کاکردلی کے قریب راج نگر، ناتھ دوارہ، دیلوداڑہ، اودے پور۔

اس راستے میں کمال تکلیف پائی مگر راستے کے راجگان سے دعوت و رسد آتی رہی۔

۱۷ فروری کو ہم اودے پور آئے اور ۱۸ ماہ ہذا کو کرنیل لو صاحب ریذیڈنٹ بھی داخل ہوئے

۱۹ کو رابرٹ کورٹنی مع چٹھیات بخدمت کرنیل لو صاحب گیا۔ صاحب موصوف نے کچھ التفات نہ کیا اور اپنی بے اختیاری

بیان کری اور رابرٹ کو رخصت کیا۔ یہ محنت مفت برباد گئی۔

۲۲ رفروری کو اودے پور سے روانہ ہو کر براہ کھیلی دنبیرا ولا کھولا وجیلواڑہ وشاہ پورہ وکیکری و مالپورہ و نالونیلہ و ماڈھو راجپورہ ، چل کر بتاریخ ۴ رمارچ کو بمقام جے پور آئے۔

جھجھر ۵ رمارچ کو جے پور سے روانہ ہو کر بتاریخ نہم مارچ جھجھر میں آیا اور بقدمبوس والدین حاصل کیا جمعو بت سفر سے فارغ ہو کر دوسری آفت میں گرفتار ہوا یعنی چار روز برابر نورچشمی میری کو شدت سے بخار رہا۔ بتاریخ بستم مارچ چیچک نمودار ہوئی۔ کمال تکلیف میں ہے۔

۲۴ رمارچ کو برخوردار جوزف کے بھی چیچک برآمد ہوئی۔ ہر دو بچے آفت میں گرفتار ہیں۔

۲۶ رمارچ کو نواب صاحب کو صاحبزادہ نور علی خاں (اس کے بعد عبارت مغشوش ہے)

(ورق ۱۰۰ - الف) ۲۷ رکو برخورداری میری اور برخوردار جوزف کی چیچک ڈھلی ہے گر میری کو غفلت بدستور ہے۔

دو موتیں ۴ راپریل کو گھر میں بھی بخار اور دردِ گلو ہو گیا بوجہ شب بیداری وغیرہ تکلیفات کے۔

۸ راپریل کو برخوردار چارلی کے بھی چیچک نمود ہوئی اور شکل چیچک کی خراب ہے۔

۱۲ راپریل کو بابا صاحب کو بخار بشدت ہوا پاشویہ وغیرہ کیا گیا۔

۱۳ رماہ ہذا کو چارلی کے چیچک کے دانے بیٹھ گئے اور کمال تنفس ہے۔

۱۵ راپریل کو میرا پیارا بیٹا چارلی ۲ ابجے دن کے جاں بحق تسلیم ہوا۔ اپنے احاطے میں دکھا گیا:

قطعۂ تاریخ

ہائے وہ نونہال گلشن عمر	نام تھا جس کا چارلس ہڈرلی
باغ ہستی سے نیست ہوئے ہے	تھی یہی چرخ کی مراد دلی
موت نے دم میں پا لیا مقصد	زیست کی حیف آرزو نہ ملی
تا کجا رنج صبر کر آزاد	کس کو اس غم کی انتہا نہ ملی
سر کلفت اڑا کے لکھ تاریخ	واۓ بربخت ابتر ازلی
	۱۸۵۲ ع

۳۰ راپریل سے برخوردار جوزف کو دست شروع ہو گئے۔

دوم مئی رات کے ایک پاس شب گذرے ۔میاں جوزف ہڈرلی صاحب بھی اپنے برادر چارلس ہڈرلی کے پاس روانہ ہوئے ہم کو داغ الم دے گئے۔ آج یک نیم پاس روز برآمدہ اس کو جو مادر عالم ہے ، چارلی کے دستِ چپ کی طرف ، سونپ دیا افسوس کہ ۲۵ دن کے اندر ہی دو لڑکے گذر گئے۔

۶ رجولائی کو مولوی عبدالغنی اہل کار سر رشتہ مختار صاحب روپوش ہوئے۔ شیر دین خاں ان کو پکڑ کے لائے اور وہ ۱۳ رجولائی کو ..... (مغشوش) ہوئے۔

۱۵ رجولائی ہشکر اس خالق اور رزاق کا کہ آج مدت کے بعد صورتِ روزگار نظر آئی یعنی نواب صاحب نے ہم کو تحصیلدار پرگنہ باول کا کیا۔

(ورق ۱۰ب) ۲۴ ستمبر کو ہم بادلی سے تبدیل ہو کر تحصیل نارنول میں آئے۔ یہ سب سے کلاں محال ہے اور تنخواہ بھی زیادہ ہے اور پرگنہ خوش و بہندا اور غریب ہے۔

۱۰ نومبر کو پروانہ سرکار متضمن خوشنودی مزاج از کارکردگی صادر ہوا۔

۵ دسمبر کو شیر خاں اور روپ رام کہار جارج کے لانے کے واسطے آگرے کو گئے بڑے دن کی تعطیل میں۔

اسی ماہ میں زمینداران کانوند نے ارادہ بچول کا کیا تھا چنانچہ ہمارے پرگنے میں بہکانے کو آئے مگر ہم نے چند نفر زمیندار پرگنہ کانوند کے گرفتار کر لئے اس لئے بچول موقوف ہو گئی مگر چھان (کذا) نمبردار سوبھاپور فرار ہو کر موضع نہال پورہ علاقہ الور میں جا رہا۔

سنہ ۱۸۵۳ء

۶ جنوری کو خبر آئی کہ والدہ رابرٹ کورٹنی کا ۱۴ دسمبر کو انتقال ہوا۔

۷ جنوری کو فرحت حسین اور علی حسین پسران ابوالحسن خاں صاحب جاگیردار نرکیبا داس ملنے کو آئے۔

۱۳ جنوری کو معلوم ہوا کہ پرگنہ کانٹی سے بچون نکل کر دہلی کو گئے۔

اونٹ کی چوری | ۱۰ فروری کو ہم واسطے دینے سبے باقی کے جھجر کو چلے۔ بمقام کانوند سرائے میں فروکش ہوئے۔ ہم ایک شتر پر وہت گنگارام کا مانگ کر لائے تھے اس کو رات کے وقت چور لے گئے۔ تھانیدار وغیرہ کو سراغ پر روانہ کر کے ۱۱ فروری کو جھجر آئے۔

۱۶ فروری روز چہار شنبہ ہفتم جمادی الاول کو دختر نیک اختر یعنی نور چشمی جبین پیدا ہوئی بمقام نارنول۔

۱۹ فروری کو دو ورقہ سبے باقی پرگنہ کا سرکار میں داخل کر دیا اور ۱۲ ماہ حال کو دو شالہ سرکار سے عطا ہوا۔

۲۵ تاریخ کو ہم نارنول آئے اور لڑکی کا دیدار دیکھا۔ یعنی جبین کا طول عمرہ (کذا)۔

(ورق ۱۱ - الف) یکم مارچ کو پروانہ سرکار کا آیا کہ یہاں حاضر ہو کر شریک شادی میاں نور علی خاں کی ہو۔ چنانچہ دوسری تاریخ کو ہم جھجر کو روانہ ہوئے اور ۵ تاریخ کو ہمراہ برات پاٹودی کو گئے۔ ۷ تاریخ کو جھجر کو واپس آئے۔

۹ مارچ کو سرکار سے منفصل حال فصل ربیع آئندہ کا کہہ کر ۱۲ تاریخ کو نارنول آیا اسی مہینے میں امیرا نمبردار موسنوتہ کا گذر گیا بہت اچھا آدمی تھا اور بہادر تھا۔

۲۵ اپریل کو خبر آئی کہ رابرٹ کورٹنی کے والد چنارگڈھ میں گذر گئے۔

۲۷ اپریل کو نابو خاں مع ہنڈوی دو عدد روپیہ مرسلہ رانا دت جی رسمہ کھیری (کذا) آیا۔ رانا دت جی ہم کو بطور مختار ریاست کے نوکر رکھنا چاہتے ہیں۔ عطاء اللہ خاں تھانیدار نارنول مقرر ہوئے۔

۱۲ مئی کو مسمی چھیاں نمبردار سوبھاپور فرار ہو کر موضع تھا پہرہ علاقہ الور میں چلا گیا اور اس نے تدبیر بچول برآوری کی کری اسی کی ایما سے منسا رام نمبردار ماجھیو بھاگ گیا۔

۱۳ کو عرضی اطلاعی سرکار کو کری اور چند کسان جو شریک صلاح چھیاں کے تھے ان کو گرفتار کر کے قید کیا۔ چنانچہ اب بچون نکلنا ملتوی ہو گیا۔ سب زمیندار ڈر گئے۔

۱۷ مئی کو چھیاں کی حویلی پر اشتہار چسپاں کیا۔ (ناتمام شد)

اُردو مثنوی

محمد طاہر فاروقی

اُردو ادب میں نثر سے پہلے نظم اور اصناف نظم میں سب سے پہلے مثنوی پیدا ہوئی۔ بالکل ابتدائی دور کی مثنویاں نایاب ہیں۔ لیکن تذکروں میں کہیں کہیں اُن کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً پنجاب میں اُردو، اور مضامین عبدالحق میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی بعض مختصر مثنویوں کے نمونے اور تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسی روایات پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان میں الحاقی کلام بھی شامل ہے۔ سب سے طویل مثنوی جس کو یقین کے ساتھ اُردو زبان کی پہلی مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ کدم راؤ اور پدم ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ نظامی نے ۸۶۵ھ تا ۸۶۹ھ کے درمیان لکھی۔ نظامی سلطان احمد شاہ بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ اس کے بعد کے دو اور ممتاز مثنوی گو تھے۔ فیروز اور محمود، ان کی مثنویاں موجود نہیں ہیں لیکن وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری، اور ابن نشاطی نے اپنی مثنوی پھول بن میں ان دونوں کا ادب سے ذکر و اعتراف کیا ہے۔

اسی صدی کے آخر اور دسویں صدی ہجری کے شروع میں دو اور اچھے مثنوی گو شعراء کا تذکرہ ملتا ہے۔ خبرو اور قطبن، قطبن جس نے مثنوی مرگاوتی تصنیف کی۔ عہد جہانگیر میں شمالی ہند میں بھی بعض مثنوی گو ملتے ہیں۔ جیسے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ ان کی بعض مختصر مثنویاں ان کے ملفوظات میں موجود ہیں۔ اسی طرح شیخ عثمان نے اس زمانے میں مثنوی چترا ولی تصنیف کی تھی۔ دسویں صدی میں مثنویوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جو مثنویاں ملتی ہیں۔ اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بمقابلہ دیگر اصناف نظم کے مثنوی زیادہ مقبول ہو رہی تھی۔ علی محمد جیو گام دھنی کی کئی طویل مثنویاں ملتی ہیں۔ جن میں آپ نے صوفیانہ مضامین بیان کئے ہیں۔ میاں خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ اور شاہ میراں جی عشاق کی خوش نامہ بھی صوفیانہ مثنویاں ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری میں مثنوی نے بڑا فروغ حاصل کیا۔ اور اس صدی میں اس وقت تک کی بہترین عشقیہ مثنویاں ملتی ہیں۔ وجہی کی قطب مشتری ۱۰۱۸ھ کی تصنیف ہے۔ اپنی رنگینی اور تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے اس کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ۱۰۳۵ھ میں غواصی نے سیف الملوک اور بدیع الجمال لکھی، یہ قصّہ اس نے الف لیلہ کی کہانیوں سے لیا ہے۔ اور اس کے بیان میں جذبات نگاری خصوصیت سے قابل تعریف ہے۔ ان دونوں سے بڑھ کر مقیمی کی مثنوی چندر بدن و ماہیار ہے۔ جو ۱۰۴۷ھ اور ۱۰۴۸ھ کے درمیان لکھی گئی۔ اس میں حسن انتخاب اور بیانات قابلِ تعریف ہیں۔ مقیمی اپنی اس مثنوی میں غواصی کا احترام سے ذکر کرتا ہے اور بڑا مداح نظر آتا ہے۔ یہ مثنوی فنی اعتبار سے کامیاب ہے۔ البتہ اس میں کمی جزئیات نگاری کی ہے۔ ورنہ یہ بالیقین

سحر البیان کی ٹکر کی ہوتی۔ پھر بھی بے حد مقبول ہوئی۔ بعد کے شعرا نے مقیمی کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ ابن نشاطی پھول بن میں بڑے احترام سے اس کا ذکر کرتا ہے۔ یہ عشقیہ افسانہ سسی پنوں اور ہیر رانجھا کی طرح قومی جہیز بن گیا تھا۔ یہ مثنوی جگہ جگہ گائی جاتی تھی۔ چندر بدن ہندو راجہ کی لڑکی تھی اور ماہیار معمولی حیثیت کا مسلمان لڑکا۔ ماہیار راجکماری پہ عاشق ہو گیا۔ مذہب اور سماج کی وجہ سے اس کے قریب بھی نہ بھٹک سکتا تھا۔ آخر کار فراق میں گھل کے مر گیا۔ جب اس کا جنازہ محل کے قریب سے گذر رہا تھا۔ تو یہ وہیں رک گیا۔ آگے نہ بڑھتا تھا۔ چندر بدن جو اس کی طرف اب تک ملتفت نہ تھی۔ اس سارے واقعہ کو سن کر وہ اتنی زیادہ متاثر ہوئی کہ اس نے غسل کیا، مسلمان ہوئی اور لپٹ کر سو گئی۔ جب بمشکل جنازہ کو لے جا کر قبر میں رکھنے لگے تو دیکھا کہ دونوں لاشے ہم آغوش ہو گئے اور بہزار کوشش بھی جدا نہ ہوئے۔ دو تعویذ قبر پہ لگا دیئے گئے۔ تفصیلات مثنوی نہایت دلچسپ ہیں۔ المیہ ہونے کی وجہ سے تاثر کامل ہے۔

۱۰۱۸ھ میں قطب شاہ نے ایک نعتیہ مثنوی لکھی۔ جو اس کے دیوان میں موجود ہے۔ خدیجہ سلطان قطب شاہ کی بیٹی المعروف بہ "بڑی بیوی" کی فرمائش پر رستمی نے خاور نامہ لکھی۔ اسے پہلی تاریخی مثنوی کہنا چاہیے۔ تیس ہزار شعر کی اس طویل مثنوی میں حضرت علی کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ غواصی کی دوسری مثنوی طوطی نامہ ۱۰۴۹ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں جانوروں کی کہانیاں ہیں۔ بخشی کے طوطی نامے سے ۳۵ کہانیاں اپنے الفاظ میں بیان کی ہیں۔ امین کی مثنوی بہرام و حسن بانو ۱۰۴۴ھ کی تصنیف ہے اور ملک خوشنود نے ۱۰۳۵ھ اور ۱۰۶۷ھ کے درمیان ہشت بہشت لکھی۔ اس میں بھی عشق بہرام کا قصہ ہے۔ شیخ احمد جنیدی نے ۱۰۶۴ھ میں ماہ پیکر اور ابن نشاطی نے ۱۰۴۴ھ میں پھول بن لکھی۔ نصرتی کی گلشن عشق ۱۰۶۸ھ کی تصنیف ہے۔ گلشن عشق کے قصے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانوں کی مثنویوں کا چربا اسی زمانے کی مثنویوں سے لیا گیا تھا۔ گلشن عشق میں جب راجہ کے اولاد نہیں ہوتی۔ تو ایک درویش آتا ہے۔ جس کے دیئے ہوئے پھل کی بدولت کنور منوہر پیدا ہوتا ہے۔ نجومی جنم پترا دیکھ کر بتاتے ہیں کہ ۱۴ سال تک اس کے لیے خطرات ہیں۔ چنانچہ جب وہ ۱۴ سال کا ہو جاتا ہے۔ اور بالاخانہ پہ سو رہا ہوتا ہے تو اسے پریاں اڑا کے لے جاتی ہیں۔ طبعی کی قصہ بہرام و گل اندام ۱۰۸۱ھ اور فائز کی رضوان شاہ و روح افزا ۱۰۱۴ھ کی ہے۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت سے قصہ لے کر غلام علی نے ۱۰۹۷ھ میں اسی نام سے مثنوی لکھی۔ ان سب عشقیہ مثنویوں سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک تو یہ سارے قصے مقامی داستانوں سے لئے گئے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ اس صدی میں عشقیہ مثنوی نے بڑا عروج پایا تھا۔

بارھویں صدی ہجری میں مثنوی کی یہ روایت برقرار رہی لیکن گیارھویں صدی کے درجہ کی مثنویاں نظر نہیں آتیں۔ البتہ اچھی مثنویاں کافی ہیں۔ ۱۱۰۰ھ میں عارف الدین خان عارف نے ملکہ مصر لکھی۔ جس میں بہت سے صوفیانہ مطالب بیان کئے ہیں۔ ذوقی نے وجہی کی سب رس کو ۱۱۰۹ھ میں وصال العاشقین کے نام سے نظم کیا۔ پھر اسی کو ۱۱۱۴ھ میں خواجہ محمود بحری نے گلشن حسن و دل کے نام سے مثنوی کا جامہ پہنایا۔ ۱۱۱۱ھ میں وجدی نے طوطی نامے کے انداز پر پنچھی باچھا لکھی۔ عاجز کی لعل و گوہر ۱۱۵۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ قصہ کا وہی پرانا انداز ہے۔ جس میں بنگال کے شہزادے پر جنات کے بادشاہ کی لڑکی عاشق ہوتی ہے۔ اور اس کا پلنگ اٹھا کر منگواتی ہے۔ خواجہ محمود بحری کی دوسری مثنوی من لگن ہے۔ جو ۱۱۱۲ھ میں لکھی گئی۔ صوفیانہ مثنوی ہے۔ ولی دکنی نے واقعات کربلا کے بیان میں دہ مجلس لکھی۔ ان کی ایک مختصر مثنوی شہر سورت کی تعریف میں بھی ہے۔ سراج دکنی کی بوستان خیال ۱۱۶۰ھ کی تصنیف ہے۔

اس وقت تک ماسوا اِن چھوٹی مثنویوں کے جن کا پہلے ذکر آیا۔ شمالی ہند میں مثنوی پہ کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا۔ اور دکن نے اِس اثنا میں جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ مثنوی کی بہت خاصی خدمت انجام دی تھی۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس زمانے سے جو کہ فورٹ ولیم کالج کی خدمت نثر کا دور ہے۔ دکن کے ساتھ ساتھ شمالی ہند میں بھی مثنوی سے اعتنا کیا گیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اِن ابتدائی چند برسوں کے فوراً بعد وہ زمانہ آجاتا ہے۔ جبکہ اُردو مثنوی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔

شمالی ہند میں میر تقی میر کی چھوٹی مثنویوں کو چھوڑ کر ان کی عشقیہ مثنویاں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ دریائے عشق سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ میر اثر کی مثنویوں میں خواب وخیال صف اوّل کی چیز گنی گئی ہے۔ اور خاص رتبے و شہرت کی مالک ہے۔ معاملات و واردات عشق یہاں جس جزئی تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔ انھوں نے آیندہ مثنویوں کے لیے شمع راہ کا کام دیا ہے۔ ان کے ہم عصر مرزا سودا کو مثنوی سے کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی۔ پھر بھی ان کے کلیات میں چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں مل جاتی ہیں۔ محمد شاہی دور میں شاہ مبارک آبرو نے کئی مثنویاں لکھی تھیں۔ ان کی مثنوی "در موعظۂ آرائش معشوق" کی مصحفی نے بہت تعریف کی ہے۔ مولوی محمد باقر آگاہ نے فائز کی مثنوی رضوان شاہ و روح افزا پہ ایک اور قصے کی بنیاد ڈالی اور گلزار عشق کے نام سے ۱۲۱۱ھ میں ایک مثنوی لکھی۔ گارساں تاسی کہتا ہے کہ حیدر بخش حیدری نے ایک مختصر شاہنامہ لکھا تھا۔ نیز نظامی کی ہفت پیکر کو اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مگر یہ دونوں مثنویاں نایاب ہیں۔ اس زمانے میں دکن میں برابر مثنویاں لکھی جاتی رہیں۔ ان میں زیادہ مشہور ہندوستانی اور ایرانی قصوں کو نظم کیا گیا ہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان مثنویوں کی زبان نسبتاً آسان ہوتی چلی گئی ہے۔ ایسی مثنویاں کافی تعداد میں ہیں۔ گل وصنوبر۔ سنگھاسن بتیسی۔ حاتم طائی۔ چہار درویش۔ اگر وگل۔ بہار دانش۔ کام روپ و کام لتا۔ کلیلہ و دمنہ۔ جنگ امیر حمزہ۔ لیلےٰ مجنوں وغیرہ۔ مصحفی کی بحر المحبت۔ میر کی مثنوی دریائے عشق کا دوسرا قالب ہے۔ جس کا مصحفی نے خود اعتراف کیا ہے۔ اِن مثنویوں کے فوراً بعد مثنوی کا سب سے بڑا شاہکار مثنوی سحر البیان سامنے آتی ہے۔ لیکن میر اثر اور میر تقی میر کی مثنویوں کو ارتقا کے ذیل میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا حالی کہتے ہیں "جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں۔ وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی و بے حیائی کی باتوں سے مبرا ہیں"۔ میر کی مثنویوں میں داخلی رنگ بہتر سے بہتر پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ان کے مزاج سے جس میں تغزل رچا ہوا تھا لگا کھاتا ہے۔ لیکن خارجی باتوں کی ترجمانی ان سے نبھ نہ سکی۔ چنانچہ ان کی مثنوی کی ترتیب مکمل نہیں ہوئی۔ اور قصہ پن کم پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد بھی صفائی سادگی روانی اور ایک خاص قسم کا تسلسل موجود ہے۔ میر کی مثنویوں کی ترتیب تصنیف یہ ہے۔ شعلۂ شوق۔ دریائے عشق۔ افغان پسر اور ہندو معشوقہ کا قصہ۔ معاملات عشق جس میں انھوں نے عشق کے سات معاملے بیان کیے ہیں۔ جوش عشق۔ اعجاز عشق۔ خواب وخیال۔ ان میں سے شعلۂ شوق اور دریائے عشق میں افسانے کی دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی دردناکی پائی جاتی ہے۔

ان میں طویل حکایات نہیں ہیں۔ مگر جذبات کی مصوری بیان کی سادگی اور سوز و درد قابل تعریف ہے۔ لیکن منظر کشی میر صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔ فراق کا مضمون چونکہ ان کے مزاج کے مطابق ہے اس لیے اس میں اثر و درد پایا جاتا ہے۔ اس صفت میں وہ میر اثر سے بہتر اور میر حسن کے پیش رو نظر آتے ہیں۔ داخلی رنگ میں میر حسن کے سوا دوسرے مثنوی گو شعرا میں کوئی ان کے مقابلے میں نہیں لایا جا سکتا۔ جس طرح منظر کشی سے ان کی مثنویاں خالی ہیں۔ اسی طرح نہ ان میں پلاٹ ہے۔ نہ کردار نگاری بس ایک واقعہ کو

سیدھے سادے انداز میں غم و فراق کی چاشنی دے کر بیان کر دیتے ہیں۔ میر کی دوسری مثنویوں میں گھر کا حال تنگ نام جس میں برسات کے سفر کا حال بیان کیا ہے۔ کتخدائی آصف الدولہ۔ شکار نامے کے نام کی دو مثنویاں، ان سب میں ربط و تسلسل حسن بیان اور معاملات کے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ میر کی چھوٹی مثنویاں اس لحاظ سے خاص ذکر کی مستحق ہیں کہ انھوں نے دوسروں سے پہلے ایسی مختصر مثنویاں لکھی تھیں۔ جیسے دنیا۔ جھوٹ۔ ہولی۔ اژدر نامہ۔ تنبیہ الجہال۔ کتے پالنے والے کی ہجو۔ مرغ بازی۔ بوزنا۔ غم نہ داری بز بخر۔ موہنی بلی۔ کتے بلی کی دوستی وغیرہ۔

میر اثر کی مثنوی خواب و خیال ایک عاشقانہ مثنوی ہے۔ جو فن کے لحاظ سے کامل اور اثر کے لحاظ سے مکمل ہے۔ یہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ تصوف کے سوا موسیقی اور ریاضی وغیرہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ متقی پاکباز اور درویش تھے۔ خواجہ میر درد کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ غزل گو ہیں۔ ان کی غزلوں میں سادگی، صفائی، سوز و گداز اور تصوف کے مضامین نظر آتے ہیں۔ اپنی مثنوی میں انھوں نے واردات دل ایسے بیان کی ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ اس مثنوی کی دوسری خصوصیات یہ ہیں۔ سلیس اور روزمرہ زبان۔ محاورات۔ معاملات عشق کی بہترین ترجمانی اور واردات محبت کی عکاسی۔ جہاں اختلاط کا موقع آتا ہے۔ وہاں اس طرح کھل کھیلتے ہیں کہ ان جیسا صوفی اور پاکباز تو کیا۔ کوئی بازاری آدمی بھی بمشکل اتنا عریاں ہو سکتا ہے۔ انھوں نے خود بھی اس عریانی کی معذرت کی ہے۔ یہ ہمارے ادب کا عجیب و غریب تماشا ہے کہ ہمارے اس طرح کے مستند بزرگ ایسی گری ہوئی باتیں تحریر میں لانا جائز سمجھتے ہیں۔ ورنہ اس طرح کے لوگوں کی سیرت اس قدر مستند ہے کہ ان کی جانب اس طرح کی پست باتیں منسوب کرنا بھی جائز نہیں۔ سادگی بیان۔ معاملات و واردات کے اعتبار سے میر اثر کی یہ مثنوی آئندہ مثنویوں کے لیے نمونہ بنی۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ میر اثر نے اس میں اپنی اور خواجہ میر درد کی چھوٹی بحر کی غزلیں بھی شامل کر دی ہیں۔ میر اثر کا ایک اور عجیب و غریب کارنامہ بھی اردو ادب میں یادگار ہے۔ انھوں نے تقریباً ۴۰۰ اشعار میں سراپائے معشوق لکھا ہے۔ اور حد یہ ہے کہ جسم کا کوئی حصہ بیان سے نہیں چھوڑا۔ اور مثنویوں کی عریانی کے مانند یہاں بھی انھوں نے بے اعتدالی کی بڑی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس سراپا میں انھوں نے فارسی تشبیہات کے ساتھ ہندی تشبیہات سے بھی کام لیا ہے جو اس کی خصوصیت گنا گیا ہے۔

میر حسن نے اپنے باپ میر غلام حسین ضاحک کے سوا خواجہ میر درد سے بھی شاعری میں اصلاح لی تھی۔ اور میر ضیاء الدین ضیا اور سودا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ میر تقی میر کے پیرو تھے۔ ان سب کا اعتراف خود انھوں نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ میر حسن کی فارسی کی استعداد کامل تھی۔ لیکن عربی کی علمیت اوسط درجے کی تھی۔ دہلی کی تباہی کے بعد فیض آباد چلے گئے تھے۔ وہاں سے جب آصف الدولہ نے دار الحکومت لکھنؤ منتقل کیا۔ تو یہ بھی وہیں آگئے۔ میر حسن کی تصنیفات یہ ہیں۔ دیوان غزلیات (جو نامکمل ہے) تذکرہ شعرائے اردو۔ اس میں تقریباً ۳۰۰ شعرا کا بیان پایا جاتا ہے۔ گیارہ مثنویاں جن میں خاص یہ ہیں۔ رموز العارفین۔ اس کو سب سے پہلی تصنیف بتلاتے ہیں۔ اس میں حضرت ابراہیم ادہم کی حکایتیں ہیں۔ انداز بیان تمثیلی اور ناصحانہ ہے۔ ہر دس پندرہ شعر کے بعد مشہور صوفی شعرا کے اخلاقی اشعار تضمین کیے ہیں۔ گلزار ارم دوسری اچھی مثنوی ہے۔ جو ۱۱۹۲ھ میں لکھی گئی۔ اس میں دہلی سے لکھنؤ تک کا حال بیان کیا ہے اور اس ذیل میں بعض بے حد دلچسپ تفصیلات آگئی ہیں جیسے بھرت پور اور ڈیگ کا قیام۔ مکھن پور میں شاہ مدار کی چھڑیوں میں جانا۔ میلے کا ذکر۔ فیض آباد اور لکھنؤ کا موازنہ۔ ان کی مثنوی خوان نعمت اس لحاظ سے دلچسپ ہے۔ کہ اس میں انھوں نے مختلف کھانوں کا تذکرہ

گیا ہے۔ اور یہ ایک دوست کو بطور خط کے لکھی گئی ہے۔ مثنوی سحرالبیان ان کی آخری تصنیف ہے۔ جو ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) میں لکھی گئی۔ میر شیر علی افسوس نے دیباچہ لکھا۔ مصحفی اور قتیل نے تاریخیں کہیں۔ میر بہادر علی حسینی نے نثر میں منتقل کر کے نثر بے نظیر اس کا نام رکھا۔

اس مثنوی کی زبان ایسی سلیس اور شستہ ہے کہ محمد حسین کو کہنا پڑا تھا

"کیا اسے سو برس آگے والی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے۔ جو اب ہم تم بول رہے ہیں۔" ان کی زبان میں صفائی اور برجستگی اور محاورات و ضرب الامثال کی بے ساختگی قابل تعریف ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے مناسب اور شیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ فارسی الفاظ اور بندشوں کے ساتھ ہندی روزمرہ کو اس طرح جوڑتے ہیں کہ چستی اور صفائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح غزل کا غنائیہ ہونا اس کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ اسی طرح بیانیہ ہونا مثنوی کا آرٹ سمجھا گیا ہے۔ مگر سحرالبیان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں غنائی اور بیانی محاسن ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اسی سبب سے میر حسن کی محاکات میں جادو بیانی کی صفت نظر آنے لگی ہے۔ میر حسن پر اعتراض کیا گیا ہے کہ انھوں نے عامیانہ بول چال اور محاوروں کو جگہ دی ہے۔ مگر یہ بات تعریف کی ہے اعتراض کی نہیں۔ اس لیے کہ محاکات و مقتضائے حال کا تقاضا یہی تھا۔ جس طبقے کے افراد کا ذکر آتا ہے۔ وہ اسی کی زبان لکھتے ہیں۔ پنڈتوں۔ لونڈی۔ باندیوں اور دوسرے عام طبقات کا جہاں ذکر آتا ہے۔ صرف وہیں ان لوگوں کی زبان میں گفتگو ہوتی ہے۔ میر شیر علی افسوس نے اس کے دیباچے میں بہت صحیح لکھا تھا کہ "مثنوی سحرالبیان اسم با مسمیٰ ہے۔ کیونکہ اس کا ہر شعر اہل ذوق کے دلوں کو لبھانے کے لیے موہنی منتر ہے۔ اور ہر داستان اس کی سحر سامری کا ایک دفتر ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کا اس میں ایک دریا بہا ہے۔" سحرالبیان کا قصہ اپنے اندر کوئی خصوصیت نہیں رکھتا۔

پرانی کہانیوں سے مختلف ٹکڑے لے کر انھوں نے اپنی مثنوی کا تار و پود تیار کیا ہے۔ لیکن پلاٹ کے ارتقا واقعات کے انتخاب۔ منظر کشی اور کردار نگاری میں میر حسن نے اپنے آرٹ کا وہ کمال دکھایا ہے۔ جس نے ایک معمولی سے قصے کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ انشا نے خوب کہا تھا "از حسن تا یاد گذشتہ خدائیش بیامرزد خوب گفتہ است" سارے قصہ میں ایسا فطری ربط و تسلسل ہے۔ اور اس حسن و خوبی سے ادا کیا ہے کہ کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ محاکات و منظر کشی کے علاوہ وہ جزئی تفصیلات بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ نجومی رمال برہمن۔ موسیقی آتش بازی۔ محلات۔ باغ۔ نوکر چاکر۔ خدم و حشم۔ گانے والیاں۔ ناچنے والیاں۔ رقص و سرود ان سب کو جزئی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور ایسی تمام چیزوں کے متعلق اتنی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ کہ پڑھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ میر حسن نے ساری عمر اسی فن یا اسی کوچے میں گذاری ہو گی۔ مولانا حالی نے صحیح کہا ہے "غرض کہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچ دی ہے۔ مسلمانوں کے اخیر دور میں سلاطین و امرا کے یہاں جو جو حالتیں ایسے موقعوں پر گزرتی تھیں اور جو جو معاملات پیش آتے تھے۔ بعینہٖ ان کا چربہ اتار دیا ہے۔ تفصیل اور جزئیات نگاری کی یہی خوبی دوسرے مقامات پر بھی پائی جاتی ہے۔ جادو کے کرشمے فراق و وصال جذبات و واردات مختلف حادثات اور واقعات سب جگہ میر حسن کا یہ آرٹ کامل نظر آتا ہے۔ بیانیہ میں جذبات نگاری اور محاکات میں تجسس اور گہرائی میر حسن پر ختم ہو گئی ہے۔

اپنے ماحول اور زمانے کی عکاسی میں میر حسن اس درجہ مکمل ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص چاہے تو اس مثنوی سے اس دور کے رسم و رواج اور معاشرت و تمدن کی پوری تفصیلات مرتب کر سکتا ہے۔ بچے کی پیدائش یا دوسری ابتدائی رسمیں شادی بیاہ کی

رہن سہن عقائد مختلف پیشے دربار بازار امرا و عوام سے متعلق ہر قسم کی جیتی جاگتی تصویریں اس مثنوی میں مل جاتی ہیں۔ اس مثنوی میں عریانی و فحاشی پر یہ اعتراض کہ "مثنوی نہیں کہی ہے سانڈے کا تیل بیچتے ہیں" بالکل بجا اور درست ہے۔ لیکن ہمدردانہ تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سبھی عشقیہ مثنویاں اس عیب سے داغدار ہیں۔ مثنوی کے عام فن کے ماتحت یہ عیب میرحسن کی مثنوی میں آگیا ہے۔ البتہ یہاں تفصیل کے باعث کچھ زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ گلزار نسیم میں یہی عیب مثنوی کے انتہائی اختصار اور نسیم کی صنعت گری کی بدولت ایسا ڈھکا چھپا ہے کہ ایک طرف تو اس عیب پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اور دوسری طرف نسیم کی صناعی کے لیے بے اختیار منہ سے داد نکل جاتی ہے۔ میرحسن کے لیے تفصیل و محاکات کی خوبیوں کے ہوتے ہوئے اس عیب پر پردہ ڈالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ عذر کہ انھوں نے لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ مثنوی لکھی۔ اور اس سبب سے اُن کے ہاں عیب پیدا ہوگیا۔ غلط ہے۔ ایک تو یہ کہ یہی عیب اس سے پہلے میراثر کی خواب و خیال میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ میرحسن کی مثنوی جذبات کی صداقت و داخلیت میں دبستان دہلی کی نمائندہ مانی گئی ہے۔ پھر اس عیب کو لکھنوی ماحول کے ساتھ چپکانا کیوں جائز ہوسکتا ہے۔ یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ چونکہ وہ ماحول اس قسم کے عریاں اور فحش مطالب کو ناپسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے میرحسن کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ عریاں اور فحش مضامین کو پردے میں چھپائے رکھیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ پرانی کہانیاں اس مثنوی کا ماخذ ہیں۔ اِدھر اُدھر سے مختلف ٹکڑے لے کر میرحسن نے ایک قصہ جوڑ لیا ہے۔ معاملات عشق کی ترجمانی کی حد تک کہنا پڑتا ہے کہ میر کی مثنویاں اور میراثر کی مثنوی ان کے پیش نظر تھی۔ اس لیے انھوں نے ان سے اثر قبول کیا تھا۔ اسی طرح میرحسن کے سامنے فضائل علی خاں بے ذید کی مثنوی تو ان کرم تھی۔ اُس کی تقلید کا اشارہ ایک طرح سے خود میرحسن کی زبان سے سمجھا جاسکتا ہے۔ بے ذید کی بابت لکھتے ہیں "مثنوی او بسیار مشہور است۔ در آں مقدمہ حسب حال خود گفتہ۔ و لے دُرہائے معانی در و سفتہ" بے ذید کی یہ مثنوی میرحسن کے لیے محرک ہوئی ہو تو بھی ممکن ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنی مثنوی کے لیے بحر بھی وہی اختیار کی ہے۔ جو بے ذید نے اپنی مثنوی کے لیے پسند کی تھی۔ سحرالبیان میرحسن کی آخری مثنوی ہے۔ دوسروں سے انھوں نے جو اثرات قبول کئے ہوں گے۔ ان کو ہم صرف قیاس کے طور پر کہہ سکتے ہیں۔ البتہ بعض وہ تفصیلات جو ان کی اپنی مثنویوں میں آچکی ہیں یا جن سے خود اُن کو کسی نہ کسی طرح کا واسطہ پڑا تھا۔ یہ سب کچھ انھوں نے سحرالبیان میں اپنے کمال فن کی آرائش کے لیے استعمال کیا ہے۔ مثلاً گلزار ارم میں میرحسن نے خود اپنے معاشقے کا حال بیان کیا ہے۔ اپنی ایک مثنوی میں انھوں نے آصف الدولہ کی شادی کا حال پوری تفصیلات کے ساتھ لکھا ہے۔ جواہر علی خاں خواجہ سرا کے محل قصر جواہر کا حال الگ مثنوی میں بڑی تفصیلات کے ساتھ لکھا ہے۔ میرحسن نے اپنے مکان کی ہجو بھی لکھی ہے۔ گلزار ارم میں لکھنؤ کے بعض اُجاڑ اور ویران مقامات کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح ان کو اپنے مربی نواب سردار جنگ کے یہاں اندر جانے اور بیگمات و خواصوں سے رو در رو دیکھنے ملنے اور بولنے کا موقع ملا تھا۔ یہ تمام تفصیلات جو ان کی نظروں کے سامنے آئیں یا جو انھوں نے ان مثنویوں میں پہلے بیان کیں۔ سحرالبیان لکھتے وقت ان کے فن کو مکمل کرنے میں یقیناً ان کی مددگار ثابت ہوئیں۔ اور اسی کی بدولت ان کی مثنوی اردو ادب کا شاہکار بن گئی۔ مولانا حالی کا یہ قول جس طرح اُن کے زمانے میں درست تھا۔ آج بھی صحیح ہے "میرحسن دہلوی کی مثنوی نے ہندوستان میں جو سچی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ وہ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد آج تک کسی مثنوی کو نصیب ہوئی"

میر اثر اور میر حسن کی مثنویوں کے مقبول عام ہونے نیز بعض دوسرے اثرات کے ماتحت اب شمالی ہند میں بھی مثنوی کی طرف عام توجہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ سبھی شعراء نے کم و بیش مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں سے صرف خاص چیزوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔ مومن کی مثنویاں فنی طور پر ناقص ہیں۔ بس ان کی صرف یہ خصوصیت قابل لحاظ ہے۔ کہ ان میں معاملات عشق کی ترجمانی بہتر سے بہتر کی گئی ہے۔ اس زمانے میں نسیم نے اپنی مثنوی کے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ اور اُردو کی دوسری بہترین مثنوی پیش کی۔

مثنوی گلزار نسیم خصوصیات مثنوی سے عاری ہوتے ہوئے بھی مثنوی کا شاہکار ہے۔ اور اسے بجا طور پر سحر البیان کے بعد اُردو کی بہترین مثنوی کہا جاتا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی آتش کے شاگرد تھے۔ اور شاہی فوج میں وکیل تھے۔ لکھنؤ کے کشمیری خاندان معاشرت کے اعتبار سے بالکل مسلمان گھرانوں کے مانند ہوتے تھے۔ اور ان کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی۔ نسیم کی غزل میں آتش کی صفائی اور داخلیت پائی جاتی ہے۔ لیکن لکھنؤ کے اثر سے تصنع رعایات لفظی اور آورد بھی ہے۔ پھر بھی اُن کی غزلوں میں سے جو گلزار نسیم میں آئی ہیں۔ وہ تو سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ جب نسیم نے یہ مثنوی لکھ کر اُستاد کے سامنے پیش کی۔ تو عام رواج کے ماتحت ایک طویل مثنوی کی شکل میں تھی۔ آتش کا یہ مشورہ مشہور ہے۔ کہ یہاں بھی تم اپنا دہ کی کا قانون کیوں نہیں چلاتے۔ اس کے بعد انھوں نے مثنوی کو مختصر کرنے کے لیے نظر ثانی کی۔ تو اسے کچھ سے کچھ کر دیا۔

یہ مثنوی ۱۲۵۴ھ میں لکھی گئی۔ اس کا قصہ معمولی ہے۔ جو پہلے سے نثر میں موجود تھا۔ البتہ نسیم نے جا بجا اصل سے انحراف کیا ہے۔ ان کے زمانے تک جو افسانوی ادب معروف و مقبول تھا۔ اس میں ایک کتاب مذہب عشق بھی تھی۔ اسی کے افسانے کو لے کر اور حسب منشا ترمیم و اختصار کر کے نسیم نے یہ مثنوی تصنیف کی ہے۔

اصل سے انحراف کی بعض مثالیں یہ ہیں :-

(۱) مذہب عشق میں بسوا کا نام لکھا ہے۔ نسیم نے اپنی مثنوی میں دلبر رکھا ہے۔

(۲) مذہب عشق میں لکھا ہے بسوا اسے پو سر میں جیتنے کا واقعہ سفر سے واپسی میں پیش آتا ہے۔ نسیم نے دلبر بسوا سے اس مقابلے میں جیتنے کا تذکرہ سفر کے لیے جاتے ہوئے بیان کیا ہے۔

(۳) مذہب عشق میں بکاؤلی سے شادی ہونے پر قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ نسیم نے اس کے آگے بھی ایک دوسرا قصہ چلایا ہے۔

گلزار نسیم کا اصل اعجاز ایجاز و اختصار ہے۔ اگر ایک مصرع بھی نکال دیا جائے تو تسلسل باقی نہیں رہتا۔ اس اختصار کے باعث منظر نگاری جزئیات نگاری معاشرت کی عکاسی ماحول کی ترجمانی اور جذبات کی مصوری نظر نہیں آتی۔ قدرتی طور پر ان اوصاف میں سحر البیان کو اس پر برتری حاصل ہے۔ رعایات لفظی صنائع و بدائع اور استعارات و تشبیہات کا یہاں بے مثل ذخیرہ ملتا ہے۔ اور کمال بیان یہ ہے کہ اس کے بعد بھی ایسا تسلسل اور روانی موجود ہے۔ کہ اس کے کتنے شعر اور مصرعے اردو میں بطور ضرب المثل رواج پا گئے ہیں بلکہ اس بات میں یہ سحر البیان سے آگے ہے۔ واقعات محاکات اور جذبات کی مصوری میں نسیم نے جس آرٹ کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا حسن اختصار میں ہے۔ جو بات کئی جملوں اور کئی شعروں میں کہی جانی چاہیئے۔ اسے وہ ایک شعر یا ایک مصرع میں کہہ دیتے ہیں۔ اور لطافت و متانت، روانی و برجستگی میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ استعاروں میں باتیں کرنے اور الفاظ کا طلسم بنانے کے سبب سے

نیز ایجاز و اختصار کے باعث ایسے مواقع جہاں عریانی آتی ہے۔ لازمی طور پہ خواندنی اور قابل قبول بن گئے ہیں۔ مثنوی میں بعض ایسے بھی مواقع آئے ہیں جہاں نسیم نے کچھ تفصیل سے کام لیا ہے۔ جیسے بکاؤلی کا ماتم یا شادی کا اہتمام وغیرہ۔ ان مقامات پہ رعایات لفظی اور استعارات و تمثیلات کے باعث فطری محاکات و منظر کشی کے بجائے ادبی مرقع نگاری نظر آتی ہے۔ یہی چیز گلزار نسیم کا حسن ہے۔ اور اسی کو لوگوں نے مورد الزام قرار دیا ہے۔

گلزار نسیم پہ بہت سے اعتراضات ہیں۔ جن میں سے بعض درست بھی ہیں۔ ان کا فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے یہ عذر پیش کرنا بہتر ہے۔ کہ ایجاز کا جو اعجاز نسیم کے پیش نظر تھا۔ اس کے باعث یہ باتیں پیدا ہو جانی لازم تھیں۔ نسیم یوں تو ایک قصہ لکھ رہے تھے۔ جو ہیئت میں ایک مثنوی تھا۔ لیکن فی الحقیقت وہ ایک ادبی شہ پارہ تیار کر رہے تھے اور اس لحاظ سے ان کی کوشش کو پرکھنا چاہیئے۔ اعتراضات کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اشعار کا مطلب ناقابل فہم ہے۔

(۲) ضروری الفاظ چھوڑ دینے سے گنجلک اور اغلاق پیدا ہو گیا ہے۔

(۳) بعض جگہ الفاظ کی حرکت یا معنی یا تذکیر و تانیث غلط ہے۔

(۴) رعایت لفظی عیب بن گئی ہے۔

(۵) جا بجا قسم قسم کی شتر گربگی نظر آتی ہے۔

(۶) محاورے کی غلطیاں ہیں۔

سچ یہ ہے کہ ایسے تمام اعتراضات نہ تو اتنے وزنی ہیں۔ اور نہ اس قدر صحیح جتنے کہ سمجھے گئے ہیں۔ اس لئے کہ نسیم کے استعمال کے لیے سندیں بھی مل جاتی ہیں۔ تفصیل دیکھنی ہو تو معرکۂ چکبست و شرر کا مطالعہ کیجیئے۔

جہاں ہمیں اصرار ہے کہ نسیم کے یہاں غلطی والے عیوب نہیں ہیں۔ وہاں یہ بھی اعتراف کرنا ضروری ہے کہ ایجاز و اختصار کے باعث کہیں گنجلک اور اغلاق پیدا ہو گیا ہے۔ اور کہیں مطلب مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ بعض اور اعتراضات بھی جزئی طور پہ تسلیم ہیں۔ مگر یہ بات پھر بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ کہ ایجاز میں عام طور پہ اعجاز کا وہ نمونہ پیش کیا ہے۔ جو بے مثال ہے۔ نسیم کی نازک خیالیاں، استعارات تصنع و تکلف کی بہتات نزاکت اور نکتہ آفرینی بادی النظر میں رکاوٹ بنتی ہے لیکن مثنوی کی سلاست و سادگی اور روانی و ترنم کا احساس ہمیں اس کے طلسم میں سب طرح جکڑ دیتا ہے۔ اور اسی کا نام بلاغت و جزالت کلام ہے۔ حمد، نعت اور منقبت جیسا مضمون جس کے لیے زیادہ اشعار کی ضرورت لازمی ہے۔ نسیم نے صرف چار شعروں میں سمو دیا ہے۔ اسی طرح مکالمات ہیں کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے۔ اور بلاغت کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ بکاؤلی کا پھول کی چوری پہ ماتم یا بکاؤلی کا جدائی میں تڑپنا اس طرح کے مضامین اشاروں اور کنایوں کے پردے میں جس طرح سے نسیم نے ادا کئے ہیں۔ ان میں ایسی بلاغت و تاثیر ہے۔ کہ جزئی تفصیلات کے نہ ہوتے ہوئے بھی مجموعی اثر بہت بہتر مرتب ہوتا ہے۔ غرض کہ ایجاز و اختصار اور مرصع سازی کی بدولت نسیم نے جادو کا گورکھ دھندا تیار کیا ہے۔ جس کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ آسان کو مشکل بنا دینا اور تکلفات کا جال بننا اس زمانے کا خاص فن تھا۔ نسیم میں طبعی طور پہ ذہانت جدت اور دقت پسندی تھی۔ انھوں نے زمانے کے میلان کو اپنی ذہانت سے ایک نیا روپ دیا۔

تو یہ شہ پارہ وجود میں آیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ "شعر و شاعری کے جن پہلوؤں کے اعتبار سے لکھنؤ بدنام ہے۔ گلزار نسیم نے انہی پہلوؤں سے لکھنؤ کا نام اونچا کیا ہے۔ کہ گلزار نسیم کے بھی سحر البیان ہونے میں شک نہیں۔ زبان کو شاعری اور شاعری کو زبان بنا دینا کوئی معمولی کام نہیں"

پہلے ذکر آیا ہے کہ گلزار نسیم کی کہانی پہلے سے مشہور معروف تھی۔ اور نثر میں مذہب عشق میں بیان کی جا چکی تھی۔ اس کہانی کا وجود ہندو دیو مالا میں پایا جاتا ہے۔ لوگ اس کو ایک فرضی قصہ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ حقیقی واقعہ گردانتے تھے۔ سنسکرت کی کتابوں میں جس طرح یہ قصہ آیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ سورج بنسی خاندان میں رام چندر جی سے بہت پہلے راجہ کرن جو شی اجودھیا میں راج کرتا تھا۔ شانتر جوگ اور میکل جوگ اس کے دو بیٹے تھے۔ مرتے وقت راجہ نے آدھی آدھی سلطنت دونوں میں تقسیم کر دی۔ بڑے کو سرسبز اور آباد علاقہ دیا۔ اور چھوٹے کو ویران اور اُجاڑ۔ میکل جوگ نے برا تو مانا۔ مگر بیوی کے مشورے پر راجہ سے اس کے وزیر کنڈا اکھڑک کو مانگ لیا۔ اور اپنے علاقے میں چلا گیا۔ کنڈا اکھڑک وزیر اپنی دانشمندی کے لیے مشہور تھا۔ اس نے اس علاقے میں پہنچ کر اپنی طلسماتی طاقتوں کی مدد سے ایک وسیع و عریض دلدل میں جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میکل جوگ کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اور وہاں سے آنے جانے کے لیے اپنے علم کے زور سے راجہ کے لیے ایک اڑن کھٹولا ایجاد کیا۔ جو بچہ سر کے بل پیدا ہونے کے بجائے پاؤں کے بل پیدا ہوتا ہے۔ اسے نربدال کہتے ہیں۔ راجہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ تو اس مناسبت سے اس کا نام نربدال رکھا گیا۔ انہی دنوں وزیر کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام تمالہ تھا۔ یہ دونوں بلا کی حسین تھیں۔ ان کی خدمت کے لیے جو نائن کی لڑکی ان کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ بھی بہت حسین تھی۔ اس کا نام چھیلا تھا۔ ایک روز تینوں کھیلتی ہوئی رانی کے پاس پہنچیں۔ تو رانی نے پیار میں ان کو بکاؤلی کہہ کر خطاب کیا۔ یعنی "لکھوں کا جھنڈ" اس وقت سے شہزادی نربدال کو بکاؤلی کہنے لگے۔

بکاؤلی کے حسن کی دور دور شہرت تھی۔ بہت سے راجے اور شہزادے اس کے طلبگار ہوئے۔ ایک نوجوان راجہ راج پاٹ چھوڑ جوگ لے کر کسی نہ کسی طرح قلعہ میں پہنچ گیا۔ بکاؤلی کو یہاں دیکھا تو نادیدہ عشق اور بھی پختہ ہو گیا۔ وہیں دھونی رما بیٹھا۔ جوگیا نہ نام شدھ بھدرا تھا۔ بکاؤلی کو پھول بہت پسند تھے۔ چنانچہ دور دور کے ملکوں سے اچھے سے اچھے پھول لے کر اس کے باغ میں لگائے اور اجازت چاہی کہ اس پھلواڑی میں ایک ایسا پھول لگاؤں۔ جو لوگوں کی آنکھوں کو روشن کرتا رہے۔ چنانچہ بکاؤلی کی اجازت سے ایک ایسا پھول لگایا جس نے خوش رنگی اور خوشبوئی میں تمام پھولوں کو مات کر دیا۔ بکاؤلی نے خوش ہو کر جوگی سے کہا کہ اس کے بدلے جو چاہے مانگے۔ جوگی نے بے تکلف اس سے اُسی کو مانگا۔ بکاؤلی حیران تو ہوئی۔ مگر اس نے جان لیا کہ یہ ضرور کوئی عالی خاندان شخص ہے جس نے ایسی درخواست کی ہے۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئی۔ جوگی نے کہا۔ اچھا تو بات پکی ہے۔ جب وہ جوان ہوئی۔ تو اس کے باپ نے ایک بڑے راجہ سے اس کی شادی طے کر دی۔ بارات آئی۔ اور دھوم دھڑکے کی آوازیں جوگی تک بھی پہنچیں تو اس نے نائن کی لڑکی چھیلا سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہنگامہ ہے۔ اُس نے ساری تفصیل بتا دی۔ جوگی کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے (سراپ) بددعا دی کہ وعدہ خلافی کے جرم میں بکاؤلی پانی ہو کر بہہ جائے۔ یہی بددعا اُس نے اپنے اور چھیلا کے لیے کی۔ چنانچہ اسی وقت اس جھیل میں سے نربدال، بھدرا اور چھیلا تین دریا جاری ہو گئے۔ نربدال کا نام گھِس کے نربدا بن گیا۔ اور چھیلا بول چال میں بدل کر جھیل ہو گیا۔ چنانچہ یہ تینوں دریا آج بھی بدستور موجود ہیں۔ نربدا دریا کا بہاؤ اور سب دریاؤں کے برخلاف

دوسری طرف ہے اور اسی لیے اس کو نربدال یعنی پائل سے مناسبت ہے۔

سنٹرل انڈیا یعنی مدھیا بھارت کی ریاست ریوا میں ایک بہت بڑی جھیل امرکنٹک ہے جہاں سے یہ تینوں دریا نکلتے ہیں۔ اس جھیل کے بیچوں بیچ ایک قلعہ تھا جو بکاؤلی کا قلعہ کہلاتا تھا۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک قلعہ تھا جو بہالہ کی گڑھی کے نام سے مشہور تھا۔ اس جھیل میں بارہ بارہ کوس تک ایک خطرناک دلدل پائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے قلعہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ جس پھول کو ہم گل بکاؤلی کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کا نام بلدوبے اور ایک قسم کا پہاڑی پودا ہے۔ اس کے پتے ہلدی کے پتوں جیسے اور عقیق البحر سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس پودے کا پھول آنکھ کی بہت سی بیماریوں کی دوا ہے۔

یہ ساری باتیں ریاست ریوا کے پرانے لوگ اب سے بیس پچیس برس پہلے تک جانتے اور بتاتے تھے۔ جس طرح گل بکاؤلی کا وجود دیومالا میں ہے۔ اسی طرح لکھا بیسوا بھی پرانے قصوں میں پائی جاتی ہے جس کی صفت یہ تھی کہ وہ چوسر کے کھیل میں گاہکوں کو جیت لیا کرتی تھی۔ امرکنٹک جھیل سے ۲ میل کے فاصلے پر کچھ کھنڈر تھے۔ جسے لوگ ثریا کا محل کہتے تھے۔ ممکن ہے یہی لکھا کا محل ہو۔ اس تفصیل سے یہ اندازہ مشکل نہیں ہے کہ گلزار نسیم کی کہانی دوسری عام کہانیوں کے برعکس مقامی روایات کا ایک بہتر عکس نظر آتی ہے۔

اس دور میں بے شمار مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر قابلِ ذکر حسب ذیل ہیں۔ آفتاب الدولہ قلق کی مثنوی طلسم الفت جو زبان اور بیان کی خوبیوں کے علاوہ واردات عشق کے لیے مشہور رہے۔ نواب مرزا شوق کی تین مثنویوں نے شہرت پائی۔ منیر شکوہ آبادی کی معراج المضامین اور تسلیم لکھنوی کی نالہ تسلیم بھی اچھی مثنویاں ہیں۔ لیکن اس آخری زمانے میں احمد علی شوق قدوائی کی مثنوی ترانہ شوق خاص توجہ کے لائق ہے۔ ان ہی دنوں محسن کاکوروی نے نعتیہ مثنویاں تصنیف کیں۔ جو جزالت و بلاغت میں بے مثال ہیں۔ اب تک نئے دور کے میلانات اپنا رنگ جما چکے تھے اور جدید شاعری کے اثر سے عشقیہ اور داستانی رنگ کی مثنویوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ آزاد اور حالی نے جس نئی شاعری کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس نے مثنوی کو دوسری راہ دکھائی۔ ہم صرف ان مثنویوں کو لیں گے جو قدیم روش پر لکھی گئیں۔

طلسم الفت۔ لکھنوی معاشرے کا صحیح چربا اور سچی ترجمان ہے۔ اسی سبب اس کو قبول عام حاصل ہوا۔ اس میں سحر البیان کی تفصیل اور گلزار نسیم کا تکلف اور رعایت لفظی پائے جاتے ہیں۔ اس میں تقریباً سات ہزار اشعار ہیں۔ اس تفصیل کی وجہ سے اکثر مقامات غیر معتدل بھدے اور معیوب ہو گئے ہیں۔ نسیم کا رنگ ایجاز و اختصار کے ساتھ تو گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن تفصیل کی صورت میں اس کا بدنما بن جانا ناگزیر امر ہے۔

منیر شکوہ آبادی کی کل دو مثنویاں ہیں۔ حجاب زناں جس کا موضوع پردہ ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ قابل توجہ ہے۔ لیکن ان کا کمال معراج المضامین میں نظر آتا ہے جس میں رسول اکرمؐ کے معجزے اور ائمہ معصومین کی کرامتیں بیان کی ہیں۔ منیر ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے ہاں تمام اصناف سخن پائے جاتے ہیں۔ اس آخری دور میں انہوں نے بہترین قصیدے لکھے ہیں۔ چنانچہ یہی بلند خیالی، نکتہ آرائی، علمیت اور زور بیان اس مثنوی میں بھی نظر آتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ الفاظ کا دروبست، بندش کی چستی، روزمرہ و محاورہ اور سلاست و روانی لائق صد ستائش ہے۔

نواب مرزا شوق کی طرف پانچ مثنویاں منسوب ہیں۔ زہر عشق۔ بہار عشق۔ فریب عشق۔ لذت عشق۔ خجر عشق۔ زمانہ حال کے محققین نے ثابت کیا ہے کہ آخری دو مثنویاں ان کی نہیں ہیں۔ فریب عشق پر بھی اکثر محققوں کو شبہ ہے۔ رہیں زہر عشق اور بہار عشق تو یہ یقیناً شوق کی تصنیف ہیں۔ زہر عشق ان کا شاہکار گنی جاتی ہے۔ احسن لکھنوی جو شوق کے نواسے تھے۔ اس واقعہ کو سچا بتاتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے یہ واقعہ اپنے بچپن میں خود اپنی نانی سے سنا تھا۔ مگر شوق نے یہ کہا ہے کہ اپنے سامنے مرزا عباس کا نام ہٹا کر جن پر یہ واقعہ گذرا تھا۔ اپنے آپ کو سامنے کرایا ہے۔ شوق کی مثنویاں اور خصوصاً زہر عشق زبان بیان گھلاوٹ صفائی روزمرہ بندش کی چستی بے ساختگی اور برجستگی اور محاورات کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ اس میں منظر کشی اور محاکات نہیں ہیں۔ مگر معاملات عشق اور مکالمات حد درجہ فطری ہیں اور اسی وجہ سے عریانی و فحاشی کے باوجود لوگ اس کی عزت کرتے چلے آئے ہیں۔ ثقہ لوگ جو اس کے پڑھنے سے دوسروں کو روکتے تھے۔ انھیں بھی اس کے بکثرت شعر یاد تھے۔ شوق نے میر اثر کی مثنوی خواب و خیال سے پورا پورا اثر قبول کیا ہے۔ سب سے پہلے حالی نے اس بات کی طرف توجہ دلائی۔ اثر کی مثنوی اپنے مخصوص مضامین کی وجہ سے سب جگہ اور بالخصوص لکھنؤ کے اس ماحول میں بے حد مقبول تھی۔ بہار عشق کے اشعار سے مقابلہ کیا جائے تو اختلاط کے موقع پر میر اثر کا پورا پورا چربا نظر آتا ہے۔ بلکہ شعر کے شعر کا مضمون بعض جگہ وہی ہے۔

احمد علی شوق قدوائی کی ترانۂ شوق پرانے قصوں کی ڈگر پر ہے۔ اس کی کہانی میں کوئی جدت و ندرت نہیں۔ لیکن زبان و بیان اور بلاغت کے اعتبار سے یہ اپنی وضع کی واحد چیز ہے۔ اس میں نہ تو سحر البیان والی تفصیل ہے اور نہ گلزار نسیم والا اختصار۔ یہ دونوں کے بین بین ہے۔ استعارات، تمثیلات کی بات اور ایہام و صنائع گلزار نسیم جیسے پائے جاتے ہیں۔ مگر اتنی مختصر ہونے کے سبب سے سلاست و روانی بے ساختگی اور بیان کی خوبیاں اس میں زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس بات نے اس کو بلاغت کلام کا نادر اور حسین نمونہ بنا دیا ہے۔ گلزار نسیم بہت زیادہ اختصار کے سبب سے مختلف اعتراضوں کا نشانہ بنی۔ طلسم الفت میں تصنع و تکلف اس کی طوالت کے باعث عیب بن گیا۔ لحاظ اختصار و طوالت کے ترانہ شوق ان دونوں کے درمیان ہے اور خوبی یہ ہے کہ زبان روزمرہ محاورہ بندش اور تراکیب وغیرہ میں کوئی غلطی نہیں۔ اور محاسن کلام زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ لہذا اس رنگ میں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے اور زیادہ سے زیادہ التفات کے لائق ہے۔

اردو کے نعت گو شعراء میں منیر شکوہ آبادی۔ کرامت علی شہیدی۔ امیر مینائی اور مولوی غلام امام شہید نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن محسن کاکوروی کے نعتیہ کلام نے سب اگلے پچھلے نعت گو شعراء کو ماند کر دیا ہے۔ ان کو خود اپنی نعت گوئی پر ناز تھا۔ فرماتے ہیں ؎

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زبان کے لیے ۔۔۔ زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیان کے لیے
ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن ۔۔۔ کلام نعتیہ رکھا مری زبان کے لیے

محسن حُبِ رسولؐ میں ایسے ڈوبے تھے کہ ان کی غزلوں میں بھی نعتیہ شعر آجاتے تھے۔ اور نعتیہ قصائد مسدس مخمس اور مثنویاں تو مستقل ادبی شہ پارے ہیں۔ کسی نے سچ کہا تھا۔ محسن اُردو کے حامی تھے۔ احسن اللہ خان ثاقب نے مکتوبات امیر کے مقدمے میں لکھا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ منشی امیر احمد امیر مینائی سے محسن کی سخن آفرینی اور بلاغت کمال کا تذکرہ کیا تھا۔ فرمایا کہ " ان کا کلام ایک عالم

ہے خیالات نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہوتا ہے اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے۔" محسن کے کلیات میں تین بڑی اور دو چھوٹی مثنویاں ہیں (۱) صبح تجلی۔ ۲۷۹ ام ۱۸۶ اشعر (۲) فغان محسن (۴۲ شعر) ۲۷۹ ام (۳) نگارستان الفت (۵۲ شعر) ۱۲۹۲ ام (۴) چراغ کعبہ (۴۶۷ شعر) ۱۳۰۱ ام (۵) شفاعت و نجات (۳۹۶ شعر)۔

ان کے دوسرے نعتیہ کلام کی طرح ان کی مثنویوں میں بھی بلاغت کلام اور معنی آفرینی اپنی انتہا پر نظر آتی ہے۔ رعایت لفظی سے مناسب کام لیا ہے۔ تلمیحات میں علمی رنگ بلند پردازی الفاظ کا دروبست بندش کی چستی۔ استعارات کی رنگینی ایہام و کنایہ اور شان و شکوہ بہتر سے بہتر ہے۔ بلاغت و جزالت کی ایسی مثالیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ ایسے علمی رنگ و دقیق مطالب کے ہوتے ہوئے ان کے کلام میں جو سلاست و روانی جو برجستگی و بے ساختگی ہے۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور امیر مینائی کے قول کی تائید کرنی پڑتی ہے۔ محسن کی مثنویوں کے عام نہ ہونے کا سبب ان کا گہرا علمی رنگ ہے۔ جس نے انہیں عام لوگوں کے لیے مشکل بنا دیا ہے جو سمجھتے ہیں۔ وہ ان کو ادبی شہ پارہ سمجھتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کی ہر نظم شہر شہر بطور تحفہ لے جائی جاتی تھی اور اہل فن اسے سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ ان کی نعت گوئی محض اظہار عقیدت اور بیان جذبات کے لیے ہے۔ اسی لیے ادبی محفلوں میں حیرت و مسرت کے ساتھ پسند کی جاتی ہے۔ چراغ کعبہ معراج شریف کے بیان میں ہے۔ چند شعر دیکھیے جن میں محسن کا کمال نظر آتا ہے۔

پیش نظر جناب عالی — بیت المقدس کا باب عالی
وہ سرور انبیائے پیشیں — وہ باعث فخر شرع و آئیں
منبر کے قریب آ کے اترا — آداب سے سر جھکا کے اترا
اک ہاتف غیب واں خبر دہ — اسریٰ سبحانہ، بہ عبدہ
ہر شے تھی وہاں کی حیرت افزا — اللہ کے گھر میں تھی کمی کیا
ظلمت کے غبار سے نمایاں — گرد رہ لشکر سلیماں
شام لب بام سے ہویدا — جاں بخشی حضرت مسیحا

اسی طرح تمام مثنویاں علمی تلمیحات۔ قرآنی آیات۔ رنگین استعارات۔ رعایات لفظی۔ صنائع و بدائع اور نازک بیانیوں سے گرانبار ہیں۔ دوسری طرف ان میں حسن ادا کا بانکپن روزمرہ و محاورہ موسیقی و سلاست سادگی و روانی پائی جاتی ہے۔ محسن کی نازک خیالی اور مضمون آفرینی نے گلستان نعت میں عجیب گلکاریاں کی ہیں۔ مگر ان کا بڑا کمال موزوں اور مناسب الفاظ کا انتخاب ہے۔ وقار و متانت، حفظ مراتب، شان و شوکت، لطافت و نفاست، سادگی و سلاست، جذبات و عقیدت کا ایسا امتزاج یقیناً اعجاز کلام ہے۔ صبح تجلی رسول پاک کی ولادت پاک کے بیان میں ہے۔ یوں شروع کرتے ہیں:۔

بیضاوی صبح کا بیاں ہے — تفسیر کتاب آسماں ہے
ہے خاتمۂ شب دل افروز — دیباچہ نگار نسخۂ روز
آثار سحر ہوئے نمایاں — سیپارہ لیے ہوئے ہے دوراں

واللیل کو ختم کر چکا ہے   آمادۂ دورِ والضحیٰ ہے
عنوانِ فلک ہے درِ منثور   لوحِ زرّین سورۂ نور
اطرافِ بیاضِ مطلعِ صاف   والفجر کے حاشیے پہ کشّاف

غرض اسی طرح علمی اور مذہبی استعارات و تلمیحات سے جن میں معنویت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے مثنوی پھیل جاتی ہے۔ صبح ہونے کو ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

ہنگامِ سپیدۂ سحر گاہ   ساعات میں روز و شب کی واللہ
اک مخبرِ صادق البیان ہے   پیغمبرِ آخر الزماں ہے
کیفیتِ وحی میں ہے بلبل   ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گل
سبزہ ہے کنارِ آبِ جو پر   یا خضر ہے مستعد وضو پر
نوبت ہے صدائے قمریاں کی   تیاری ہے باغ میں اذاں کی
محوِ تکبیر فاختہ ہے   قد قامتِ سروِ دلربا ہے
اک شاخ رکوع میں رُکی ہے   اور دوسری سجدے میں جھکی ہے
سوسن کی زباں پہ مناجات   جاری لبِ جو سے التحیات
تسبیحِ شگوفہ یا مصوّر   تحریمۂ تاک ربِّ اغفر

غرض محسن اپنی مثنویوں کی منظر کشی اور بیانات میں بھی رعایاتِ لفظی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور علمی استعارے تلمیحات کی دلکشی رنگینی اور آیات و احادیث و روایات سے ایک ایسی مقدس فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے دل مست ہو جائے اور روح وجد کرنے لگے۔ اور یہی ان کے فن کا کمال ہے۔

عشقیہ مثنویاں اور روایتی قصے عصرِ حاضر کے مزاج کے لیے سازگار نہ تھے۔ اس لیے اس صدی میں ان کا ترک ہو جانا قدرتی امر تھا۔ نعت و منقبت میں اظہارِ عقیدت کے لیے دوسری قسم کی نظمیں مثنوی سے زیادہ شعراء کے لیے جاذبِ توجہ تھیں۔ اس لیے ہمارے دور میں نہ ایک کی گنجائش رہی نہ دوسری کی ضرورت۔ البتہ قومی اور ملی جذبات کی سیری کے لیے تاریخی مثنویوں کی طرف کم و بیش توجہ رہی۔ چنانچہ جنگ نامۂ اسلام اور بعض ایسی دوسری اچھی تاریخی مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر اس عہد کا سب سے بڑا کارنامہ حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام ہے۔ جسے اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب سے مصنف کا شاہکار سمجھنا چاہیئے۔

تنقیدی جانب داری کے اسباب اور اثرات

رشید حسن خاں

تنقید ایک آئینہ ہے، جس میں اُن محرکات، اثرات، اور کیفیات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جن کو ہر صاحبِ ذوق محسوس نہیں کر سکتا، یا بیان نہیں کر سکتا۔ غور و فکر اور تجزیہ و تحلیل کے بعد، اس طرح رائے قائم کرنا، کہ حق دوست و رشکِ دشمن کی ہلکی سی لہر بھی نہ آنے پائے۔ اس راہ دشوار کی پہلی منزل ہے۔ مذاقِ سلیم اور علم و بصیرت کے ساتھ ساتھ، صداقت اور ظرف، دو ایسے بنیادی عناصر ہیں، جن کے بغیر تنقیدی تخلیقات، معیار، ہمہ گیری، سچائی، اور تاثیر سے محروم رہتی ہیں۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ نقاد کا ذہن صداقت کے اُس نور سے ہمہ وقت منور رہے، جس کے فیض سے دار و رسن کے سامنے بھی حق گوئی کا جذبہ باقی رہتا ہے، اور فطرت نے اُس کو وہ ظرفِ عالی عطا کیا ہو، جس کی گہرائیوں میں ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی کی لہریں محوِ خواب رہیں۔

تنقید صرف خوب و زشت کی تفصیل پیش کر دینے کا نام نہیں ہے، یہ تو ایک اوسط درجے کا ذہن اور معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا خوش ذوق بھی کر سکتا ہے۔ نقاد مخصوص صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ وہ صرف متعلقہ تفصیلات ہی مرتب نہیں کرتا، قدر و قیمت کا تعین بھی کرتا ہے۔ معاشرتی حوادث، سیاسی تغیرات، جبرِ حکومت، جماعتی وابستگی، ایسے عوامل ہیں، جن کے اثرات کے تحت کبھی کبھی ادیب و شاعر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ لیکن ناقد ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر کے، ذہنوں کو افراط و تفریط کے سیلاب میں بہہ جانے سے روکتا ہے۔ یہ بات ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتی ہے، کہ ادب اِن مسائل میں اس حد تک غرق نہ ہو جائے، کہ تاثیر، خلوص، ابدیت، اور معیارِ بلند کے عناصر ہوا ہو جائیں۔ وہ وضاحت و تفصیل کے ساتھ اُن غلطیوں کی نشان دہی کرتا ہے، جو کسی بھی اعتبار سے معیاری ادب کے راستے میں سنگِ گراں بن سکتی ہیں۔

اس تنقیدی صلاحیت اور جرأت کے لئے نقاد کا غیر جانب دار ہونا ضروری ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح نقاد کو بھی یہ حق حاصل ہے، کہ وہ جس نظریۂ حیات پر چاہے، ایمان رکھے، اور اس کا اظہار کرے، لیکن عالمِ نقد و نظر میں اُس کی حیثیت صرف ادبی نقاد کی ہونا چاہیئے۔ ہم ایک باظرف، خوش ذوق، اور دیانت دار نقاد سے یہ توقع کرتے ہیں، کہ وہ ادب میں اپنے معتقدات کی جستجو، یا اپنے پسندیدہ اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس ادب پارے کا درجہ متعین کرنے کے بجائے، صرف اس بات کو دیکھے گا کہ ادبی حیثیت سے اس کا کیا مرتبہ ہے۔

نقاد کا فرض اور منصب اس قدر بلند ہے، کہ اگر وہ ذہنی طور پر قطعی غیر جانب دار نہیں ہو گا تو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ

نہیں ہو سکے گا۔ سیاسی رہنماؤں کو بہت آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ حقیقتوں کے چہرے پر نقاب ڈال دیتے ہیں، اور اس کو مصلحت سے تعبیر کر لیا جاتا ہے۔ سیاست میں ہر قدم پر نادل کی ضرورت پڑتی ہے، سیاسی اصولوں کے لحاظ سے اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ لیکن ادب میں اس پینترے بازی کی بالکل گنجائش نہیں۔

زندگی کے کچھ ایسے عام مشترک حقائق ہوتے ہیں، جن کو ہر طبقہ تسلیم کرتا ہے، خواہ وہ کسی مکتبۂ خیال سے تعلق رکھتا ہو۔ اسی طرح ادب کے بھی کچھ ایسے بنیادی عناصر ہیں، جن کو ماننے کے لئے، دوسرے اصولوں کا ماننا یا نہ ماننا لازمی نہیں ہے۔ یہی مشترک اصول ادب کی اصل بنیاد ہیں۔ ظلم و جبر کی مذمت، مناظر و مظاہر کی جلوہ فروشی، انسانی جذبات کی نیرنگی، فکر و خیال کی لامحدود پہنائیاں، آثار و مظاہر کی فکر انگیز نمود، صداقت، محبت، مسرت، غم، غرض اسی نوعیت کے جذبات و مظاہر ادب کی اصل اور مشترک بنیاد ہیں، ان عنوانات میں بجائے خود تاثیر، خلوص، ابدیت اور آفاقیت ہے۔ لیکن جب کوئی شاعر یا ادیب ان عنوانات کو خود غرضانہ سیاسی اصولوں، سماجی نظریوں، یا ہنگامی محرکات کے نقطۂ نظر سے اور ناپائیدار عناصر سے آمیز کر دیتا ہے، اس وقت ان عنوانات کی اپنی خوبیاں، اور پائیدار اثر انگیزی کی صلاحیت ہی فنا ہو جاتی ہے۔

تنقید میں جن عناصر نے جانب داری کی تشکیل کی ہے، ان میں بنیادی عنصر ادب اور نظریے کا باہمی تعلق ہے۔ ایک مکتبِ تنقید میں نظریہ ادب کے لئے لازمی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مکتبۂ خیال کے ناقدین کی رائے میں اگر ان کے مفروضات کو بنیاد نہ قرار دیا جائے، تو ادب میں حقیقت پسندی اور زندگی کی سچی اور حقیقت پسندانہ ترجمانی کے محرکات شامل نہیں ہو سکتے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ جن ادیبوں اور شاعروں کے کلام میں وہ نظریۂ حیات نہ ہو، ان کو سچے ادیبوں کی صف میں جگہ نہیں ملنا چاہئے۔ اس غلط تفہیم نے گروہ بندی کے جذبے کو تیز تر کر دیا، اور کھلم کھلا جانب داری کا آغاز ہوا۔

ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس نظامِ حیات کو صحیح سمجھتا ہے، اس کو مطمح نظر بنائے، اور اس کی تبلیغ کرے لیکن نشر و اشاعت سیاسی کارگاہوں تک محدود رہنا چاہیئے۔ ادبیات کو اس تبلیغ کا وسیلہ بنانا درست نہیں۔ زندگی ایک اکائی ہونے کے باوجود مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے، اسی نسبت سے اس کے محرکات و عوامل کے اثرات، اور دائرہ کار جدا جدا ہیں، اس تقسیم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نظریہ میں قطعیت ہوتی ہے، کہ اس کو ماننے کے بعد آپ مجبور رہیں کہ دوسرے نظریات کی نفی کریں، نظریہ کو اگر ادب کی بنیاد بنا یا جائے، تو ادب میں بھی یہی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح وہ عام مشترک، ہمہ گیر آفاقی و کائناتی تصورات، جو سارے انسانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں، ادب ان سے معرا ہو جائے گا۔ اور وقتی طور پر صرف ایک طبقے کی جذباتی تسکین کا فرض انجام دے سکے گا۔ ادب کا جائزہ ان اخلاقی، انسانی، اور تہذیبی اصولوں کے تحت لیا جا سکتا ہے جو قدر مشترک کی صورت میں کار فرما ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ فلاں ادیب نے فلاں بات کہی ہے جو اس نظریہ کے خلاف ہے، اس لئے وہ اور اس کی ادبی حیثیت، دونوں ناقابلِ التفات ہیں۔ نقاد اگر مولوی کی طرح یہ فتویٰ دیتا ہے کہ شاعر یا ادیب کو یہ کہنا چاہیئے اور یہ نہیں کہنا چاہیئے، اور اس وقت اس کے سامنے محض کوئی مخصوص نظریہ ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے تنقیدی دیانت داری سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ ناقد اگر کسی ادب پارے کی مذمت کرے، تو اس کی بنیاد عام اور مشترک اخلاقی، تہذیبی ا

جذباتی تصورات پر ہونا چاہیئے، جو نظریہ پرستی و نظریہ فروشی سے ہمیشہ بے تعلق رہتے ہیں۔

انسانی زندگی میں کچھ پابندیوں اور کچھ اصولوں کو ماننے کی ضرورت بھی ہے اور اہمیت بھی۔ اس کے بغیر خیالات کسی ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے، نہ عمل کے لئے متعین راستہ مل سکتا ہے۔ ادب خاص طور پر شاعری انسان کے ان لطیف و نازک تصورات کی شیرازہ بندی ہے، جو خارجی پابندیاں، درجہ بندی اور تقسیم سے بڑی حد تک آزاد رہتے ہیں۔ نظریہ جبر کی ایک قسم ہے، کہ آدمی اس پر ایمان لانے کے بعد مجبور ہو جاتا ہے کہ ہر اس تصور کی نفی کرے، جو اس کے دائرے سے خارج ہو، خواہ وہ فی نفسہ کیسا ہی ہو۔ [illegible] ہیں، اگر اس جبر کو جگہ دی جائے، تو وہ افکار جو اس کے بغیر عام انسانوں کے ذوق کی تسکین کا سر و سامان فراہم کر سکتے تھے، اب صرف انھیں لوگوں کو فریب تسکین عطا کر سکیں گے، جو اس نظریہ کے سو فی صدی پرستار ہیں۔ اور اس منزل پر ادب و شاعری واقعیت و ہمہ گیری سے محروم ہو جائے گی، جس کے بعد پھر اس میں خوبی و دلکشی اور عمومیت و ہمہ گیری باقی نہیں رہے گی۔

اگر ہم اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں، کہ ادب میں نظریہ پرستی کی گنجائش ہے، اور کسی نظام فکر کے پرستاروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نظریات کو صداقت اولین و آخریں، اور سارے مسائل کا واحد حل سمجھ کر ادب میں اس کی تبلیغ کریں، اگر ہم اس بات کو درست سمجھتے ہیں، کہ زندگی کی صحیح تعریف وہی ہے، جو کسی نظام کے بنیادی اصولوں کے تحت مرتب کی جائے، تو پھر اس بات کو بھی ماننا ہوگا کہ یہ آزادی مختلف مکاتیب خیال سے تعلق رکھنے والوں کو حاصل ہونا چاہیئے۔ ہم سب مانتے ہیں کہ سچائی کے ہزاروں روپ ہیں، صداقت کا نور ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کائنات میں سے صداقت کے سارے عناصر اس نے اس طرح چن لئے ہیں، کہ اب دوسروں کے لئے ایک ذرہ بھی نہیں بچا ہے، پھر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے، کہ سچائی کی روشنی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ اور صرف ایک مخصوص نظام ہی کے ایوان معتقدات کی زینت ہے ——

اس طرح ادب میں نظریئے کی تبلیغ کا حق ہر جماعت کو حاصل ہوگا، اور ہر شخص مجاز ہوگا کہ اس نظام فکر کے اصولوں کو بنیاد بنا کر زندگی و حقائق زندگی کی ترجمانی انھیں کے زیر سایہ کرے —— اگر ادب میں اس تبلیغ کو جائز سمجھا جائے، تو پھر ادب کی اپنی آواز، اپنا رنگ و آہنگ، اور ادبی معیار و مقصود بالکل نہیں رہے گا —— بھانت بھانت کے پنچھی اس طرح غل مچائیں گے، کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے گی۔ اسلامی ادب، اشتراکی ادب، غیر اشتراکی ادب، اور مختلف اقسام کے مہر شدہ ادب کی جو صرف نام کا ادب ہوگا، ہر طرف گرم بازاری ہوگی۔ نفس ادب کا کہیں وجود نہیں رہے گا۔

ادب میں نظریہ کی اس پابندی سے شاعری کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ جو شاعر کسی نظریہ کو نہیں مانتے ہیں، یا جن کے یہاں سماجی حقائق و حوادث کے اثرات نہیں ہیں، تنقیدی نقطۂ نظر سے ان کی تخلیقات کی اہمیت، اور ان کے مرتبے کا تعین، ناممکن سی ہو کر رہ گئی۔ مثلاً اس دور کے شاعروں میں اصغر گونڈوی کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ ان کی شاعری میں بعض ایسی خصوصیات ہیں، جو بہت متاثر کرتی ہیں، ان کے کلام کو پڑھ کر ایک خاص قسم کی جذباتی شگفتگی و سرشاری اور حسن بیان کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ سارے عناصر ہی سماجی، سیاسی، یا ادبی نظریہ کے اصولوں کی زد میں نہیں آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کے مرتبے کا تعین کس طرح ہوگا؟

اصغر یا بعض دوسرے قدیم شعرا کے یہاں کسی سماجی مسئلہ کا بیان نہیں ہے، ان کی شاعری میں زندگی کی عام کیفیات اور حوادث تک بھی نہیں ہے۔ ان کے یہاں تو وہ مخصوص وجدانی کیفیتیں ہیں، جن کو مادی محرکات و عوامل سے علاقہ ہی نہیں ہے —— نظریہ پرستی

کی بدولت نقاد بڑے کے داستہم بن گئے ہیں یہ بڑی طرح حائل ہے نتیجہ یہ ہے کہ ایسے شعرا کے متعلق ناقدین کوئی واضح بات نہیں کہہ پاتے ، نہ صحیح طور سے ان شعرا کے محاسن شاعرانہ نمایاں ہو پاتے ہیں ۔ نہ ان کے مرتبے کا تعین ہو پاتا ہے ۔ کیونکہ یہ ناقدین جن اصولوں پر ادب کو پرکھتے ہیں ، اور جن چیزوں کو اچھی شاعری ، اور حقیقت نگاری کے لئے لازمی بتاتے ہیں وہ اس نوع کی شاعری میں مفقود ہوتی ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھے اور معیاری ادب کی بہت سی اہم خصوصیات و محاسن ، غلط ادبی و تنقیدی مفروضات کے سبب نئی نسل کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں ۔ ان مخصوص خصوصیات ، صحیح علم و عرفان نہ ہونے کا ایک یہ نتیجہ ہے کہ نئے شاعروں کے یہاں لطافت ، تنوع ، تاثیر اور تہ داری تاثر کی بے حد کمی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری جب تک ایوان و شبستان کی رنگینیوں میں غرق رہی حقیقتوں سے آنکھیں نا آشنا رہیں ، لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس دور میں تنقیدی اصول ، نظریات ، اور حقیقت نگاری کے موجودہ ضابطوں سے محرومی کے باوجود شعرا اُن آفاقی صداقتوں ، اور کائناتی حقیقتوں سے ضرور آشنا تھے جن میں ابدیت جلوہ گر رہتی ہے ، اس عہد معصوم کی تخلیقات آج کے سائنٹفک زمانے میں وہی قدر و قیمت رکھتی ہیں ، اور خیال ہے کہ جب تک انسانی مزاج کی وہ بنیادی خصوصیات ، جو اس وقت تک قدر مشترک کی صورت میں کارفرما ہیں ، باقی رہیں گی ، ان تخلیقات کے جوہر ، رونق و تازگی رہے گی ۔

جانبداری اور گروہ بندی کے اس دور میں یہ ایک اسیر جلی تنقید کا فقدان بھی ہے ، ہم سمجھتے ہیں کہ ادب میں جذبات کا مریضانہ اظہار بالکل غلط ہے ، بلکہ بعض ... پابندیوں کے سبب یہ نہیں ہوتا کہ فصاحت اور ... کے ساتھ نقصان وہی ہوتا ہے اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے ، ... ہے ۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ ان تصنیفات میں ادب و شاعری کے پردے میں صحافت کو جگہ دی گئی ہو ... اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ شاعری میں فنکارانہ پن ، اور حسن بیان ہی خاص حیثیت ہے ۔ لیکن یہ توفیق نہیں ہوتی کہ جن شاعروں نے چند ہر بن کے ساتھ سماجی نظریات اور سیاسی نعروں کو شاعری میں ... ہے ، بد مذاقی و کم نظری سے بڑھ کر ... کے نمونے پیش کئے ہیں ، اور جدت طرازی یا انفرادیت کی نمائش کے جوش میں منتشر ... طرز ... عام ... دلکشی بیان ، حسن خیال ، اور صحت زبان کو تباہ کر دیا ہے ، اور خود بھی تباہ ہوئے ہیں ، ان کی ... روشنی ڈالی جائے ۔

ادبی ... کا واشگاف کرنا ، اور ... کی پذیرائی اس لئے ضروری ہے ، کہ فنکاروں کی ... خدا کرے ہوا اور تخلیقی صلاحیتیں اور نمایاں ہوں ۔ لیکن ... کے ساتھ ساتھ ... ضروری ہے کہ ان ... عام و معاشرہ کے ... و ... سے کام لیا جائے ۔ لیکن اس کے لئے ... ہے ، صداقت ، خلوص کی ضرورت ہے ، جس سے ہمارے بہت سے ناقدین محروم ہیں یا ان کی طرف سے بے نیاز ۔ آپ کسی ناقد سے تنہائی میں گفتگو کیجیے ، تو وہ ان سب باتوں کو تسلیم کرے گا ، لیکن مختلف مجبوریوں اور مصلحتوں کے سبب سے جرأت اظہار نہیں ہے ۔ ان مجبوریوں میں سے بعض کا تعلق محض ذاتی حالات سے ہوتا ہے ۔ لیکن ... کا تعلق جماعتی و سیاسی مصلحتوں سے ہوتا ہے —— اسی مصلحت پرستی کا یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے موجودہ شاعروں کے متعلق ... کا اظہار نہیں ہو پاتا ، مثال کے طور پر فیض کو لیجیے ۔ فیض مشہور ترین شاعر ہیں ۔ لیکن اس بات پر کم لوگوں نے غور کیا ہو گا کہ ان کی شہرت شاعرانہ محاسن سے زیادہ سیاسی کردار کی مرہون ہے ۔ ان کے مرتبہ کے تعین میں اصول شاعری ، محاسن کلام ، اور خالص ادبی معیار و مقصود کے

بجائے، ان کے ذہنی رجحانات، اور ان کے مثالی سیاسی کردار کی بنیاد پر ان کے مرتبۂ شاعرانہ کا تعین کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فیض کی شاعری میں جو حقیقی محاسن اور معائب ہیں، وہ سامنے نہیں آ پائے ہیں۔ محض غیر متعلق اور اضافی چیزیں موضوعِ بحث رہی ہیں۔

مجروح ترقی پسند ادبی تحریک سے اس زمانے میں وابستہ ہوئے جب اس کے اصول حرفِ آخر مان لیے گئے تھے۔ "مجاہدین" کے اس گروہ میں شامل ہوتے ہی وہ لینن اور سٹالن کے جے کارے "اے مالیے ساقی" کے نعرے لگانے لگے "سنگٹ کے جنوں میں" ترومین کی نیا چکراتے دیکھ کر یہ جوش اور بڑھتا گیا۔ وہ شاعر جو ایسے شعر کہتا تھا۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

وہ لال پھریرا، گل بدن سرخ ترا، دھرتی کی سجے، کے پھیر میں پڑ کر رہ گیا۔ لیکن آپ حیرت کریں گے کہ کسی نقاد کو یہ توفیق نہیں ہوئی، کہ وہ اس چھچھورے پن پر ٹوکتا۔ بلکہ سردار جعفری نے ان کے مجموعۂ کلام "غزل" کے دیباچے میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا اور اس کو سراہا، کہ مجروح نے ان الفاظ کو غزل کی جان بنا دیا ہے، جو آج تک اس کی بارگاہ میں باریاب نہیں ہو پاتے تھے۔ انھوں نے غزل کو نیا لہجہ عطا کیا ہے، نیا مزاج بخشا ہے، وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔ اور غزل کے نئے امکانات سے روشناس کیا ہے مصلحت پسندی کی حد یہ تھی کہ قاضی عبدالغفار مرحوم جیسا خوش ذوق ادیب ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو گیا۔

اس غلط پاسداری، بے جا نوازش، اور طعن غیر ادبی و غیر تنقیدی روش کا سبب صرف جماعتی وابستگی اور نظریہ پرستی تھی۔ ماحول کے اثرات کو انسان کے بنانے اور بگاڑنے میں یقیناً دخل ہے، لیکن اس بات کو فراموش کر دیا گیا کہ انسان کے اندر کچھ داخلی محرکات بھی ہوتے ہیں جن کے اثرات اتنے ہی ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ انسان بالعموم ماحول کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ لیکن کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں، کہ ماحول کے سارے عوامل ان کے پُرطاقت ذاتی محرکات کے سامنے بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ استثنا زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔ ہر زمانے کے ادب میں ایسی مثالیں موجود ہیں، کہ بعض خاص شاعروں نے ماحول کے اثرات سے وہ تاثر قبول نہیں کیا، جو اس دور کے دوسرے شعرا کے یہاں کارفرما ہے۔ ان شعرا کے یہاں سماجی اثرات کا عکس نہ ہونے کے برابر ہے۔ یا بالکل نہیں ہے۔ جہاں انھوں نے معاشرت سے متعلق کچھ کہا ہے، اس میں وہ زندگی، توانائی اور تاثیر نہیں ہے، جو ان کے نمائندہ کلام میں ہے۔ آخر ان شعرا کی قدر و قیمت کا تعین کیسے ہوگا؟ ناقدین کے اس مفروضے نے کہ ہر شاعر کا کلام اپنے زمانے کے سماجی اثرات و محرکات کا ترجمان ہوتا ہے، ان شعرا کے حقیقی مرتبے، اور ان کے کلام کے محاسن کو نظروں سے پنہاں رکھا۔

بعض ناقدین نے اپنی تنقیدوں میں احتیاط زدہ انداز بڑی کامیابی سے سمو لیا ہے۔ ان ناقدین کو ادبی و تنقیدی اصول کے ساتھ ساتھ بہت سی سماجی ضرورتوں اور حفظِ مراتب کے وضع دارانہ اصول کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مختلف مکاتیبِ خیال میں یکساں مقبول رہیں۔ وہ تنقید میں صداقت گوئی کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو دنیا کے سود و زیاں کا زیادہ تجربہ ہے۔ اس تضاد کو نباہنے کے لیے، وہ ایسا نکھرا، مرصع، لگی لپٹی اور مصالحانہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں، جس میں حیرت [illegible] خوش نما الفاظ و تراکیب اور طرزِ اظہار کے وسیلے سے وہ ایسی اہم بات کہتے ہیں جس سے ہر شخص بہ قدرِ ذوق و خواہش لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

حد تک مطمئن۔

اس محتاط انداز بیان نے تنقید کے سادہ، پر معنی، اور بے محابا اسلوب کو ختم کر کے متشککانہ صلح پسندی کا اس طرح اضافہ کیا، کہ تنقیدی وضاحت، صاف گوئی، اور سنجیدگی آمیز قطعیت ذبح ہو گئی۔ زندگی میں دروغ مصلحت آمیز کی گنجائش ہے اور بعض جگہ اہمیت بھی۔ لیکن تنقید میں اس کی مطلق گنجائش نہیں۔ بہت سے ایسے تنقیدی مضامین دیکھنے میں آتے ہیں جن میں "ہو سکتا ہے" کا استعمال بڑی فراخ دلی سے کیا جاتا ہے۔ "یہ بات بظاہر یوں ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یوں ہو" سے بھی فائدہ مگر۔ لیکن۔ البتہ جیسے الفاظ سے اٹھایا جاتا ہے۔ بعض ناقد تو ان کو بطور تکیہ کلام استعمال کرتے ہیں۔ اس گو مگو قسم کے انداز کے باعث نا روا ابہام پسندی، بے جا معنی آفرینی اور ابہام و تشکیک کی صلاحیتیں ضرورت سے زیادہ بڑھ گئیں۔ اور تاویلات کی نئی نئی گنجائشیں نکل آئیں۔ ان تاویلات نے بہت سی بنیادی خرابیوں کا جواز کسی نہ کسی طرح پیدا کر دیا۔ اور اصل بات پر ابہام کے پردے ڈال دیئے۔

آج کل مقدمہ نگاری کا کاروبار اچھا خاصا چل رہا ہے۔ دیباچہ نگاری بڑی کارآمد صنف سخن ہے۔ لیکن بہت سے با اخلاق ناقدین کے کرم سے یہ صنف بھی معیار نقد و نظر کو پست کرنے، اور جانب داری کو بڑھانے میں معقول حد تک کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔ آج کے باشعور ناقدین قدیم تقریظ نگاری کے سخت مخالف ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگلے زمانے کے لوگ ایک بات کو الفاظ کے ہجوم میں چھپا کر اس طرح پیش کرتے تھے کہ مفہوم لفظی ملمع کاری کے پردے میں پنہاں ہو جاتا تھا۔ پھر اس کی تاویل بھی کی جاتی ہے کہ چونکہ وہ لوگ دور جاگیرداری کی پیداوار تھے، اور اس زمانے میں اخلاقی اصولوں، اور وضع داری کا بڑا پاس کیا جاتا تھا، اس لئے کھل کر نکتہ چینی کرنا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض حضرات جو زیادہ باجرأت اور حقیقت پسند ہیں کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں۔ ان لوگوں کی کوئی رائے ہی نہیں ہوتی تھی۔ ہاں الفاظ کا ذخیرہ اچھا خاصا ہوتا تھا، بس انہیں کو سجا کر پیش کر دیتے تھے۔

لیکن آج کے باشعور، حقیقت پسند، حقائق آگاہ، اور فن تنقید کے آداب و ضوابط سے پورے طور پر آشنا، ناقدین کو کیا کہا جائے گا، جن کے مقدمے تقریظوں کو بھی شرما دیتے ہیں۔ آج یہ عالم ہے کہ معمولی سے معمولی کتاب پر مشہور سے مشہور نقاد کا مقدمہ، دیباچہ یا پیش لفظ موجود ہوتا ہے۔ عام پڑھنے والے جو اس نقاد کی رائے کو قابل لحاظ مانتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ تو ہو گا جبھی تو فلاں فضیلت پناہ نقاد نے قلم اٹھایا ہے۔ اس طرح تیسرے درجے کے ادب کی ایسی ہمت افزائی ہوتی ہے، جس سے نئے شعراء اور ادیب کبھی صحیح بصیرت حاصل نہیں کر سکتے۔

مقدمے میں یا تو اس کتاب کی قدر و قیمت کا تعین ہونا چاہیئے۔ یا نفس موضوع پر ایسے خیالات کا اظہار ہونا چاہیئے جو اس کتاب کو سمجھنے میں مدد دیں۔ لیکن اس کے بجائے رسمی و روایتی ڈھنگ سے ہیچ در ہیچ اور خامیوں سے معمور تخلیقات کی اس طرح حاشیہ آرائی کی جاتی ہے، کہ وہ شاعر یا ادیب تو ہمیشہ کے لئے کچھ سیکھنے، سمجھنے سے محروم ہو ہی جاتا ہے، تنقیدی دیانت اور صاف گوئی پر بھی حرف آجاتا ہے — مقدمہ نگاری کی یہ وبا عام طور سے گروہ بندی کے دائرے سے پھوٹتی ہے۔ اس طرح ادبی طوائف الملوکی کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں تنقید اور شعر و ادب دونوں کو روز بروز غریب ہونا پڑتا ہے۔

جن لوگوں نے سنہ ۴۲ء سے لے کر اس وقت تک کے تنقیدی ذخیرے کو بغور دیکھا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں، کہ اس دوران میں تنقید کی دنیا میں کتنے انقلاب آئے۔ تنقید پر ایک بحرانی دور بھی گزر چکا ہے، جب اس کاروبار کی گرم بازاری بھی جنگ

پوری ہیبت ناکی سے جاری تھی۔ جن طبقات نے اس کو قومی جنگ سے تعبیر کیا تھا انھوں نے ساری صلاحیتیں اس بات پر صرف کر دیں کہ دانش ور طبقے کے ہر فرد کے دل میں یہ بات نقش ہو جائے کہ ادب کا مقصد صرف یہ ہے کہ نازی درندوں سے ملک کو محفوظ رکھنے کا مقدس فرض انجام دیا جائے۔ یہ نقطہ ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ اس دور میں داخلیت یا غیر افادی تصورات کی بات کرنا نہایت غلط کام ہے۔ خدا خدا کر کے جنگ ختم ہوئی، وہ طاقتیں جو وقتی مصالح کی بنا پر متحد ہو گئی تھیں، پھر علیحدہ ہو گئیں۔ خطرے کی تیز تلوار سروں پر لٹک رہی تھی جس نے ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا مصیبت کے دن دور ہوتے ہی حلیف حریف بن گئے۔ اور باضابطہ سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اسی درمیان میں ایک گوشے سے امن کا نعرہ بلند ہوا، ہر طرف امن کے نعرے بلند ہونے لگے۔ جن لوگوں نے قومی جنگ کے زمانے میں ادب کی غایت یہ بتائی تھی کہ نئی اقدار کے تحفظ کے لئے اس میں شمولیت کی جائے، اب انھوں نے امن کا یہ پیغام گھر گھر پہنچانے کے لئے بھی ادب و شاعری کے آسان راستے تلاش کئے۔ ایک مدت تک ادب کی فضائیں امن کے سیاسی نعروں سے معمور رہیں۔

اسی دوران میں ہندوستان برطانوی استبداد سے آزاد ہوا۔ ایک طرف سے فتویٰ شائع کیا گیا، کہ یہ آزادی محض ایک فریب ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے یک زبان ہو کر آزادی کا ماتم کرنا شیوۂ اہلِ نظر بنایا۔ اس دور میں ادب کی غایت آزادی کا ماتم کرنا، اور ایک سانحے انقلاب کی بشارت دینا تھی۔ اس سے پہلے ایک وقفہ مختصر ایسا بھی گزرا، جس میں بعض جنس زدہ حضرات نے فرائڈ کی پیغمبری کا اعلان کرتے ہوئے واد جنس فروشی دینا شروع کی۔ کچھ دنوں کے لئے کائنات ادب جنس کے پیچ و خم میں گرفتار ہو گئی۔

غرض اس ۱۵، ۱۶ سال کے عرصے میں بار بار ادب کی غایت، مقصدیت کا تعین، اور اس کی تعریف کی حدود متعین اور رد ہوئیں۔ اور ہر بار یہ فرض باشعور ناقدین نے ادا کیا۔ اس دور کے تنقیدی مقالات اور اخبارات کے اداریوں مضامین میں امتیاز مشکل تھا۔

مقصدیت کے غلط تصور، نظریات کے پھیر میں گرفتاری، ادب کو مخصوص سیاسی پس منظر کا تابع کر دینے، اور مصلحت پسندانہ نگارش نے شاعری کو بے حد نقصان پہنچایا۔ اصول و تعریفات کے نام پر سیاسی مصلحتوں کی طرح اتنے جلد بدلنے لگے، اور عوامی ادب کے پُر فریب نعروں پر اتنا زور دیا گیا کہ معیار و سنجیدگی کے لئے کم سے کم جگہ باقی رہی۔ نئے شاعروں کا گروہ اس رنگ میں ادب کو سماجی نظریات، محض خیالی واردات اور مفروضہ حقائق کو اشعار کے کھردرے سانچوں میں ڈھالنے لگا۔

اس طوفان کم شعوری کا اثر زبان و بیان پر بھی پڑا۔ جب ادب کی غایت محض نشر و اشاعت ہو تو ان فنی وادبی لوازم کا کیا سوال، جن کے حصول کے لئے برسوں کی مشق، دیدہ وری، تامل و تفکر، برہنہ گفتاری سے بے نیازی، قدیم ادب کا اچھا مطالعہ اور سنجیدگی پہلی شرط ہے۔ ناقدین نے اس زمانے کی مخصوص مصلحتوں کے لحاظ سے ان پہلوؤں کو نظر انداز ہی نہیں کیا، ان پر گفتگو کرنا بھی نارسائی و خام کاری، بورژوا ذہنیت، اور خشک دماغی کا کرشمہ بتایا۔ ناقدین کی یہ مصلحت آمیز، جانب دارانہ روش مجاہدین شعر ایسے دام ہوس بن گئی۔ کافی ہاؤس، دوستوں کی محفلیں، اور چھوٹے چھوٹے ادبی حلقے زبان و بیان کا دارالضرب فرض کر لئے گئے جہاں نئی نئی مہوت کن ترکیبیں گڑھنا، اسلوب و ہیئت کے نئے نئے انجوبے اس طرح پیش کرنا، کہ مذاق سلیم، شاعرانہ صناعی، اور فنکارانہ مرصع سازی کی چھوٹ نہ پڑنے پائے، منتہائے کمال فرض کر لیا گیا۔ اور ان سب عیوب کی پردہ پوشی ہی نہیں، ان کو جائز و برحق ثابت

کرنے کا مقدس فرض ناقدین نے سہا دینے والے، اور پر ہیبت اصطلاحات سے آراستہ مضامین سے ادا کیا۔

اس مصلحت پسندی اور جانب داری کا یہ نتیجہ ہوا، کہ اس بحرانی دَور کا بیش تر سرمایہ پرانے اخباروں کی طرح بیکار نظر آرہا ہے یا متاعِ بقال بن گیا۔ یہ بڑا نقصان تھا۔ وہ شعراء جن کو فطرت نے خیالاتِ بلند کی دولت بخشی تھی، انھوں نے غلط سانچوں اور غلط تر مفروضات سے کام لے کر اُس جوہر کو رائگاں کر دیا۔ لیکن اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہوا کہ تنقیدی متانت، غیر جانبداری اور صداقت مجروح ہوگئی۔

میرا مقصود فنِ تنقید کے ان اضافوں سے انکار کرنا نہیں ہے، جنھوں نے ادب میں نئے امکانات کے نشان دکھائے، نئے مسائل، سماجی و عمرانی پیچ و خم، زندگی و ادب کا تعلق، شاعر و ادیب کے ذہنی محرکات، غرض ایسے بہت سے عنوانات ہیں، جن سے جدید تنقید ہی نے روشناس کیا۔ مقصود یہ ہے کہ ناقدین نے سیاسی جانب داری کے پھیر میں پڑ کر عام سماجی حقائق اور مفروضہ اصول کو غلط طور پر ادب کی بنیاد قرار دے کر، تنقیدی اصولوں کو جو بے راہ روی کو روکنے کا واحد ذریعہ تھے۔ بے راہ روی کی ترویج کے لئے استعمال کیا۔

بعض ناقدین نے داخلیت کو فراریت، اور مریضانہ رجحان کا نمائندہ بنایا۔ حالانکہ یہ بات اصولاً غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکسزم سے متاثر ناقدین نے "مادی جدلیت" کے نظریہ کو بنیاد ماننے کی وجہ سے داخلیت کی نفی ضروری سمجھی۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ شاعر جن داخلی جذبات کی شیرازہ بندی کرتا ہے، وہ مطلق ذاتی نہیں ہوتے ہیں، ان معنی میں وہ ضرور ذاتی جذبات ہیں، کہ اس وقت شاعر ہی ان سے متاثر تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اجتماعی داخلیت کی نمائندگی کرتے ہیں، کیونکہ دنیا کے ہر رنگ و نسل کے افراد کے نہاں خانۂ ذہن میں یہ تصورات بعینہ یا نہایت معمولی تغیر کے ساتھ کارفرما رہتے ہیں۔ محبت اور اس کے متعلقات مصیبتیں اور ان کا شدید احساس، زندگی کی مشکلوں سے گھبرا کر خود فراموشی کی خواہش، غرض ایسے بے شمار موضوعات ہیں، جو افسانوں میں بلا اختلافِ ملک و قوم، شروع سے آج تک کارفرما ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہ زندگی کے بعض لمحات کی علامات ہیں، کل زندگی نہیں، پھر ان کی ترجمانی غیر حقیقی کیسے ہوسکتی ہے، یا ان کو مکمل زندگی کی نفی سے کیسے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو وہ سرخیاں ہیں، جو ہر دَور اور ہر نسل کے افسانوں کی افسانہ طرازی میں سرفہرست ملتی ہیں۔

آخر مضمون میں ایک اور تحریک کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ ایک خاص تحریک شروع کی گئی تھی، بہت سے پھیر دینے کے بعد یہ اصول، وضع کیا گیا تھا، کہ ادب کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ عوام کو ان تعمیری کاموں سے روشناس کرائے، جو کسی ملک کی حکومت ملکی و قومی تعمیر کے لئے کر رہی ہو، ان تعمیری پروگراموں کی طرف عوام کی توجہ کو منعطف کرانا، اور ان کی تکمیل کے لئے دانش وروں طبقے کی مدد سے عوام میں جوش و خروش پیدا کرنا بھی ادیبوں کی ذمہ داری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت ملکی تعمیر کے لئے جو جدوجہد کر رہی ہو، ہر شہری کو اُس سے اتنی ہی دلچسپی ہونا چاہیئے، جتنی اس کو اپنے آپ سے ہو۔ لیکن اس جدوجہد میں ادیبوں سے نشر و اشاعت کا کام لینا، جس طرح انگریزی حکومت نے دوسری جنگ کے دوران میں ادیبوں، شاعروں، اور مشاعروں سے یہ کام باضابطہ لیا تھا، بالکل غلط ہے۔ اس بات پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے، کہ ادیب و شاعر کو کسی مکتبۂ خیال کا پابند بنا کر اس کے اصولوں کی نشر و اشاعت کو ادب کا مقصد بنانا، ذہنی آزادی، وسعتِ خیال، اور غیر محدود فکری

امکانات کے منافی ہے۔ ایسی تحریکوں کے تحت دُنیا کے جس حصے میں بھی ادیبوں کو ناؤنسروں کی صف میں شامل کیا گیا، وہاں ذہنی آزادی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ سیاسی اصولوں، اور نظریاتی پابندیوں نے ادب میں کیا گل کھلائے ہیں، اس سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے، کہ اگر واقعی کسی ادبی تحریک کو حکومت کی سرپرستی کا شرف حاصل ہوا، تو اس کے تحت جس ادب کی تخلیق ہوگی، اس کا رنگ و آہنگ اور معیار و مقصود کیا ہوگا۔

زندگی میں غم و آلام کی کمی نہیں ہے، سماجی خرابیاں بھی ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی دیدہ ور ادیب ہمیشہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کئے رہے گا، یا اس کے ذہن و قلب پر یہ اثرات نہیں پڑیں گے۔ لیکن پہلے کچھ اصول مان لینا، ان کے زیرِ سایہ کچھ سانچے بنا لینا، اور پھر زندگی کے سارے مصائب کو ان میں ڈھال لینا، دیدہ وری یا حقیقت نگاری نہیں، کورانہ تقلید ہے۔ اس کی گنجائش سیاست میں ہے، ادب میں نہیں۔ ادیب کے لئے لازمی ہے کہ وہ جو کچھ کہے، اس کے اپنے تاثرات ہوں، کسی جماعت، یا کسی حکومت کا اعلان نامہ نہ ہو۔

ہمارے ادب میں سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ ادیبوں نے مصیبتوں کو سیاسی و نظریاتی اصولوں کی عینک سے دیکھا، مصیبتیں، تلخیاں اور حادثے، اپنی اصلی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئے، نہ ان کے پیچھے پرخلوص اثرات ہی ان کے ذہن و قلب میں جاگزیں ہوئے، ہر حادثہ ایک مفروضہ سلسلہ کی کڑی بن کر ان کے سامنے آیا۔ اور ہر مصیبت ایک مرتب اصول کا لازمی نتیجہ بن کر رونما ہوئی۔ مفروضات و کلیات کو تسلیم کر لینے کا نتیجہ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا۔ نتیجے کے طور پر ان آلام و حوادث کے بیان میں وہ تاثیر بھی نہیں آسکی، جو ذاتی محسوسات کا جوہر ہوتی ہے۔ اس طرح تخلیق کا عمل نقالی کا مرادف ہو کر رہ گیا، جو بہت بڑا المیہ تھا۔ ناقدین نے اس کج خرامی کو درست و برحق ثابت کرنے کے لئے، سیاسی رہنماؤں کی طرح تاویلات کے انبار لگا دیئے۔ یہی نہیں اگلے پچھلے سارے ادبی سرمائے کو انھیں خود ساختہ اصولوں کی کسوٹی پر کسا۔ اس غیر ادبی جہاد کے جو نتائج ہو سکتے تھے، آج سامنے ہیں۔

شاہ عالم آفتاب اور ان کی مخصوص شعری محفلیں

ثمینہ شوکت

شاہ عالم ثانی کو ایسے زمانے میں تخت و تاج نصیب ہوا تھا جب مغلوں کی حکومت کے اچھے دن بیت چکے تھے اور وہ اپنی اگلی عظمت کا صرف سایہ رہ گئی تھی۔ یوں تو عالمگیر کے بعد جتنے بادشاہ تختِ دہلی پر بیٹھے ان سب کے لئے عافیت مفقود ہو چکی تھی، لیکن ان میں بھی شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حالت بہت زیادہ قابلِ رحم ہے۔ ظفر سے تخت چھینا گیا اور قیدی بنا کر رنگون میں کس مپرسی کی موت مرنے کے لئے بھیج دیئے گئے تو شاہ عالم کو آنکھیں تخت کی بھینٹ دینی پڑیں۔

اس بادشاہ پر شہزادگی کے زمانے سے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ابھی کم عمر ہی تھے کہ عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس زمانے میں نجیب خان افغان نے انھیں پناہ دی لیکن یہ شاہی خانوادہ کے احترام اور وفاداری کے مدِ نظر نہیں، بلکہ آئندہ اپنے مراتب میں ترقی کے خیال سے۔ بعد میں محمد قلی خان نے انھیں اپنے یہاں بلا لیا مگر یہ بھی اپنے ذاتی مفاد کی خاطر۔ چنانچہ عظیم آباد کے معرکے میں شہزادہ کو وسیلہ ظفر جان کر اپنے ساتھ رکھا۔ اصل میں یہ لوگ شہزادہ کے نام سے فائدہ اٹھانا اور معرکے سر کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شجاع الدولہ عظیم آباد کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ اس وقت شہزادہ کو انھوں نے اپنے ہمراہ رکھا تھا۔ اسی زمانے باپ کے مارے جانے کی خبر پہنچی اور شجاع الدولہ کی مدد سے عظیم آباد کے قریب کھتولی میں ۱۱۷۳ھ میں انھوں نے اپنی شاہی کا اعلان کیا اور شاہ عالم ثانی لقب اختیار کر کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ شجاع الدولہ کی رفاقت کے مدِ نظر انھیں وزارت سے سرفراز کیا گیا۔

شاہ عالم ثانی نے کوئی پینتالیس برس حکومت کی۔ جلوس کے تیسویں سال ۱۲۰۳ھ غلام قادر روہیلہ کا سانحہ پیش آیا۔ اس سانحہ میں اپنی آنکھیں کھونے کے بعد بھی وہ پندرہ برس اور زندہ اور برائے نام بادشاہ رہے۔ غلام قادر کے واقعے کو بیان کرنے کے بعد قشتی کریم الدین، مولف "تذکرہ طبقات شعرائے ہند" لکھتے ہیں کہ "یہ حال نحوست مآل اس بادشاہ کا تھا۔ اس کے عہد سے خاندان تیموریہ کو زوال ہوا۔"[1]

اس زمانے میں شاہ عالم کی بے چارگی اور بے بسی کا کچھ اندازہ محمد حسین آزاد کے ان بیانات سے ہوتا ہے جو انھوں نے انشا کے باب میں لکھے ہیں۔ انشا جب مرشد آباد سے دہلی آئے تو ان کا توسل شاہ عالم کے دربار سے ہو گیا تھا۔ آزاد کا بیان اس

1۔ تذکرہ طبقات شعرائے ہند

بارے میں بہت سی لمبی تشریحوں سے زیادہ بلیغ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس وقت دِلّی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اس کے شاہ عالم بادشاہ تھے۔" [1]

انشا اس زمانے میں نوعمر تھے۔ اندھے بادشاہ کو کوئی اہم مصروفیت تو تھی نہیں۔ وہ لطائف وظرائف میں اپنا وقت نہ گزارتے تو کیا کرتے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ شاہ عالم ان کی ایک دم کی جدائی کو بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ انشا کی منچلی طبیعت اکثر انھیں گستاخ بھی بنا دیتی تھی، لیکن بادشاہ سب کچھ سہہ لیتے تھے۔ ذیل کے ایک واقعے سے اس کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے گا۔ آزاد لکھتے ہیں:-

"جمعرات کا دن ہوتا (انشا) باتیں کرتے کرتے دفعتاً خاموش ہوتے اور کہتے کہ پیرو مرشد، غلام کو اجازت ہے؟ بادشاہ کہتے "خیر باشد، کہاں کہاں؟" یہ کہتے حضور آج جمعرات ہے۔ غلام نبی کریم جائے۔ شاہ دین و دنیا کا دربار ہے۔ کچھ عرض کرے شاہ عالم بادب کہتے —" ہاں، ہاں، بھئی ضرور جائیے۔ سید انشا ہمارے لئے بھی کچھ عرض کرنا"۔ یہ جواب دیتے "حضور، غلام کی اور آرزو کونسی ہے؟ یہی دین کی آرزو، یہی دنیا کی مراد"۔ یہ کہہ کر پھر خاموش ہو جاتے۔ بادشاہ کچھ اور بات کرنے لگتے ایک لمحے کے بعد یہ پھر کہتے —" پیرومرشد، پھر غلام کو اجازت ہو"۔ بادشاہ کہتے "ہیں ارے بھئی، میر انشا اللہ خاں، ابھی تم گئے نہیں؟" یہ کہتے کہ "حضور، بادشاہِ عالی جاہ کے دربار میں غلام خالی ہاتھ کیوں کر جائے۔ کچھ نذر و نیاز، کچھ چراغی کو تو مرحمت ہو"۔ بادشاہ کہتے —" ہاں بھئی، درست، درست، مجھے تو خیال ہی نہیں رہا"۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپیہ نکال کر دیتے۔ میر انشا اللہ خاں لے لیتے اور ایک دو فقرے دعائیہ کہہ کر پھر کہتے — حضور، دوسری جیب میں دستِ مبارک جائے تو فدوی کا کام چلے، کیونکہ وہاں سے پھر کر بھی تو آنا ہے"۔ [2]

یہ مانتے ہوئے بھی کہ شاہ عالم، انشا کو بہت چاہتے تھے، اور بے کاری کے زمانے میں انشا کی بذلہ سنجی ان کی دل بستگی کا بڑا ذریعہ تھی، اس کے باوجود آزاد کا یہ بیان جیسا منظر پیش کرتا ہے، اس سے ایک شہنشاہ کے کردار، اور اس کے رعب داب پر کچھ اچھی روشنی نہیں پڑتی۔

مغلیہ خاندان کے بعض آخری حکمرانوں کی طرح شاہ عالم بادشاہ کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ وہ آفتاب تخلص کرتے تھے

---

[1] آبحیات ص ۲۷۲ (سرفراز پریس، لکھنؤ) [2] ایضاً

رفارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے اُن کا تذکرہ علیحدہ نہیں لکھا ہے۔ لیکن ضمنی طور پر ایک
ٹ نوٹ میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:-

"وہ خود بڑا مشاق شاعر تھا، جس کے چار اُردو دیوان موجود ہیں۔" [1]

لہ سری رام نے شاہ عالم کے جو حالات لکھے ہیں وہ زیادہ تر وہی ہیں، جو عام طور پر ان سے پہلے کے تذکرہ نگار لکھ چکے ہیں۔ شاعری
بارے میں انھوں نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ:-

"انھیں فن شعر سے کمال انس تھا۔" [2]

اس کے علاوہ انھوں نے محمد حسین آزاد کے بیان سے یہ بات بھی دُہرا دی ہے کہ شاہ عالم نے "چار دیوان مرتب
تھے" لیکن آزاد کی طرح انھوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ چار دیوان اردو کے ہیں۔ تاہم اس بنا پر کہ وہ اُردو
را کے حالات لکھ رہے تھے، یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ چار دیوان اردو کے ہیں۔ اِن دواوین کو وہ کمیاب بتاتے ہیں۔ آزاد
کے حوالے سے ایک بات انھوں نے یہ بھی لکھی ہے کہ:-

"ایک ضخیم قصہ نثر میں نہایت شستہ دلچسپ عبارت میں حضرت کی یادگار
ہے۔" [3]

لہ سری رام نے اس قصہ کا نام نہیں بتایا، لیکن شاہ عالم کے ایک معاصر تذکرہ نگار، حکیم قدرت اللہ قاسم نے اس کا نام "قصہ شاہ
عجائب القصص" لکھا ہے۔ [4]

شاہ عالم کے باب میں ان کے معاصر مرزا علی لطف نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔ لیکن اس میں ان کے ذاتی حالات اتنے
ہیں ہیں جتنے اس زمانے کی سیاسی دار و گیر کے واقعات ہیں۔ لطف نے یہ تذکرہ شاہ عالم کی زندگی میں لکھا تھا۔ خود شاہ عالم
حالات انھوں نے ۴۲ھ جلوس یعنی ۱۲۱۵ھ میں لکھے تھے، جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے:-

"مختصر یہ کہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ پندرہ ہجری ہیں اور جلوس مبارک کو
سنہ بیالیسواں ہے وہ اورنگ نشین بارگاہ جاہ و جلال تخت پر ساتھ عیش و نشاط
کے حکمران ہے۔" [5]

شاہ عالم کی شاعری کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ:-

"حضرت جہاں پناہ کے مزاج مبارک کو نہایت نظم کی طرف التفات ہے اور
بیشتر شغل اشعار میں کٹتی ہے۔" [6]

---

[1] آب حیات
[2] خمخانہ جاوید۔ ج ۱ ص ۱۰۶
[3] ایضاً
[4] مجموعہ نغز ج ۱
[5] گلشن ہند ص ۹
[6] ایضاً

اس سے واضح ہے کہ لطف نے یہ حالات غلام قادر روہیلہ کے سانحے کے بارہ سال بعد لکھے تھے۔ شاہ عالم نے اس سانحہ کی کچھ تفصیل فارسی میں نظم کی تھی۔ لطف نے یہ اشعار حاشیہ میں درج کر دیئے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ:۔

"ازبس کہ وہ غزل فارسی ہے، داخل کرنا اس کا بیچ کتاب کے خلاف آئین
نثر ہندی کے معلوم ہوا، اس واسطے تیمناً و تبرکاً اس غزل کو حاشیہ کتاب
پر لکھا ہے۔"[1]

اس نظم کا منظوم اُردو ترجمہ، جو خود ان کا کیا ہوا ہے، متن میں درج کر دیا ہے۔ رام بابو سکسینہ اس نظم کو قصیدہ بتاتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ، شاہ عالم کا ایک دیوان فارسی میں بھی موجود ہے۔ شاہ عالم کے اُردو دیوان کے بارے میں رام بابو کے بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کا صرف ایک اُردو دیوان ہے، جس کی ضخامت انھوں نے (۴۴۴ صفحات) بتائی ہے۔[1]

حکیم قدرت اللہ قاسم نے شاہ عالم کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے عقیدت مندی کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔ اور واقعات کم ہیں۔ انھوں نے شاہ عالم کے اوصاف حمیدہ، رعایا پروری اور خدا ترسی کو بہت سراہا ہے۔ یہی تقریباً مصحفی نے بھی کیا ہے۔ قاسم نے لکھا تھا:۔

"ذات قدسی صفاتش باعث امن و امان، زمان و زمانیاں وجود مسعود سراپا بہبودش
موجب صلاح و فلاح جہاں و جہانیاں۔ خاطر ملکوت مآثرش پیوستہ مصروف احوال
رعایا ——— خلاصہ اوقات مبارکش بہ پرستاری جناب صمدیت مصروف۔"[2]

اور مصحفی لکھتے ہیں۔

"دریں زمان پر آشوب کہ از ہر طرف غبار فتن و فساد برخاستہ عالمی را مکدر دارد
بر سر کونین آستین فشاندہ اوقات عزیز خود را اکثر بطاعت و عبادت بری برد۔"[3]

قاسم نے اُردو دواوین کی تعداد نہیں بتائی، بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ ان کے اُردو اور فارسی کے دیوان مکمل اور مدون ہیں، جن میں قصائد، غزلیات اور دوسری نوع کا کلام شامل ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں ان کے ایک اُردو قصے کا تذکرہ کیا ہے جس کا حوالہ اُوپر گزر چکا ہے۔ لالہ سری رام نے جس قصہ کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً یہی قصہ ہے۔ جس کا نام قاسم نے "قصہ شاہ شجاع الشمس" بتایا ہے۔ محمد حسین آزاد کی نظر سے یہ قصہ غالباً نہیں گذرا تھا۔ ان کا ماخذ "مجموعہ نغز" کا بیان ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تذکرہ ان کے مطالعہ میں رہ چکا تھا۔ چنانچہ مجموعہ نغز کا مطبوعہ نسخہ انھیں کے کتب خانہ کے نسخہ پر مبنی ہے[4] اور اس میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حاشیے بھی درج ہیں۔ یہ نسخہ اب پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

لالہ سری رام نے شاہ عالم کے قصہ نثر کا تذکرہ کرنے کے بعد ایک غیر واضح سی بات یہ بھی لکھی ہے کہ:۔

۱؎ تاریخ ادب اُردو ص ۲۴۲
۲؎ مجموعہ نغز ص ۱۸، ص ۱۹
۳؎ تذکرۂ ہندی ص ۲
۴؎ مجموعۂ نغز ص ـ یج

"اُردو کلام کے بعد وہ مرثیہ شہر آشوب لکھا جاتا ہے، جو سلطنت دہلی کی تباہی کے وقت، حضرت شاہ عالم نے فارسی زبان میں فرمایا تھا۔"

جہاں تک معاصر ماخذوں کا تعلق ہے، ان میں سے کسی سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاہ عالم نے کوئی شہر آشوب بھی لکھا تھا۔ اس کے برخلاف، آزاد کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا نے شاہ عالم سے رنجش کے بعد جو شہر آشوب لکھا تھا، اسے بعض لوگوں نے شاہ عالم اور ان کے دربار کی ہجو سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔[1] لالہ سری رام نے مذکورہ بالا بیان کے بعد گیارہ شعر شاہ عالم کی غزلوں کے لکھے ہیں، اور آخر میں، وہ فارسی نظم نقل کی ہے، جو غلام قادر روہیلہ کی کورنمکی کے حادثے کے بعد شاہ عالم نے لکھی تھی۔ لالہ سری رام کی مراد، شہر آشوب سے غالباً یہی نظم ہے، کیونکہ ان کے انداز سے یہ مترشح ہے کہ یہ شہر آشوب اُردو میں نہیں ہے۔

منشی کریم الدین نے "طبقات الشعرائے ہند" میں شاہ عالم کی شعر و سخن سے دلچسپی کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کے شعری اصناف اور کارناموں کی تفصیل ان الفاظ میں دی ہے:-

"اس کی تصنیف سے کبت اور دوہرے بھی بہت ہیں اور ایک مثنوی بنام اقدس ہے، اور ایک دیوان صاحبقران ان کی تصنیف سے ہے۔"[2]

دیوان صاحبقران کے بارے میں انھوں نے وضاحت نہیں کی ہے۔ یہ شاہ عالم کے اُردو دیوان کا نام تھا۔ تاہم اس کے بارے میں شبہ کی اس لئے گنجائش نہیں ہے کہ کریم الدین نے اس کا تذکرہ شاہ عالم کی اُردو شاعری کے سلسلہ میں کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے ان کے صرف ایک اُردو دیوان کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی جسے کریم الدین محض مثنوی بنام اقدس لکھتے ہیں، رام بابو سکسینہ نے اس کا نام مثنوی مضمون اقدس بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مثنوی ایک فرضی قصہ پر مشتمل ہے، جس میں مظفر شاہ بادشاہ، چین کی داستانِ محبت بیان کی گئی ہے۔ سکسینہ اس قصہ کا نام تاریخی بتاتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس سے سن ۱۲۰۱ھ برآمد ہوتا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ "مضمون اقدس" سے ۱۲۰۱ نہیں بلکہ ۱۱۰۱ کے عدد نکلتے ہیں۔

شاہ عالم کی شاعری کے بارے میں ہمارے اہم ماخذ یہی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے تذکروں جیسے سخن شعرا، گلشن بے خار، نغمۂ عندلیب وغیرہ میں ان کے بہت مختصر حالات دیئے گئے ہیں۔

نساخ نے ان کے بارے میں صرف دو سطریں تحریر کی ہیں۔ اور یہ لکھ دیا ہے کہ ان کا حال "مانند آفتاب عالمتاب روشن اور محتاج بیان نہیں ہے" اور ان کے کلام سے صرف تین شعر نقل کئے ہیں۔[3] شیفتہ کا انداز قاسم کی طرح توصیفی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاعری اور شعراء سے انھیں بہت الفت تھی۔ اشعار جو نقل کئے ہیں، ان میں سے دو قطعہ بند شعر وہی ہیں جو نساخ کے تذکرہ میں موجود ہیں۔[4] "نغمۂ عندلیب" کے مصنف نے محض "گلشن بے خار" کا تتبع کیا ہے اور صرف ایک شعر نقل کیا ہے، جو گلشن بیخار میں موجود ہے۔[5]

---

[1] آب حیات ص ۱۴۳ - ص ۱۴۴

[2] طبقات - ص ۱۴۴

[3] سخن شعرا ص ۳۸

[4] گلشن بے خار ص ۱۵

[5] نغمۂ عندلیب ص ۱۲

شاہ عالم کے کلام میں سب سے زیادہ یعنی (۲۱۲) اشعار قاسم نے نقل کئے ہیں۔ شاہ عالم اپنے زمانے کے بعض سربرآوردہ شعرا کے سرپرست بھی تھے۔

ان کے دربار سے جو شعرا متوسل تھے ان میں سے سوداؔ، میرؔ، شاہ نصیر، اعظم، انشا، قائم، زار، ممنون، فراق اور احسان کا تذکرہ منشی کریم الدین نے کیا ہے۔ لالہ سری رام اور رام بابو سکسینہ نے بھی نام دہرا دیئے ہیں۔

آزاد نے شاہ نصیر کے تذکرہ میں ان کے قطعہ کے دو شعر جو بعوض حسن طلب جاڑے کے موسم میں کہہ کر شاہ عالم کی خدمت میں گزرانا گیا تھا اپنی یاد کی بنا پر "آب حیات" میں نقل کئے ہیں۔ شعر حسب ذیل ہیں:

" بچائے گا تو ہی اے میرے اللہ   کہ جاڑے سے پڑا بے ڈھب ہے پالا
پناہ آفتاب اب مجھ کو بس ہے   کہ وہ مجھ کو اُڑھا دے گا دوشالا [1]

سوداؔ کے حالات کے سلسلہ میں آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ عالم ان سے اصلاح لیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں اپنی عادت کے مطابق انھوں نے ایک لطیفہ بھی لکھا ہے کہ:

" جب (سودا کے) کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم پادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے اور فرمائش کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضہ کیا۔ انھوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا بھئی مرزا! کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو۔ مرزا نے کہا۔ پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے تو دو چار شعر کہہ لیتا ہوں ـــ"

آگے وہ لطیفہ ہے جس کے نتیجہ کے طور پر سوداؔ ناراض ہو کر دربار سے چلے گئے تھے ـــ آزاد لکھتے ہیں:۔

" پادشاہ نے پھر کئی بار بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ، ہم تمہیں ملک الشعرا کر دیں گے۔ یہ نہ گئے۔ اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا اور پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا:۔

" کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے، ڈاواں ڈول" [2]

آزاد اس مخمس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "غور سے دیکھو تو ملک کی دل سوزی میں اپنے وطن کا مرثیہ لکھا ہے ـــ" [3]

حافظ عبد الرحمٰن احسان کے بارے میں منشی کریم الدین کے تذکرہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں کے کلام کی

---

[1] آب حیات ص ۴۹۸
[2] آب حیات ص ۱۴۹
[3] ایضاً

اصلاح ان کے تفویض تھی۔ ان کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

"...... اور قلم اصلاح اشعارات اکثر مرشد زادگان والا تبار و شرفازادگان ذوی وقار پر جاری" [1]

لیکن ہم کو احسان اور شاہ عالم کی مخصوص شعری اور ادبی محفلوں کے بارے میں کچھ مزید معلومات ایک اور کمیاب ماخذ سے حاصل ہوتی ہیں۔ شاہ عالم کے فرزند مرزا معزالدین بھی شاعر تھے اور ثابت تخلص کرتے تھے وہ احسان سے اپنے کلام میں اصلاح لیا کرتے تھے۔ ثابت نے احسان کا دیوان مرتب کیا تھا جس کے دیباچہ میں انھوں نے شاہ عالم کی شعری دلچسپیوں اور احسان کے علم و فضل کے بارے میں کچھ تفصیلات لکھی ہیں۔ اس دیوان کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے [2]

شاہ عالم کی نجی شعری محفلیں دیوان خاص میں منعقد ہوتی تھیں۔ ان کی طرف قاسم نے مجمل طور پر ایک اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"برخے از سخن آرایان سحر بیان بشرف حضور فیض گنجور مشرف می گردند بحکم ارفع و اعلیٰ اقدس بعضے ازاں جادو طرازان ذوی الاختصاص در دیوان خاص بہ وقت معینہ سعادت اندوز خدمت گشتہ (دربہ) دُرریز ہر گونہ اشعار آبدار رشک افروز آں خدیو ہفت کشور می شدند" [3]

اس اجمال کی تفصیل ہم کو مرزا معزالدین ثابت کے دیباچہ "دیوان احسان" میں ملتی ہے۔ شاہ عالم حافظ عبدالرحمٰن کے علم و فضل اور شعری صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ وہ ان کی بہت عزت کرتے اور "حافظ جیو" سے مخاطب کرتے تھے کبھی کبھی اپنے اشعار کو بنظر اصلاح ان سے رجوع بھی کیا کرتے تھے۔

مرزا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی طبیعت تحقیق پسند واقع ہوئی تھی۔ شاہ عالم کے دیوان خاص کی مخصوص شعری محفلوں میں وہ بھی کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔ ان محفلوں کی کچھ تفصیل جو دیوان احسان کے دیباچے میں انھوں نے لکھی ہے، معلومات آفریں بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ مرزا لکھتے ہیں :-

"مجھے فارسی اور اردو شاعری کا شوق بچپن سے تھا، اور اکثر اہل کمال کی صحبت کا متلاشی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایسے استاد سے اصلاح لوں جو مسلم الثبوت ہو یہ خیال ابھی عملی جامہ نہیں پہننے پایا تھا کہ مجھے، ایک دفعہ والد ماجد کی مجلس خاص میں حاضر رہنے کا موقع ہوا۔ حضرت شاہ عالم کی محفل خاص سے مراد یہ تھی کہ اہل مجرئی جب مجرئی کرکے دیوان عام سے رخصت ہو جاتے تھے تو حضرت ظل سبحانی

---

[1] طبقات الشعرائے ہند ص ۳۵ — [2] مخطوطہ ص ۳۳، کلیات دواوین

[3] مجموعۂ نغز ص ۱۸

خاصہ تناول فرما کر دیوانِ خاص میں استراحت کے لئے تشریف لے جاتے، اس وقت حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان موجود رہتے۔ حافظ صاحب، صاحبِ عالم مرزا محمد ایزد بخش بہادر عرف میرزا نیلی صاحب کے اُستاد تھے۔ اعلیٰ حضرت بھی انھیں اپنا استاد کہتے تھے اور ان کے حال پر بے حد عنایت فرماتے تھے۔ حافظ صاحب اپنی اُردو اور فارسی غزلیں سُناتے اور شاہ جم جاہ کو مسرور کیا کرتے تھے۔ خود اعلیٰ حضرت بھی کوئی غزل یا مطلع یا فی البدیہہ مصرع فرماتے۔

ایک روز میں بھی اس محفل خاص میں موجود تھا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا "حافظ جیو، ریختہ میں ایک مصرع موزوں ہوا ہے، دوسرا مصرع فی البدیہہ میرے ذہن میں نہیں آ رہا ہے۔" حافظ صاحب نے عرض کی "مصرع ارشاد ہو" حضرت نے یہ مصرع پڑھا:۔

"صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں"

حافظ صاحب نے بے تامل دوسرا مصرعہ پڑھ کر مطلع مکمل کر دیا۔

"نامناسب ہے میاں وقتِ سحر گاہ نہیں"

اعلیٰ حضرت نے مصرع سن کر تبسم فرمایا اور غزل تکمیل کر لی۔

حافظ صاحب نے بھی ویسے ہی کھڑے کھڑے غزل اس طرح سرانجام کی، گویا پہلے سے کہی ہوئی غزل تھی جو ان کے ذہن میں محفوظ تھی۔ اس موقع پر ابو محمد خاں داروغہ خاصہ اور نور محمد خاں داروغہ توشک چی خانہ بھی موجود تھے۔ سب نے غزل سن کر تحسین کی لیکن مرزا معز[1] کہتے ہیں کہ مجھے حافظ صاحب کے کہے ہوئے مصرعے پر اعتراض تھا۔ میں نے کہا "یا تو وقتِ سحر" ہونا چاہیئے یا "سحر گاہ" لفظ "گاہ" اور "وقت" جو یہاں ایک ہی معنے میں آئے ہیں بے محل ہیں ——

اس پر حافظ صاحب مسکرائے، اور فرمایا کہ "حضرت کو علم شعر سے واقفیت نہیں ہے اور یہ شاعر کامل کی صحبت کے بغیر بہت دشوار بھی ہے ——"

پادشاہ نے بھی ہماری یہ گفتگو سُنی اور مجھ سے فرمایا "حافظ جیو اپنے وقت کے استاد ہیں۔ بغیر جانے یہ لفظ نہیں کہہ سکتے۔"

میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم، یہ لفظ فارسی ہے۔ جب تک کہ ولایت کے کسی مسلم الثبوت استاد نے نہ باندھا ہو، اعتبار نہیں آ سکتا۔"

---

[1] لالہ سری رام نے بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے لیکن انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا اور مرزا معزالدین کا نام بھی نہیں بتایا (ملاحظہ ہو خمخانۂ جاوید ج ۱۰ ص ۱۰۶)

یہ سن کر حافظ جی نے کچھ تامل کیا اور میرزا صاحب تبریزی کا یہ شعر سند کے طور پر پڑھا:-

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

اعلیٰ حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ "ہم نے نہیں کہا تھا کہ ان سے غلطی نہیں ہو سکتی۔" میں نے پھر عرض کی کہ "قبلۂ عالم! یہ شاعر ہیں۔ خود تصنیف کر کے کہہ سکتے ہیں۔ اگر غلام، دیوان صائب میں یہ شعر دیکھے تو اعتبار آئے۔"

پادشاہ کچھ برہم ہوئے اور فرمایا:-

جواب جاہلاں باشد خموشی

مرزا معزالدین لکھتے ہیں کہ دوسرے دن حافظ صاحب نے اساتذہ کے یہ تین شعر اد پڑھ کر سنائے جن میں "وقت سحرگاہ" باندھا گیا ہے۔

حیاتی گیلانی — "فغان بلبل و وقت سحرگاہ — حیاتی و دل نالاں و شبہا"
علی نقی — "وقت سحرگاہ ز خیل دعا — بر سینۂ غصۂ شبخوں زنم"
اشرف قزوینی — "دلبرم وقت سحرگہ بدر خانہ رسید — ہمچو صبح شفق آلودہ رخش تمرخ و سفید"

مرزا معزالدین نے ایک واقعہ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک اور موقع پر اعلیٰ حضرت نے ایک فارسی مصرع کہا تھا۔ (مرزا نے وہ مصرع نقل نہیں کیا) استاد نے ذیل کا مصرعہ فی البدیہہ کہہ کر مطلع مکمل کر دیا:

"نکردم عشق کس ہرگز چو من عاشق سخن باشم"

مرزا معز لکھتے ہیں کہ میں نے آہستہ سے استاد کے کان میں کہا "لفظ عاشق کی اضافت کو کیوں محذوف کر دیا؟" حافظ صاحب نے فرمایا "میں نے درست کہا ہے" — اور سند میں مرزا صائب کے تین شعر سنائے۔

شاہ عالم کی انھیں شعری محفلوں کے سلسلے میں دیوان احسان کے دیباچہ میں ایک اور واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ایک دن پادشاہ نے یہ مصرع موزوں فرمایا:-

خدایا ندارم سوا تو کسے را

لیکن "سوا تو" کی ترکیب پر شاہ عالم کو اطمینان نہیں تھا۔ استاد سے پوچھا کہ "یہ ترکیب درست ہے یا نہیں؟" کچھ لوگ جو حاضر خدمت تھے۔ کہنے لگے — "سوا تو درست ہے۔" پادشاہ نے فرمایا "میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔"

حافظ جی نے جواب دیا "پیر و مرشد درست ہے۔" پھر شانی تکلو کا یہ شعر سند میں فرمایا:-

من جاں ندہم بکس سوا تو — تو دل نہ دہی بکس سوا من

اور مرزا معزالدین کی طرف متوجہ ہو کر کہا "یہ بھی اگرچہ درست ہے، لیکن میرے خیال میں فصاحت سے بعید ہے۔"

مذکورہ بالا تفصیلات سے جو کہیں اور دستیاب نہیں ہوتیں شاہ عالم کی شعری اور علمی دلچسپیوں پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔

ناول اور افسانے سے پہلے اُردو میں قصہ نگاری

اختر انصاری

اُردو ناول کا آغاز انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ہوا۔ اور یہ دراصل ایک پہلو تھا اُس ادبی نشاۃ الثانیہ کا جس کی رہبری اِس زمانہ میں سرسید اور اُن کے رفقا کر رہے تھے۔ مولوی نذیر احمد کے پہلے ناول مراۃ العروس کے ساتھ جنم لینے کے بعد ناول نگاری کی تحریک نے دہلی اور لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں میں ابتدائی نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ نذیر احمد، سرشار، شرر، اور رسوا کی فتوحات سے گزرتی ہوئی یہ تحریک بیسویں صدی میں داخل ہوئی تو حالات نے مختصر افسانہ نگاری کو جنم دیا، اور اُس وقت سے اب تک ناول اور مختصر افسانہ ہمارے ادب کے دو متوازی دھارے ہیں، اور قصہ نگاری کے دو منفرد اسلوب ہیں جو روشناسِ خاص و عام ہیں۔

اِس ضمن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناول اور مختصر افسانے سے پہلے اُردو میں قصہ نگاری کا انداز کیا تھا۔ اور اگر قصہ نگاری کے مختلف رُوپ رائج تھے تو اُن کی کیا نوعیت تھی؟ ظاہر ہے کہ ناول اُردو میں قصہ نگاری کا پہلا رُوپ نہیں تھا۔ یقیناً ناول سے پہلے بھی اُردو ادب قصے کہانی کی صنف سے آشنا تھا۔ دُنیا کا کوئی ادب تحریر و تسوید کی منزل میں داخل ہونے کے بعد زیادہ دنوں تک افسانوی آرٹ سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ یوں دیکھا جائے تو افسانوی آرٹ اتنا ہی پُرانا ہے جتنا انسان کا احساسِ فن اور جذبۂ تخلیق و اظہار۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کا فنی احساس سب سے پہلے رقص کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ رقص کو فنونِ لطیفہ کا اوّلین سرچشمہ خیال کیا گیا ہے۔ مصوری، نقش گری اور بُت تراشی کے فنون اسی سرچشمے سے برآمد ہوئے۔ یہ تمام فنون — رقص اور اُس کی ذرّیات — قدیم اور وحشی انسان کے شدید جذباتی دباؤ کے تحت وجود میں آئے۔ ترسیل، ابلاغ اور اظہار اِن کی علّتِ غائی تھی۔ ربط، تناسب، توازن اور ہم آہنگی کے احساس کو ایک سے دوسرے تک پہنچانے میں مدد دینا اِن کا کام تھا۔ اگر انسان اِن کے ذریعے کچھ کہتا تھا — اگر یہ انسان کے لئے کچھ کہنے کا کامیاب وسیلہ تھے — تو اساساً یہ کہانی کے ذیل میں آئیں گے۔ غرض یہ کہ کہانی ایک طرح سے فنونِ لطیفہ کی اصل ہے اور ہر فنی تخلیق کی روح و رواں ہے۔ دُنیا کے کسی بھی ادب میں آغازِ کار سے اِس کا وجود ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ اِس بنیادی حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں اِس سوال کا جواب فراہم کرنا ہے کہ ناول سے پہلے اُردو نثر کے وہ کون سے پہلو اور اجزا تھے جن کا تعلق قصے کہانی کی صنف سے تھا اور اُن کی کیفیت و نوعیت کیا تھی؟ اِس مطالعہ سے ضمناً یہ حقیقت بھی

واضح ہو جائے گی کہ اُردو ناول کی صنف کس پس منظر میں اُبھری اور اُس کا خمیر کن عناصر سے اُٹھا۔

سب سے پہلے ہمیں اُردو نثر کے آغاز اور ابتدائی نشو و نما پر نظر ڈالنی ہوگی۔ گیارھویں صدی میں مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ شمالی ہندوستان میں وہ اثرات داخل ہوئے جو آگے چل کر ایک نئی مخلوط زبان (اُردو) کی پیدائش کا سبب بنے مگر یہ امر حیرت انگیز ہے کہ گیارھویں صدی سے اٹھارویں صدی کے آغاز تک شمالی ہندوستان کی لسانی و ادبی تاریخ مختلف زبانوں کی آمیزش کے علاوہ کوئی دوسرا کارنامہ پیش نہیں کر سکتی۔ اِس طویل مدت کے دوران میں خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ نثر (۱۳۰۸ء)، افضل جھنجھانوی کی مثنوی، اور خالق باری کے علاوہ نظم و نثر کی کسی دوسری تصنیف کا جو شمالی ہندوستان میں سرانجام کی گئی ہو، ثبوت نہیں ملتا۔ یہ تینوں مذکورہ کتابیں بھی ادبی تبرکات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اِن میں خالق باری تو کچھ بہت زیادہ پرانی کتاب نہیں۔ اِس کو مدتوں حضرت امیر خسرو کی تصنیف خیال کیا جاتا رہا، لیکن حال کی تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ یہ امیر خسرو کا کارنامہ نہیں، بلکہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں خسرو نامی کوئی بزرگ تھے جن کی یہ تصنیف ہے۔ چنانچہ اس کو نظر انداز کرنے کے بعد باقی دو کارنامے، یعنی خواجہ اشرف کا رسالۂ نثر اور افضل جھنجھانوی کی مثنوی زمانے کے اعتبار سے بے شک اتنے قدیم ہیں کہ اُن کی بنا پر شمالی ہندوستان کو تصنیف و تالیف کے باب میں یا نظم و نثر کی ایجاد کے بارے میں اوّلیت کا شرف ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اُردو نظم و نثر میں تصنیف و تالیف کے ابتدائی کام کا جہاں تک تعلق ہے اُس کا سہرا دکن کے سر ہے۔

شمالی ہندوستان کی نئی مخلوط زبان جو آگے چل کر اُردو کہلائی اور جو ابھی محض بول چال کی زبان تھی، علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کی فوجوں کے ساتھ چودھویں صدی میں دکن پہنچی اور ہندی اور دکنی کے ناموں سے موسوم ہوئی۔ اس کا خمیر کھڑی بولی اور ہریانی سے اُٹھا تھا جو مغربی ہندی کی دو اہم شاخیں اور دہلی و نواحِ دہلی کی عوامی بولیاں تھیں۔ مغربی ہندی کی ایک اور شاخ برج بھاشا کے بھی کچھ اثرات اِس میں شامل تھے۔ یوں یہ ایک کھچڑی زبان تھی جو کھڑی بولی، ہریانی، برج بھاشا، ترکی، فارسی، عربی اور دکنی کے عناصر سے مل کر بنی تھی۔ اِس نوزائیدہ زبان نے دکن میں بڑی سُرعت کے ساتھ ترقی کی اور چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک نظم و نثر کی سینکڑوں کتابیں اور رسالے اِس زبان میں لکھے گئے۔ یوں تاریخی اعتبار سے چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کا زمانہ اُردو نثر کا پہلا دَور قرار پاتا ہے جس کا تعلق دکن سے ہے (چودھویں صدی سے پہلے اُردو نثر کا سُراغ نہ دکن میں ملتا ہے نہ شمالی ہندوستان میں)۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نثر کے اِس اوّلین دَور کی تصانیف کی کیا نوعیت تھی۔ نیز یہ کہ اِن تصنیفات میں قصے کہانی کے قبیل کی چیزیں بھی تھیں یا نہیں؟ اور اگر تھیں تو کس حیثیت اور معیار کی؟

اِس طویل مدت میں نثر کی جو بے شمار کتابیں دکن میں لکھی گئیں اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اُن میں سے اکثر کتابیں دینی اور مذہبی نوعیت کی تھیں اور حدیث و فقہ، سیرت و تفسیر اور اخلاق و تصوّف

جیسے موضوعات سے متعلق تھیں۔ قصّے کہانیوں کی کتابیں اُن میں بہت کم تھیں۔ سب رس اور طوطی نامہ جیسی چند داستانوں کے علاوہ یہ سارا نثری ادب غیر افسانوی تھا۔ پھر جو گنتی کے چند افسانے ملتے ہیں وہ بھی مقصدی اور تبلیغی ہیں اور اخلاقی، روحانی صداقتوں کو پیش کرنے یا مذہبی عقیدوں کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ گویا اس دَور کے قصّہ نگاروں کے نزدیک تبلیغی مقصد اصل چیز تھی اور افسانوی پیرایہ محض ایک ذریعہ تھا اور ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ الغرض دکن کا افسانوی ادب مقدار کے لحاظ سے بھی بہت معمولی تھا اور کیفیّت و فنیّت کے اعتبار سے بھی ادنیٰ درجے کی چیز تھا۔ اب اگر ہم اِس کا سبب جاننا چاہیں تو ہمیں اُن مخصوص حالات کی چھان بین کرنی ہو گی جن میں اُردو زبان اور اُس کے ادب کا آغاز ہوا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کسی زبان اور اُس کے ادب کا ارتقا اُس زبان کے بولنے والوں کے ذہنی اور تمدّنی ارتقا کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھاتا ہے۔ اور ارتقا کا یہ عمل صدیوں پہ پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اُردو زبان و ادب کے حدوث و آغاز میں اور پھر اُس کے نشو و ارتقاء میں اِس اصول کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ کہ اُردو زبان اکثر دوسری زبانوں کی طرح حیاتیاتی ضروریات کی بنا پر وجود میں آنے کی بجائے ایک تمدّنی ضرورت کے طور پر وجود میں آئی۔ جو لوگ اس کو وجود میں لائے وہ ذہنی اور تمدّنی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھے۔ اُن کے ذہنی سرمائے اور تمدّنی ورثے میں متعدد ترقی یافتہ زبانیں (ترکی، عربی اور فارسی ایک طرف، اور سنسکرت اور جدید آریائی زبانیں دوسری طرف) اور اُن کا ادب شامل تھا۔ انھوں نے اُردو زبان اور اُس کے ادب کو دو قوموں، دو تہذیبوں اور دو تمدّنوں کے درمیان ایک واسطے کے طور پر، ایک وسیلۂ اظہار اور ایک مشترک پلیٹ فارم کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اُن کا مقصدِ اصلی ایک تہذیبی نظام کی قدروں کو دوسرے تہذیبی نظام تک پہنچانا تھا۔ اور اِسی کا نتیجہ تھا کہ اُردو زبان میں بجائے اِس کے کہ عام قاعدے کے مطابق پہلے شاعری وجود میں آتی، پھر جذباتی یا شاعرانہ نثر، اور پھر غیر جذباتی یا علمی نثر، سب سے پہلے علمی نثر وجود میں آئی اور شاعری یا افسانے وغیرہ کی حیثیت ثانوی قرار پائی۔

اِس تجزئے کی روشنی میں ہم بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کے دکنی ادب میں قصّوں اور کہانیوں کی بہ نسبت علمی، مذہبی اور اخلاقی تصانیف کی تعداد اِس قدر زیادہ کیوں ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اِس دَور میں قصّے کہانیوں کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ تقریباً سب دوسری کتابوں سے ترجمے تھے۔ اِس دَور کی افسانوی تصانیف میں طبع زاد قصّوں کا پتا نہیں چلتا، اور اِس کا سبب بھی وہی تھا جو اُوپر بیان ہوا۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں اُردو نظم و نثر کا مرکزِ ثقل دکن سے شمالی ہندوستان منتقل ہو جاتا ہے۔ دکن میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے، مگر اب اُس کی ادبی اہمیت ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ شمالی ہندوستان کا روزمرّہ دکنی محاورے کے مقابلے میں اُردو کے طبعی مزاج سے زیادہ قریب تھا جس کی بنا پر شمالی ہندوستان پہنچنے کے بعد زبان نے صفائی اور پختگی کی منزلیں غیر معمولی تیزی کے ساتھ طے کیں۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے وسط سے

انیسویں صدی کے وسط تک اُردو نثر تعمیر و ارتقا کے متعدد منازل و ادوار سے گزری مگر قصہ نگاری کے لحاظ سے ہم اِس پورے زمانے کو ایک ہی دَور قرار دے سکتے ہیں۔ اور اُس کے بعد ہمارا کام یہ دیکھنا ہوگا کہ اِن سَو سالوں میں قصہ نگاری کا کیا حال رہا۔ انیسویں صدی کے وسط کو ایک اہم سنگِ میل خیال کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب اور پھر سرسید اور اُن کے رفقا کی ادبی مساعی کا وہ زرین دَور شروع ہو جاتا ہے جس میں اُردو نثر وصفی اور مقداری دونوں حیثیتوں سے اِتنی آگے نکل گئی کہ آج بھی اُس دَور کو اُردو نثر کا سنہری زمانہ کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ اُردو ناول کا آغاز بھی اِسی دَور میں ہُوا۔ اِس لئے قدرتی طور پر انیسویں صدی کا وسط ہمارے موجودہ مطالعے کی آخری حد ہے۔

تو اب ہمیں اٹھارویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک کی افسانوی تصانیف کا جائزہ لینا ہے، اِس جائزے کو بڑی آسانی کے ساتھ چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وھُوَ ھٰذا

(۱) اٹھارویں صدی کے شمالی ہندوستان میں نثر کی جو کتاب سب سے پہلے ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہے وہ فضل علی فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا ہے جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی، اور مُلا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے لیکن دہ مجلس، مُلا وجہی کی سب رس کی طرح، اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسی چیز ہے جس کو صحیح معنوں میں افسانوی ادب خیال نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں تو میر محمد عطا حسین خاں تحسین کی نوطرز مرصّع سے دوچار ہوتے ہیں، جو اِس دَور کی اہم ترین نثری تصنیف ہے۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۷۷۵ء ہے۔ پھر چونکہ دہ مجلس کوئی افسانوی کارنامہ نہیں، اور دکن کے نثری ادب کے جائزے میں ہم پہلے ہی یہ دیکھ چکے ہیں کہ چودھویں سے اٹھارویں صدی تک کے طویل زمانے میں دکن نے ایک تصنیف بھی ایسی پیش نہیں کی جس کو حقیقی معنوں میں افسانہ کہا جا سکے، اس لئے نوطرز مرصّع اُردو کی پہلی افسانوی تصنیف قرار پاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ اٹھارویں صدی کی تنہا افسانوی تصنیف بھی ہے۔ اٹھارویں صدی کا پورا ادب جو میر، درد، اور سودا جیسے بلند مرتبہ شاعروں کی غزلوں، میر اثر اور میر حسن کی بلند پایہ مثنویوں اور فضلی، سودا، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کی نثری کارگزاریوں پر مشتمل ہے، نوطرز مرصّع کے علاوہ قصّے کہانی کی کوئی دوسری کتاب اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ (اُردو نثر کی ارتقائی تاریخ میں فضلی کی دہ مجلس کے بعد سودا کا وہ اُردو دیباچہ آتا ہے جو انھوں نے اپنے مرثیوں کے دیوان پر لکھا۔ دیباچۂ سودا کے بعد نوطرز مرصّع کا نمبر ہے، اور آگے بڑھیے تو دو نثری کارنامے، قرآنِ کریم کے دو ترجموں کی شکل میں ہمیں ملتے ہیں جو شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کی کوششوں سے علی الترتیب ۱۷۸۶ء اور ۱۷۹۰ء میں سرانجام ہوئے۔)

(۲) لیکن اٹھارویں صدی میں جس چیز کی اتنی کمی نظر آتی ہے، انیسویں صدی میں اُس کی فراوانی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اُردو نثر پر بھی وہی بہار آ جاتی ہے جو اُردو شاعری پر بہت پہلے آ چکی تھی۔ اور نہ صرف یہ کہ نثر کی بے شمار اہم تصانیف وجود میں آتی ہیں بلکہ یہ کہ زیادہ تر قصّے کہانیوں ہی کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں نثر نگاروں کا ایک جھرمٹ نظر آتا ہے۔ اور یہ سب لکھنے والے داستان یا افسانے ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ ان

کے کارنامے اتنے معروف ہیں کہ کسی تفصیلی ذکر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ میر امن کی باغ و بہار، بہادر علی حسینی کی نثرِ بے نظیر اور اخلاقِ ہندی، حیدر بخش حیدری کا قصۂ لیلیٰ مجنوں، طوطا کہانی اور آرائشِ محفل، مظہر علی خاں ولا کا مادھونل اور کام کندلا، ہفت گلشن اور بیتال پچیسی، شیخ حفیظ الدین کی خرد افروز، خلیل علی خاں اشک کی داستانِ امیر حمزہ، کاظم علی جوان کی شکنتلا، نہال چند لاہوری کی گل بکاؤلی یا مذہبِ عشق، بینی نرائن جہاں کی چار گلشن، اور للّو لال جی کی سنگھاسن بتیسی کو خاص طور پر قابلِ ذکر خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب قصّے کہانیوں کی کتابیں ہیں جن کی اصل سنسکرت، فارسی اور ہندی کا افسانوی ادب ہے۔

(۳) اسی زمانے میں جب فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا، ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں لوگ انفرادی طور پر اُردو نثر لکھنے میں مصروف تھے۔ کالج سے باہر جن لوگوں نے اُردو نثر کی رفتار کو تیز کرنے کی کوششیں کیں اُن کی فہرست طویل ہے اور اُن کے کارنامے کثیر التعداد ہیں۔ مگر قصہ نگاری کے سلسلے میں صرف دو نام قابلِ ذکر ہیں، انشاء اللہ انشا اور مرزا رجب علی بیگ سرور۔ انشا نے رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی لکھی، اور اس التزام کے ساتھ لکھی کہ "ہندی چھٹ اور کسی بولی سے ہٹ نہ ملے"۔ سرور نے جو اگر دیکھا جائے تو لکھنؤ کے سب سے پہلے مصنّف نثر ہیں، کئی قصّے اپنے مخصوص رنگین و پُر تکلف اسلوب میں لکھے، یعنی فسانۂ عجائب، سرورِ سلطانی، شررِ عشق اور شگوفۂ محبت۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اِن میں فسانۂ عجائب کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو ادب کے ارتقائی سفر میں باغ و بہار کے بعد فسانۂ عجائب دوسرا اہم سنگ میل ہے، لیکن اس کی اہمیت زیادہ تر اس بنا پر ہے کہ اس نے افسانوی اسلوب کو واضح طور پر آگے بڑھایا، اور اپنی ہیئت، ساخت اور مواد و موضوع کے بعض عناصر کی مدد سے جدید ناول کی پیدائش کے لئے راہ صاف کی۔

(۴) پھر اسی زمانے میں، یعنی سن ستاون سے پہلے اُردو کا داستانی ادب وجود میں آیا۔ الف لیلہ، بوستانِ خیال، داستانِ امیر حمزہ اور اسی نوع کی دوسری داستانیں جو سینکڑوں جلدوں پر مشتمل اور ہزارہا صفحات کو محیط ہیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے باغ و بہار، آرائشِ محفل اور فسانۂ عجائب وغیرہ سے مختلف ہیں، مگر حجم و ضخامت میں اِن سے کئی کئی گنا بڑی ہیں۔ یہ کارنامے طلسماتی اور عجائباتی ہونے کی بنا پر تو حیرت انگیز ہیں ہی۔ لیکن وسیع و عریض ہونے کی بنا پر بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ یہ صحیح معنوں میں عظیم الہیئت کارنامے ہیں اور پیچ در پیچ و طول طویل تخیلات کی تخلیقات معلوم ہوتے ہیں۔

یہ ہے ایک سرسری جائزہ اٹھارویں صدی کے وسط سے اُنیسویں صدی کے وسط تک کے قصّوں اور داستانوں کا۔ اِس ایک صدی میں اُردو نثر نے اپنے ارتقا کی کئی منزلیں طے کیں، مگر جیسا کہ اُوپر کہا گیا، قصّے کہانی کے ارتقا کے لحاظ سے یہ ایک ہی دَور قرار پاتا ہے، کس واسطے کہ اِس زمانے میں قصّے کہانیوں کی جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ سب مشترک خصوصیات کی حامل ہیں۔ وہ خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) زبان اور محاورۂ زبان کا انداز قدیم ہے، جو باغ و بہار اور فورٹ ولیم کالج کی دوسری تصانیف میں سادگی و سلاست کی راہ متعین کرتا ہے، اور بطرز مرصع، فسانۂ عجائب اور اس رنگ کی دوسری تصانیف میں شاعرانہ صنعت گری

رنگین عبارت آرائی اور پُر تصنع قافیہ پیمائی کی فرسودہ روش کو زینت بخشتا ہے۔

(۲) افسانہ نویسی قدیم داستان گوؤں کی نہج پر ہے۔ ایک بنیادی قصے کے ضمن میں متعدد دوسرے قصوں کا لانا، بے شمار واقعات کا مسلسل بیان، کردار نگاری کا فقدان، پلاٹ کا ڈھیلا ڈھالا پن، غرضیکہ قدیم داستان گوئی کے سب انداز ان تصانیف میں پائے جاتے ہیں۔

(۳) اکثر قصوں میں فوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے۔ عقل سوز اور بادہوائی باتیں اور بعید از قیاس اور دھڑتے کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ زندگی کے حقائق سے روگردانی اور سماجی واقعیت سے گریز و فرار دانستہ طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اور تخیل کو بدمستی اور بدہضمی کے مظاہروں کے لئے آزاد و بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۴) گو اکثر قصوں کے واقعات اردگرد کی حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے، تاہم بعض قصوں میں وقت کے رسم و رواج، مشاغل و معمولات اور روایات و معتقدات کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں، مگر یہ چیز بالکل اتفاقی ہوتی ہے اور کسی شعوری کوشش یا مقصدی رجحان کی پیداوار نہیں ہوتی۔

(۵) تقریباً تمام قصے فارسی، عربی، ہندی یا سنسکرت سے ترجمے ہیں۔ طبع زاد افسانہ نگاری اس دور میں عنقا ہے۔

اس نہایت مختصر مطالعے میں ہم نے کم و بیش پانچ سو برس کی اردو تصانیف نثر پر نظر ڈالی، اور ان میں افسانوی کارناموں کا کھوج لگایا۔ ہم نے دیکھا کہ جس چیز کو صحیح معنوں میں قصہ و افسانہ کہتے ہیں اس کا ثبوت صدیوں تک اردو نثر میں نہیں ملتا۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں تحسین کی نوطرز مرصع کے ساتھ اردو قصہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر نوطرز مرصع کے زمانے سے ناول کے آغاز تک قصے کہانی کے ہزاروں بلکہ لاکھوں صفحات لکھے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں سے لے کر ضخیم سے ضخیم داستانوں تک ہر رنگ، ہر معیار اور ہر اسلوب کے کارنامے وجود میں آتے ہیں، جن میں بہت سی خصوصیات مشترکہ طور پر بھی پائی جاتی ہیں۔

اس ایک صدی کے اندر قصے کہانیوں کی جو سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں ان میں باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ موجودہ دور میں بھی باغ و بہار اپنے اسلوب کی بے مثل سادگی کی بنا پر زندہ ہے، اور فسانۂ عجائب اس لئے اہمیت رکھتی ہے کہ مقامی رنگ کی عکاسی، کردار نگاری اور ماحول کی مصوری کی سب سے پہلی کوشش اسی میں نظر آتی ہے، اور قصہ گوئی کے وہ اوصاف جو دراصل ناول کے لوازمات ہیں، ابتدائی شکل میں ہمیں یہیں ملتے ہیں۔ اسی اعتبار سے فسانۂ عجائب قدیم طلسماتی داستانوں اور دورِ جدید کے ناولوں کے درمیان کی کڑی قرار پاتی ہے ؎

مغرب کے بہترین مختصر افسانے

محمد احسن فاروقی

مختصر افسانہ ازل سے چلا آرہا ہے۔ مگر فن کی حیثیت سے اسے سب سے پہلے امریکن مصنف اڈگار آلین پو (ADGAR ALLEN POE) نے برتا۔ چنانچہ جب آج ہم مختصر افسانے کی اصطلاح کسی فن پارے کے لیے استعمال کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارا خیال پو ہی کی طرف جاتا ہے۔ پو سے لے کر اب تک مختصر افسانے نے بہت رنگ بدلے مگر اس کا بنیادی تصور وہی رہا جو پو (POE) نے اپنے عمل اور اپنے تنقیدی اظہار کے ذریعہ پیش کیا تھا "بہترین" کا لفظ اشتہاروں۔ امتحان کے نتائج اور گھوڑ دوڑ سے مناسبت رکھتا ہے۔ مگر تنقید میں بھی اسے استعمال کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہاں اس کے معنی وہ چیز ہو جاتے ہیں جو زیادہ تر صاحبان ذوق نے پسند کی اور پسند کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی فرد یا نقاد نے جس چیز کو سب سے زیادہ پسند کیا ہو۔ مگر یہ فرد واحد اس کی پسند اگر محض ذاتی ہے تو کوئی معنی نہیں رکھتی اور اگر یہ پسند بہترین مذاق سے ہم آہنگ ہے تو بڑی وقعت کے قابل چیز ہے۔ اسی لحاظ سے اگر پو کو بہترین افسانہ نگار کہا جائے گا تو یہ کسی ایک فرد کی ذاتی رائے ہو گی۔ لیکن اگر بہترین افسانہ نگاروں میں سے کہا جائے تو جو شخص اس رائے سے اتفاق نہ کرے وہ غلطی پر ہو گا۔ اس سے آگے بڑھ کر بھی "بہترین" کے ایک معنی ہیں۔ اس سے مطلب ادب کا وہ مقام عالم یا دائرہ ہے جس میں پہنچ کر ہر صنف کی چیز چاہے وہ ڈرامہ ہو ناول ہو، مختصر افسانہ ہو، نظم ہو یا مضمون ہو اپنی ایک ایسی نئی دنیا بناتے ہیں جو دائمی اور آفاقی ہوتی ہے یعنی ہر مقام اور ہر زمانے کے لیے دلکش ہوتی ہے۔ ہر صنف کے الگ اصول بنانے اور ان کے مطابق کسی چیز کو جانچنے کا قاعدہ ارسطو کے وقت سے چلا آرہا ہے اور بہترین کا لفظ ہر صنف کے اس نمونہ پر استعمال ہوتا ہے جو اصول کو برتنے میں اعلیٰ کامیابی پر نظر آئے۔ مختصر افسانہ کے اصول پو نے ہی قائم کر دیئے تھے اور ان کی تحلیل کر کے اب بہت سی اصطلاحیں بنا لی گئی ہیں جن پر پورے اترنے والے افسانوں کو بہترین کہہ دیا جاتا ہے۔ اس معنی میں بہترین مختصر افسانوں کی تعداد اگر گنائی جائے تو میدان حشر کا سماں بندھ جائے۔ مگر بہترین ادب اصول کی پابندی کرتے ہوئے اصول سے اوپر نکل جاتا ہے۔ اس وقت اس کو ایسے نام جیسے الہام۔ کمال۔ انسپیریشن وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ کیا مقام ہے۔ پہنچنے والے اسی تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ نہیں محسوس کرتے کہ وہاں کیسے پہنچے۔ کوشش یا تدبیر کے پر جلتے ہیں۔ اس سعادت بزور بازو نیست۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ اس عالم کا پتہ سب بڑے شاعر بڑے ناول نگار، بڑے مضمون نگار، بڑے افسانہ نگار دیتے ہیں۔ بہترین افسانہ وہ ہے جو اس عالم میں پہنچے جس کی خبر رومی نے یوں دی ہے ؎

ہمہ آفتاب بینم۔ ہمہ آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

غرض پو کے ساتھ بہترین افسانہ نگاروں میں اس کے ہم وطن ہوتھورن۔ برٹ ہارٹ، او ہنری کے نام بھی ضرور لیے جائیں گے۔
ان کے ساتھ یورپ کے ہر ملک کے بہترین افسانہ نگار بھی شامل کر لیے جائیں گے۔ روس سے چیکاف اور گورکی۔ انگلینڈ سے اسٹیونسن — کیتھرین مینسفیلڈ۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو جیکبز۔ فرانس سے موپساں کا نام بھی بہترین افسانوں کے مجموعوں میں نظر آئے گا۔ ان میں سے پانچ بہترین بلاشبہ پو، ہوتھورن، موپساں، چیکاف اور کیتھرین مینسفیلڈ ٹھہریں گے۔ موپساں اور چیکاف کو بہترین کہا جائے گا اور بہت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو چیکاف کو بہترین کہیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں جو بہت بڑے ناول نگار تھے اور اسی حیثیت سے معروف رہیں گے مگر ان میں سے قریب قریب سب نے کم از کم ایک تو ایسا افسانہ ضرور چھوڑا جو بہترین افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ اسکاٹ۔ ٹھیکرے، ڈکنس، بالزاک۔ ٹولسٹوئے۔ ڈوستوفسکی۔ ترجنیف۔ ہارڈی وغیرہ کے بھی کسی نہ کسی افسانے کو بہترین کے دائرے میں لانا ہی پڑتا ہے۔ مگر ان کی مختصر افسانوں میں کامیابی کو اتفاقی ہی کہنا بہتر ہے کیونکہ اصل میں یہ بڑے ناول نگار ہیں اور ناول نگاری کا فن مختصر افسانے نگاری کے فن کا بہت کچھ متضاد ہے۔ مگر اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص زیادہ تر ناول لکھتا رہا مگر اصل میں اسکی فطرت مختصر افسانہ نگاری ہی کی تھی اور اس لیے اس صنف میں اس نے ایک آدھ ایسے عظیم شاہکار چھوڑے جو بہترین میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں میں ہربرٹ جارج ولز کا نام خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے اور اس کا افسانہ "دی کنٹری آف دی بلائنڈ" مختصر افسانہ نگاری کی بہترین مثالوں میں آجانا ضروری ہے۔ بیسویں صدی میں افسانے کو بڑا فروغ حاصل ہوا جس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ ماہنامے وغیرہ خریدتے تھے اور ان میں مختصر افسانوں ہی کی گنجائش تھی۔ اس لیے ہر ملک اور ہر ادب میں کثرت سے لوگ ملتے ہیں جو زندگی بھر افسانہ نگار رہے ان میں کچھ ایسے ضرور ہیں جن کے مختصر افسانوں میں سے کچھ بہترین میں آجاتے ہیں۔ ٹامس مَن کا "کلین ہر فرائیڈمان" سارترے کا "لا مور" کافکا کا "دی ہنگر آرٹسٹ"۔ لیوگی پرانڈیلو کا "دی رزرو ڈ کافن"۔ ایوان بونن کا "دی جنٹلمین فرام سنفرانسسکو" جیمس جوائس کا "کونٹر پارٹس" ہنری جیمس کا "دی لائر"۔ ڈی۔ ایچ لارنس کا "دی کیپٹنس ڈول"۔ ارنسٹ ہمنگوے کا "فرانسس میکومبر" فالکنر کا "اے روز فار ایملی" اسٹیفان ژوئگ کا "دی ایوزیبل کلیکشن" کو بہترین میں شامل کرتے ہوئے کوئی نقاد نہ جھجکے گا۔

اب اگر سوال ہو کہ ان پانچ بہترین افسانہ نگاروں کا جن کے میں نے اوپر نام لیے کون سا افسانہ بہترین ہے تو جواب میں ہر فرد ایک الگ افسانے کا نام لے گا۔ ان لوگوں کے افسانے زیادہ تر بہترین کے دائرے ہی میں آجاتے ہیں اور اس لیے کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ پھر بھی مجموعوں میں بہترین کا تعین کیا ہی جاتا ہے۔ پو کو سب سے پہلے میں نے سنہ ۲۹ء میں پڑھا تھا۔ اس وقت میرے ایک استاد نے بتایا تھا کہ اس کا سب سے بہتر افسانہ "دی پٹ اینڈ دی پنڈولم" ہے۔ تیس برس میں مجھے اس رائے کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ بہت سے عالموں اور افسانہ نگاروں کی رائیں میں نے دیکھیں جنھوں نے اس افسانے کو نہ صرف پو کا سب سے زیادہ نمائندہ افسانہ کہا بلکہ دنیا کے بہترین افسانوں میں سے مانا۔ یہاں افسانہ نگاری کی قیامت برپا نظر آتی ہے۔ قصہ ہیرو خود بیان کر رہا ہے۔ وہ ایک پرانے زنداں کے گڑھے میں رسی سے جکڑا ہوا پڑا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ ہر قسم کے کیڑے اور خاص طور سے بڑے بڑے چوہے اس کے جسم سے چپٹے ہوئے ہیں۔

ایک آرا لنگر کی طرح ہلتا ہوا رفتہ رفتہ اتر رہا ہے۔ یہ ہیرو کے جسم سے قریب آگیا ہے اور اب اسے کاٹ ہی دے گا۔ ہیرو کے بیان کا ہر لفظ اوہ کمال کا تجسس پیدا کرتا ہے جو قصہ گوئی کی جان ہے۔ ہیرو کے جسم کا کٹ جانا یقینی ہے۔ قصہ کا موت پر ختم ہونا یقینی ہے مگر قصہ واحد متکلم کے صیغے میں بیان ہو رہا ہے۔ ہیرو بچ ضرور گیا۔ کیسے بچا؟ کیسے بچ سکتا تھا؟ آخری جملہ تک گہرا تجسس سنسنی خیز تجسس قائم رہتا ہے۔ آخری جملہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دروازہ کھلا اور یہ معلوم ہوا کہ قلعہ دشمنوں نے فتح کر لیا ہے۔ قصہ پن کی یہاں حد ہو گئی ہے۔ دھیان کو جذب کرنے کا کمال ہو گیا۔ پھر یہ پورا سماں کائنات کی ایک آفاقی تصویر ہے۔ مجبور انسان۔ سزا اور ظلم اور آخر میں غیبی مدد ان دائمی قدروں کی کارگزاری کا اثر ایک محض نقطہ پر لا کر اس طرح جما دیا گیا ہے کہ افسانہ بہترین شعر سے ٹکر لیتا ہے مگر پھر بھی وہ بہترین افسانہ ہی ہے یعنی قصہ گوئی کا کمال یعنی ایک واحد واقعہ کا اس طرح بیان کہ دل کی ہر دھڑک یہ پوچھے کہ آگے کیا ہوا۔ پو ایک حد تک پاگل تھا۔ اسے اندھیرے تکلیف بھید۔ تصوف سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کی انفرادیت اس افسانے میں مکمل طور پر نمایاں ہے۔ قصہ اس کا اپنا ہے مگر وہ اس مقام پر ہمیں پہنچاتا ہے جہاں اس کے قصے کی کڑی آفاقی سے ملتی ہے۔ یہ قصہ ہمارا قصہ بھی ہے۔ ہر انسان کا قصہ بھی ہے۔ قصہ کو جتنے دفعہ پڑھئے اتنا ہی تجسس میں اضافہ ہوتا ہے۔ حالانکہ پہلے بار پڑھ کر یہ معلوم ہو چکا ہوتا ہے کہ آخر میں کیا ہوا۔ پو تخیل کی دنیا میں ہمیں لے جا کر گم کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز معنی خیز ہے۔ ایک محض سنسنی خیز واقعہ دائمی حقیقت کا نقشہ بھی ہو گیا ہے۔ اور فن کا مکمل کرشمہ بھی۔

اس قصے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کمال پر پہنچ کر ہر اصول آپ سے آپ برت جایا کرتا ہے۔ کہنے کو مختصر افسانے میں ایک واقعہ ایک کردار کا ایک پہلو۔ ایک حقیقت۔ ایک معنے اور ایک اثر ہونا چاہیئے مگر ان عناصر کے ساتھ ساتھ اگر اس میں خواب اور حقیقت کا وہ امتزاج نہیں جو ادب کی جان ہے تو وہ ادبی افسانہ نہ ہو گا۔ حقیقت کا وجود قرین قیاس تجربہ کو سامنے لاتا ہے خواب کا وجود گہرائی فضا اور معنی پیدا کرتا ہے۔ بہترین افسانوں میں دونوں عناصر کا وجود کسی معجزے کے ماتحت ایسے آہنگ میں آجاتا ہے کہ حدیث خواب آفتاب کی روشنی میں منور نظر آتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ بہترین افسانوں میں ایک اشاریت ملتی ہے جو قصہ کو تمثیل بنا دیتی ہے۔ اس معنی میں ہوتھورن کے بہترین افسانے بہترین شاہکار ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا افسانہ "رپاچینیز ڈاٹر" لے لیجئے۔ یہ ایک جوان طالب علم کی محبت کا قصہ ہے جو ایک سائنسدان کی لڑکی پر عاشق ہے۔ یہ لڑکی ایک باغ ہی میں نظر آتی ہے جس میں اس کے باپ نے مقید کر دیا ہے۔ باپ نے یہاں زہریلے پھول لگا رکھے ہیں۔ جوان عاشق باغ میں کسی طرح پہنچ جاتا ہے۔ اس پر پھولوں کے زہر کا اثر ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف لڑکی کے جسم سے اثر دور ہو جاتا ہے اور وہ مر جاتی ہے۔ یہ باغ جنت کا اشارہ ہے۔ باپ شیطان ہے جس نے اپنے ضرورت سے زیادہ علم یعنی گناہ سے زہر پھیلا رکھا ہے لڑکی حوا اور لڑکا آدم ہے۔ اخلاقی قدروں کا وہ دائمی کھیل جو ہمیشہ سے چل رہا ہے یہاں ایک نئے واقعہ سے اس زور کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ صبح الست سے روز قیامت مل جاتا ہے

ہوتھورن مدرس اخلاق تھا اور امریکی پیورٹانزم کے اس فرقہ کا فرد تھا جو ایک مخصوص مذہبی اور اخلاقی رجحان رکھتے ہیں۔ اس نے اپنے افسانے درس اخلاق ہی کے لیے لکھے اور اخلاق عموماً حق کی طرفداری میں حسن کا قاطع ہوتا ہے مگر جس طرح جس آفاقی درجہ پر یہ افسانہ ہے وہاں حسن و حق ایک ہو گئے ہیں۔ قصہ کو پیوریٹان مذہب کا پروپاگنڈہ بھی کہہ سکتے ہیں مگر اس میں وہ پیوریٹانیت جو ہر مذہب کا جزو ہوتی ہے اور انسانی نفسیات کی لافانی حقیقت ہے۔ اخلاقی اثر کی مثال اسٹیونسن کا افسانہ "مرکھم" بھی ہے جس میں ایک شخص ایک رئیس مد کاندار کو قتل کرنے کے بعد اپنے ضمیر سے لڑتا ہوا نظر آتا ہے اور آخر میں اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے اپنے کو دوکاندار

کی ذکرنی کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہاں "مرکم" کے دو نفس برابر جھگڑ رہے ہیں۔ اس کے کردار کی تشریح ہمارے سامنے آتی جاتی ہے۔ تمام دلچسپی تمام سنسنی تمام معنی تمام وعظ اسی میں ہے۔ قیامت سامنے ہے حساب ہو رہا ہے۔ آخر میں نیکی غالب آتی ہے اور بدی سزا کو پہنچتی ہے۔ مذہب سے زیادہ نفسیات سامنے آتے ہیں مگر مذہب و اخلاق بھی تو نفسیات کے جزو ہی ہیں۔ گناہ ایک تکلیف کا نام ہے اور اس کا شروع اگر ہوتھورن کے افسانے میں ہے تو حشر اسٹیونسن کے افسانے میں۔ ٹولسٹوے کے "تھری آرجنس آف لینڈ" کی عظمت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ یہ انسانی کوشش کی تصویر ہے۔ ہیرو پوکھام لالچ میں آکر زیادہ سے زیادہ زمین دن بھر میں گھیر کر مقررہ رقم پر حاصل کرنے کی جہت میں سرگرداں ہے۔ اس کے عزم اور اس کے استقلال میں محض لالچ ہی نہیں ہے۔ انسان کی پوری روح اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ قصہ الف لیلوی ہے اور اسی انداز میں بیان ہوتا ہے۔ مگر رومانی تاثرات واقعاتی تاثرات کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں اور جذبات کے ساتھ طنز اس طرح کھیلتا ہے کہ کہانی زندگی کا مکمل ترین نقشہ ہو جاتی ہے۔ پوکھام آخر میں پہاڑی سے پھسل کر مرجاتا ہے اور زمین آرچی زمین پر اس کی نعش دفن کر دی جاتی ہے۔ لالچ کا یہ نتیجہ ہے ٹولسٹوئے یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ انسان برائی کے ہاتھ بک گیا ہے مگر قصہ اس سبق سے بالاتر ہے۔ تمثیل فلسفہ، فن، محض سنسنی خیز قصہ گوئی سب مل جل کر ایک عجیب آہنگ کے ساتھ معمار ازلی کے بنائے ہوئے اس انسان کا مکمل نقشہ کھینچ گئے ہیں جس میں ہر اچھی بُری قدر موجود ہے اور جس کا خاتمہ موت ہے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ دنیا کا سب سے بہتر افسانہ کون ہے؟ تو چاہے لوگ مجھ سے اتفاق نہ کریں مگر میں یہی کہوں گا کہ موپساں کا ہے کو لیجئے "دی نکلیس"۔ شاید ہی کوئی افسانہ ایسا ہو جو زندگی کی اتنی زبردست تصویر کھینچتا ہو۔ اب تک ہم نے جن افسانوں کا ذکر کیا ان میں عظمت ہے مگر عظمت کے ساتھ اس کا بھاری پن بھی ہے۔ موپساں کے افسانے میں عظمت۔ واقعیت۔ درد و غم۔ حماقت۔ لطیف طنز کے ساتھ اس طرح مل گئی ہے کہ افسانہ میں ایک عجیب نزاکت عجیب باریکی اور عجیب کیف ہے۔ فرانسیسی نسائیت آفاقی نسائیت کی روح اس افسانے میں اسی حماقت اور اسی نزاکت کے ساتھ آئی ہے جو خالق نے اس کا حق و حصہ رکھا ہے۔ طاہرہ مثلاً فرانسیسی عورت ہے جو بال و ڈانس اور اپنے کو سجانے اور بڑے لوگوں سے ملنے میں اپنی زندگی کا حاصل دیکھتی ہے مگر اصل میں یہ فطرت ہماری ہے کہ دنیا کی ہر عورت کی ہے۔ یہ فطرت اس خود پسندی لاپرواہی ناقص العقلی کی بنیاد ہے جس کا نتیجہ جنت سے نکالا جانا ہے۔ قصہ مثلاً کی ایک کلرک کے گھر میں زندگی سے شروع ہوتا ہے۔ اسے ایک رات ایسی میسر آجاتی ہے۔ جس میں اونچی سوسائٹی میں ناچنے کی خوشی حاصل کرتی ہے مگر اس خوشی کے بعد ہی وہ نکلیس کھو جاتی ہے جس کی قیمت ادا کرنے میں دس برس کی مصیبت اور تمام حسن و تندرستی کام آجاتی ہیں۔ نازک نسائیت کے جذبات سے شروع ہو کر یہ افسانہ غم و اندوہ کے عالم میں آجاتا ہے معلمین اخلاق مصائب کو موت پر ختم کرتے ہیں۔ جیسے ٹولسٹوے۔ ہوتھورن۔ اسٹیونسن نے کیا۔ مگر موپساں۔ لوفر، بے یقین۔ بے دین موپساں زندگی کو تمام قدروں سے بالاتر دیکھ رہا ہے۔ مثلاً ایک غلطی سے سب کچھ کھو بیٹھتی ہے مگر آخر میں اسے سب ہی کچھ واپس مل جاتا ہے۔ زندگی یا کائنات کا اصول سزا دینا ہے مگر ایسی نہیں جیسی کہ معلمین اخلاق اور مفتیان قانون دیتے ہیں۔ وہ سزا کے بعد ایک عجیب رحم دکھاتا ہے جو سزا کو بھی رحم و کرم کا حصہ ثابت کر دیتا ہے۔ مجھے اس قصہ کو پڑھ کر ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس سادگی جس روانی کے ساتھ موپساں ایک نقطہ کے ذریعہ کائنات کی حقیقت تک پہنچا ہے وہاں تک کوئی اور افسانہ نگار پہنچ ہی نہیں سکتا۔ یہ قصہ فن کاری کا بھی کمال ہے کیونکہ اس کی سادگی میں فن اس طرح پنہاں ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے افسانہ نگار واقعیت کو خواب کی دنیا میں لے جاتے ہیں موپساں خواب کو حقیقت کی

دنیا میں لاتا ہے اور اس کے ذریعہ حق کا وہ نقشہ دکھاتا ہے جس میں ایک رحمدل آسمانی باپ اپنی بچی کو جھڑک کر پھر پیار کرتا ہے۔ ہر طرح یہ افسانہ تمام افسانوں پر بھاری ہے۔ اس کو دنیا کا بہترین افسانہ کہہ کر قارئین کو میں نے چونکا دیا مگر میری ان سے التجا ہے کہ ذرا غور کر کے دیکھیں کہ یہ افسانہ حقیقت کی گہرائی اور خواب کی اونچائی میں کہاں تک جاتا ہے۔ اگر یہ معراج پر نظر نہ آئے تو میری رائے کو رد کر دیں۔

گر موپساں کے ساتھ ساتھ چیکاف کو بھی اعلیٰ ترین مقام پر رکھے بغیر نہیں رہا جاتا۔ چیکاف کا کون افسانہ بہترین ہے، سب ہی بہترین ہیں۔ یہ چیز ہی اور ہے۔ یہ غنائی نظمیں ہیں جن میں موڈ۔ فضا۔ آہنگ۔ راگ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ناول کمیڈی اور ایپک کا امتزاج تھی۔ روسی ناول نگاروں نے اسے پوری "جدید ایپک" بنا دیا۔ افسانہ غنائی نظم کا عنصر رکھتا تھا۔ روسی افسانہ نگاروں نے اس عنصر کو کمال پر پہنچا دیا۔ چیکاف کا وہ افسانہ جس کو میں ذاتی طور پر بہترین کہنا چاہتا ہوں "لاسیگیل" ہے۔ یہاں بھی ایک سنڈرا کی طرح کی اولگا ہے۔ اس کی جذباتیت اور ناقص العقلی کی تخلیق افسانے میں ہوتی ہے۔ مختلف موڈ ہمارے سامنے چمکتی ہوئی تصویروں کی طرح گزرتے ہیں۔ محبت۔ خوشی۔ رنج۔ نامیدی۔ امید۔ تھکن سب کے رنگ آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر چڑھاؤ پہ ایک قوس قزح بنتی ہے اور بگڑ کر رہ جاتی ہے۔ قصہ کے کسی ٹکڑے کو الگ کرنا یا اختصار کے ساتھ قصے کو پھر سے بیان کرنا ناممکن ہے۔ افسانے کی سرخی ایک مخصوص کیڑے کا تصور لاتی ہے جو ہمارے جھینگر کی طرح عجیب راگ میں گاتا ہے۔ اس کیڑے کے گیت کی فضا یہ افسانہ ہے۔ اولگا کی شادی ہوئی ہے۔ اس کا شوہر ڈیموف ایک معمولی انسان ہے جو اولگا کے دوسرے دوستوں کے درمیان بالکل چھپ جاتا ہے۔ خاص طور سے مصور رباؤ باؤسکی کے مقابلے میں تو کچھ نہیں ہے۔ مگر کچھ دن میاں بیوی خوش رہتے ہیں۔ پھر اولگا اور ریاؤ باؤسکی کا رومان دریائے والگا کی لہروں پر کھیلتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ ڈیموف نے سائنس میں بڑے ایجادات کیے ہیں مگر اولگا کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ریاو باؤسکی کا ایک عورت سے تعلق کھل جاتا ہے۔ ڈیموف نے ایک طرح پر اپنے کو مار ڈالنے کی ترکیب کر لی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ اب اولگا کی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ "دیواریں، چھت، لیمپ، قالینیں طنزیہ طریقہ پر آنکھ مار کر اس سے کہتے ہیں۔ تم نے اس کو ہاتھ سے نکل جانے دیا" اولگا ہی افسانے کا مرکز ہے اور اس کی وہ چیز جسے ناقص عقلی کہتے ہیں سیگیل کے راگ کی طرح ناچتی ہوئی اپنے اختتام تک پہنچتی ہے۔ بار بار یہ راگ خواب کی دنیا میں جاتا ہے اور بار بار خواب کی دنیا ٹوٹتی ہے۔ حقیقت اور خواب آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ ایک فضا بن جاتی ہے۔ ایک نئی دنیا چیکاف کی نئی دنیا۔ ایک عورت اپنے لیے حسین اور موزوں اور دلچسپ اور باعزت ساتھی کی تلاش میں پھر رہی ہے۔ یہ اسے مل چکا ہے۔ اس کے پاس ہے۔ مگر وہ اسے جب دیکھتی ہے جبکہ وہ کھویا جا چکا ہے۔ واقعات۔ بیانات۔ فکر۔ تبصرہ حیات سب ایک راگ ایک تواتر کے ماتحت آکر ایک عجیب فضا بنا گئے ہیں۔ ٹولسٹوے ناول نگار کو ایپک شاعری کے درجہ پر لے گیا۔ چیکاف مختصر افسانے کو غنائی شاعری بنا گیا۔ موپساں واقعیت کے کمال پر ہے چیکاف واقعیت کو حدیث خواب بنا دینے کے کمال پر۔

بیسویں صدی کے مختصر افسانوں میں ویلز کے "دی کنٹری آف دی بلائنڈ" کو بڑا اونچا مقام ملنا چاہیئے۔ شاید ہی کوئی ایسا افسانہ ہو جو ایک دنیا اور اس کے گوناگوں اشخاص کو اس کمال کے ساتھ ایک نقطے پر لے آتا ہو۔ ایک آدمی ایک دنیا میں پہنچتا ہے جہاں سب اندھے ہیں۔ ان کی حرکات ان کی قدریں سب سننے اور چھونے کے احساسات پر مبنی ہیں۔ ایک دیکھنے میں حسین عورت کو کوئی نہیں پوچھتا کیونکہ چھونے میں اس کی کھال سخت ہے۔ ہیرو اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کے ساتھ شادی کرنے پر اس شرط سے تیار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے جسم پر سے وہ چیزیں کٹوا دے جن کو وہ آنکھیں کہتا ہے۔ عشق ایک طرف اور آنکھوں کا خیال دوسری طرف ہیرو کے دل میں ایک خاص کشمکش پیدا

کرتا ہے۔ آخر کو آنکھیں زیادہ پیاری پاکر وہ اس دنیا سے بھاگ جاتا ہے۔ جدید دور اور اس میں چشم مینا کی حیثیت کا یہ افسانہ نہایت دلکش آفاقی تمثیلی تصویر پیش کرتا ہے۔ ویلز کے سے ناول نگاروں میں سے ڈی۔ ایچ۔ لارنس۔ ہنری جیمس، جیمس جوائس انگلستان سے فالکنر اور ہمنگوے امریکہ سے، سارترے فرانس سے۔ زویگ اور مَن جرمنی سے بہترین افسانوں کی مثالیں ضرور پیش کرتے ہیں۔ جرمنی ناول نگاری کے میدان میں سب سے پیچھے رہی مگر اب زور کے ساتھ آگے آرہی ہے۔ مَن ناول نگاری اور افسانہ نگاری دونوں میں کمال دکھاتا ہے۔ اس کا افسانہ "کلپین ہر فریڈمان" نہ صرف اس کا بہترین بلکہ جدید دور کے بہترین میں سے ہے۔ جدید دور کے تمام افسانہ نگاروں کی دلچسپی اندرونی نفسیات میں ہے اور سب ان نظریات سے متأثر ہیں جو نفسیات کے سائنس سے آجکل وابستہ ہیں۔ اس معنے میں مَن کا افسانہ مثالی ہے۔ مگر اس میں کمال یہ ہے کہ نفسیاتی نظریہ اور خاص طور پر فرائڈ کا نظریہ اس میں اس طرح غائب ہو گیا ہے کہ واقعات اور حرکات ہی نظر آتے ہیں اور ہمیں اس عالم میں لے جاتے ہیں جو بہترین ادب کا عالم ہے۔ جدید نفسیات داں یہ کہیں گے کہ اس افسانے میں "اڈ" اور "ایگو" کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ یورپ کی قصہ گوئی سے واقف کار لوگ یونانی ڈرامے تک پہنچ کر فریڈمن کے کردار میں وہ چیز کارفرما دیکھیں گے جسے ارسطو نے "ہیوبرس" کہا ہے۔ مَن خود نے اپنے عمل کو فرائڈ ہی کی اصطلاحوں سے واضح کیا ہے۔ مگر یہ افسانہ ان سب سے بالاتر ہے۔ ایک معمولی آدمی کا قصہ پیدائش سے لیکر موت تک نہایت سیدھے انداز میں بیان ہوتا ہے۔ جوان ہو کر فریڈمن نے ایک عشق بازی کا منظر دیکھنے کے بعد اپنے نفس پر پورا قابو رکھنے کی ٹھانی ہے مگر ایک شادی شدہ عورت فراؤ فان رنلنگن سے ملاقات بڑھنے پر وہ بے قابو ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور جوابی حملے سے گر کر پھر اُٹھ نہیں پاتا بلکہ پیٹ کے بل کھسکتا ہوا جا کر پانی میں گر جاتا ہے۔ مَن نے اپنے ایک لکچر میں کہا "میں نفسیاتی تحلیل کے پاس نہیں گیا۔ وہ میرے پاس آئی" اور اس لکچر میں وہ اس افسانے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دائمی قصہ گویوں کی طرح پیدائشی نفسیات داں ہے۔ جدید دور کے اثر نے اسے اپنے تجربات کو ادا کرنے والی اصطلاحیں دے دی ہیں۔ فریڈمن کا قصہ دائمی قصہ ہے جسے جدید نفسیاتی زبان میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اس کے "ایگو" نے خواہش کی دنیا کو حقیقی دنیا سمجھا۔ عام زبان میں یوں کہیئے کہ وہ خواب کی دنیا میں گم رہا اور آخر کو کنوئیں میں گر گیا۔ خواب اور حقیقت کا امتزاج اور ان دونوں کے درمیان کشمکش جو جدید دور کے حالات نے اہم کر دی ہے۔ اس قصہ میں آفاقی درجہ پر آجاتی ہے۔

جن مصنفین نے محض افسانہ نگاری ہی میں اپنی زندگی گزار دی ان میں دو نام بہت مخصوص ہیں۔ ایک ڈبلیو ڈبلیو جیکبز جس کا ایک افسانہ "منکی پاؤ" ضرور بہترین کے دائرے میں آتا ہے۔ چاہے جیکبز کو ہم بہترین افسانہ نگاروں میں نہ لا سکیں۔ یہاں قصہ ایک بندر کے پنجے کا ہے جس کو ہاتھ میں لے کر تین دعائیں مانگی جا سکتی ہیں۔ جن صاحب کے یہ پاس ہے وہ ایک بڑی لاٹری کو حاصل کرنے کی دعا مانگتے ہیں۔ لاٹری مل جاتی ہے مگر فوراً ہی ان کے لڑکے کی موت کی خبر آتی ہے۔ وہ لڑکے کے زندہ ہو جانے کی دعا مانگتے ہیں۔ لڑکے کا بھوت دروازے پر آجاتا ہے، سارا گھر عجیب وحشت کے عالم میں پڑ جاتا ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ لڑکے کے چلے جانے کی دعا مانگیں۔ تینوں دعائیں یوں ختم ہو جاتی ہیں۔ خواہش حقیقت اور اتفاق کا نقشہ پیش کرنے میں یہ افسانہ کمال پر پہنچا ہے۔ مافوق البشر امور فطری امور سے یا نفسیات انسانی سے اس درجہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں کہ قاری تعجب کے معراج پر پہنچ جاتا ہے۔ "تعجب" کا سماں شاید ہی کسی افسانے میں اس سے بہتر کھنچا ہو۔ دوسرا نام کیتھرین مینسفیلڈ کا ہے جس کو ہم پانچ بہترین افسانہ نگاروں میں اوپر گنوا چکے ہیں۔ یہ نیوزیلینڈ کی رہنے والی تھی اور انگلستان میں مشہور نقاد جان مڈلٹن مرے کی بیوی تھی۔ اس کی عمر نے وفا نہیں کی۔ افسانہ نگاری میں اس نے جو کچھ چھوڑا ہے وہ عظیم ترین افسانہ نگاروں کے کارناموں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔

کچھ ہی عرصہ ہوا جب ایک دوست کے یہاں بہترین افسانہ نگار اور بہترین افسانوں کی بات چیت چھڑی۔ میں نے کیتھرین مینسفیلڈ کا نام لیا پھر یہ سوال ہوا کہ اس کا بہترین افسانہ کونسا ہے۔ کچھ دن مطالعہ کے بعد میں نے "گارڈن پارٹی" چھانٹا اور اس کا ترجمہ کرکے ایک رسالے میں دے دیا کیتھرین مینسفیلڈ کے افسانوں میں نسائیت کا یعنی ہر صفت کا جس کو ہم عورتوں سے منسوب کرتے ہیں جیسے باریک بینی نزاکت۔ پردہ داری۔ لطافت۔ حسن کمال ملتا ہے۔ ہر افسانہ دل میں ایک خاص لہر پیدا کرتا ہے جو ادبی فنکاری کے کمال ہی میں محسوس ہوتی ہے۔ "گارڈن پارٹی" کو میں نے اس لیے سب پر ترجیح دی کہ اُس نے خود اور اس کے میاں نے اسی افسانہ پر اپنے مجموعے کا نام رکھا۔ قصہ ایک گھر کا ہے جہاں گارڈن پارٹی کے سامان میں سب لڑکیاں مصروف ہیں۔ انتظامات شاندار ہو رہے ہیں۔ اس گھر سے دور نشیب میں غربا کے گھر ہیں جن میں ایک گاڑی چلانے والا کچل کر مر گیا ہے۔ گارڈن پارٹی کی خوشی ایک گھر میں اور موت کا غم دوسرے گھر میں عجیب لطیف تضاد کے ساتھ ملنے تنے جاتے ہیں۔ گارڈن پارٹی میں کھانے کا سامان بہت بچا ہے۔ اس کا آخر میں یہ مصرف ہوتا ہے کہ ایک لڑکی یہ سب سامان لے کر غریب کے گھر جاتی ہے۔ یہ سامان اس غریب کی موت کے کھانے کا سامان ہو جاتا ہے۔ قصہ میں کیا ہے؟ اس کے خلاصے میں نزاکت ختم ہو جائے گی۔ اس کو پورا کا پورا تصور کیجئے۔ اس کی تحلیل میں تنقید کا قلم سرگرداں ہو جائے گا اس کا بس ترجمہ کر لیجئے۔ مگر انگریزی سے اردو میں ترجمہ بہت سے ان لطیف فقروں کا خون کرے گا اور ان تیز نشتروں کی باڑھ لگا دے گا جو اس افسانے کی جان و روح کا حصہ ہیں۔ واقعہ نہایت عام اور نہایت عامیانہ ہے۔ جذبات نہایت معمولی ہیں۔ اخباری واقعیت پر قصہ کی تمام بنیاد ہے۔ عام نگاہ کو کوئی قصہ بھی نہ دکھائی دے گا۔ بازاری قصے پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ مگر چشم بینا رکھنے والے یہاں عظیم ترین بات کو لطیف ترین جامہ میں جلوہ گر دیکھیں گے۔ عورتوں کی تصانیف ہیں مردوں کی تصانیف سے مختلف دنیا میں لے جاتی ہیں۔ یہ کشیدہ کاری کی دنیا ہے مگر اس کا اس سے تعلق اور تخیل کی دنیا میں مقام مسلم ہے۔ یونانی علم اصنام میں بے زبان پراکنی نے اپنا قصہ ایک جال سے بُن کر اپنی بہن فلومیلا کو دکھایا تھا جس پر اس کی بہن آگ ہو گئی تھی۔ کیتھرین مینسفیلڈ کے قصے پراکنی کے جال کی طرح ہیں۔ گارڈن پارٹی جدید دور کی خفی کشیدہ کاری یعنی ادبی کشیدہ کاری کا کمال ہے۔ کشیدہ کاری قصہ گوئی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ چھوٹی سی چیز بھی وہیں وہیں پہنچا دیتی ہے جہاں سے غالب فرماتے ہیں۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

سب سے آخر میں میں گورکی کا ذکر کرتا ہوں۔ اس کو بھی ان پانچ افسانہ نگاروں میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کو میں نے اوپر بہترین کہا ہے۔ مگر اس کو ان سے اسی طرح الگ رکھنا ضروری ہے جیسے کہ ٹولسٹوئے کو کیونکہ وہ ناول نگار، مفکر، نقاد بھی اتنا ہی زبردست ہے جتنا کہ وہ افسانہ نگار ہے۔ اس نے جس صنف کو اٹھایا اسے اپنی انفرادیت سے بھر دیا۔ اس کا افسانہ "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" بہترین کے اس دائرے میں آ جاتا ہے جو میں نے قائم کیا۔ یہاں چھبیس مرد ایک قید میں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ سب ایک ہی آدمی ہیں۔ ان کی محض ایک دلچسپی ہے یعنی ایک جوان ہوتی ہوئی لڑکی ٹینا۔ چھبیس آدمیوں کو اس لڑکی کی نیکی اور عصمت پر اعتبار ہے۔ یہی ان سب کا کردار ہے۔ لڑکی خود بالکل معصوم ہے۔ مگر ایک سپاہی جس کا شوق عورت بازی ہے۔ ان سب مردوں سے شرط لگاتا ہے کہ وہ ٹینا کو خراب کر دے گا۔ قصہ کا تجسس سپاہی اور ٹینا کی کشمکش بھی ہے۔ ٹینا اور سپاہی ایک شیڈ میں جاتے اور وہاں سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھبیسوں آدمیوں کی اُمید ٹوٹ جاتی ہے۔ ٹینا سے وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ٹینا اب معصوم نہیں رہتی بلکہ بدزبان ہو جاتی ہے۔ وہ سب

یہ طے کرتے ہیں کہ اسے کبھی نہ دیکھیں گے "یہ کبھی نہیں" پر نعرہ ختم ہو جاتا ہے۔ جنسیاتی محرک کی اس سے بہتر تصویر کسی افسانے میں نہیں ملتی۔ نیکی و بدی۔ محبت و نفرت کی کشمکش کا اتنا لطیف نقشہ کسی افسانے میں نہیں ملتا۔ اس مختصر افسانے کے اندر ایک کائنات ہے جو نیکی پر ایمان کر رہی ہے۔ مگر اس میں ایک بدی کا نمائندہ داخل ہوتا ہے اور نیکی کے اس بت کو جس کی سب پوجا کر رہے تھے توڑ ڈالتا ہے۔ وہ بت بھی اب بت نہیں رہ جاتا ہے بلکہ ایک ڈھیر نظر آتا ہے جس کی صورت اب بڑھیا کی صورت ہے۔ کائنات اس سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ نیکی پر عقیدہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ افسانہ عقیدے اور حقیقت کی اس کشمکش کا بھی نمونہ ہے جو گورکی نے روس میں دیکھی۔ اس کا بھی جو سارے یورپ والے اپنے ماحول میں دیکھتے ہیں اور اس کا بھی جو ہر مقام کا انسان ہمیشہ اپنے ماحول میں دیکھتا رہے گا۔ حقیقت اور دھوکا جس طرح ازل سے چل رہے ہیں اور ابد تک چلتے رہیں گے اس کی نہایت وسیع صورت اس چھوٹے سے ظرف میں اتار کر رکھ دی گئی ہے۔ غزل کی طرح مختصر افسانہ بھی ظرف تنگنائے ہے مگر اس میں بھی بہترین مثالیں اس کی وسعت کو کائنات کی وسعت کر دکھاتی ہیں۔ اس عمل کی بہترین مثالوں میں گورکی کا یہ افسانہ بھی ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

دعوتِ خیر

جوشؔ ملیح آبادی

بادل اُمڈے ہیں دَل کے دَل
جیسے دمن کی دُھن میں نل
اور کہہ رہا ہے برمحل
ساقی، بہ آوازِ دُہل
رُت ہے جواں گھر سے نکل
حی علیٰ خیر العمل
حی علیٰ خیر العمل

ہر شور ہے اک زیر و بم
ہر ذرّہ ہے اک جامِ جم
ہر قطرہ، ہر اک موجِ یم
ہر سنگ اک بیت الصنم
ہر فقرہ اک ضرب المثل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

ہر گام اک غلطاں محن
ہر سانس اک جولاں چبھن
لیکن نہ گھبرا یارِ من
غم کی دوا ہے بانکپن
تو زندہ ہے، دنیا زحل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

دوشِ ہوا پر بوئے مے
رُوئے سماعت سُوئے نَے
زرّیں سبُو میں غرق ہے
فرِّ کیانی، تاجِ کَے

تو بھی شہانہ چال چل
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

ہاں! عقل کا دشمن نہ بن
اس رُت میں اور حرفِ کہن
ناداں! بجائے چھن چھنن
پیشِ غزالانِ چمن

افسانۂ جنگ و جمل
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

یہ ڈولتی رنگیں فضا
یہ کڑکتے ارض و سما
یہ ناچتی بھیگی ہوا
یہ بولتی کالی گھٹا

یہ جھومتے دشت و جبل
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

ہاں بحر و بر کی جان ہے
لعل و گہر کی جان ہے
شمس و قمر کی جان ہے
عمرِ خضر کی جان ہے

یہ ایک ساعت، ایک پل
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

رقصاں ہیں ترکانِ جواں
گوہر فروش و گل چکاں
ہر لمحہ اک موجِ رواں
ہر عشوہ اک نہرِ جناں
ہر چہرہ اک بیت الغزل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

پیرِ مغاں فرماں روا
موجِ ہوا رایت کشا
قُل قُل نقیبوں کی صدا
مینا اٹھائے ہے عصا
گردوں لیے ہے مورچھل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

اوجِ فضا پر ہاؤ ہو
فوجِ ادا میں خوب رُو
موجِ غنا میں "اشربو"
غلطاں زمیں پر کو بکو
مستی کے اسباب و علل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

آ، خلدِ صہبا میں در آ!
تانیں اڑا، ساغر اُٹھا
کیا خوف، کیسا دغدغہ
اس وقت تو دُھومیں مچا
کل آئے گی، آئے اجل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

آ، حلقۂ سنبل میں آ
کاشانۂ تلقل میں آ
دولت سرائے گل میں آ
دار القضائے مُل میں آ
اے بستۂ ردّ و بدل
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

ساحل کا حسن اترتا ہُوا
"کوکو" میں اک محشر بپا
"پی ہو" کی رَو میں زلزلا
مدہوش ہے ابر و فضا
خودمست ہے حسنِ ازل
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

یہ بحر و بر، یہ آسماں
یہ ماہ و خور، یہ فرقداں
یہ سرو گل، یہ بوستاں
یہ نجم و قوس و کہکشاں
یہ سب ہیں دریا، تو کنول
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

اے مہ جبین و سیم بر
آنکھیں اٹھا، پیمانہ بھر
ہاں جھن جھنا و بام و در
اے زندگی، لچکا کمر!
اے چشمۂ صہبا، اُبل
حیّ علےٰ خیر العمل
حیّ علےٰ خیر العمل

اے غنچۂ خاطر، چٹک
اے شاخِ جولانی، لچک
اے کشتِ سرشاری، لہک
اے دل باسوئے گردوں ہمک

اے بحر، ساحل پر مچل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

دانا ہے جو خوش خوش جیا
خود پر نہ غم طاری کیا
برخیز و بجز دستش و بیا
بجھنے نہ دے دل کا دیا

پڑنے نہ دے تیوری پہ بل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

شاخِ جوانی پر جھک
دنیا کو دامن سے جھٹک
انگڑائی لے بن جا دھنک
مستی کے جھونکوں میں چھلک

ہستی کے شعلوں میں نہ جل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

تو عرش کا ہے مدعا
تو فرش کا حاجت روا
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

اے عقل کے شعلے، بھڑک
اے وہم کے شیشے، درک
اے حزن کے سائے، سرک
اے خوف کے اژدر، دبک
اے موت کے لوہے، پگھل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

اُٹھ! مے کدے کی جان بن
ارض و سما کی آن بن
ذوالقدر بن، ذی شان بن
تا چند یہ جنگ و جدل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

لعل و دُر و شمس و قمر
غیب و شہود و بحر و بر
ان سب میں اے اہلِ نظر!
صرف آدمی ہے معتبر
باقی ہیں سب لات و ہُبل
حیّ علیٰ خیر العمل
حیّ علیٰ خیر العمل

نذرِ فن کارانِ وطن

احمد ندیم قاسمی

یہ نظم گذشتہ اگست کے آغاز میں مکمل ہوئی اور ۱۴ر اگست کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئی۔ اسی دوران میں ڈھاکہ سے ایک ادبی رسالہ "قلمکار" کے اجرا کی اطلاع ملی تو میں نے یہ نظم وہاں بھجوا دی۔ اب تک یہ رسالہ شائع نہیں ہوا اور نہ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ کب شائع ہو رہا ہے۔ سو یہ نظم "نقوش" کی نذر ہے

کیوں تیرگیٔ ذہن کا الزام خدا پر
تو خود ہی دھواں بن کے مسلط ہے فضا پر
خوابوں کی یہ باتیں ہیں کہ جب ظلمتِ شب میں
مشعل کا گماں تھا تری ایک ایک صدا پر
جب نشۂ تخلیق میں تو نے کبھی دیکھا
پھولوں کے سفینے تھے رواں موجِ صبا پر
اب تک ہیں مجھے تیرے خیالوں کے سفر یاد
جلتے تھے دیے جب ترے نقشِ کفِ پا پر
دریوزۂ جذبات کے باوصف۔ بظاہر
صرف اپنی لکیریں تھیں ترے دستِ دعا پر
یہ ذہن کے فردوس ترے فن کے نشاں تھے
یہ بھی کبھی دیکھا کہ قدم تیرے کہاں تھے؟

اس شان سے بدلا ہے چلن عصرِ رواں کا
اب چاند بھی اک پھول ہے گلزارِ جہاں کا

تقدیر کے روکے بھی ابد تک نہ رُکے گا
انساں ہے اب اک تیرِ مشیت کی کماں کا
اب فاصلے کچھ ہیں تو روایاتِ کہن ہیں
اب حدِ نظر پر بھی گماں ہے رگِ جاں کا
اس درجہ بصارت کے افق پھیل گئے ہیں
تاروں پہ بھی دھوکا ہے رُخِ برق وشاں کا
وہ دل کا پھپھولا ہو، کہ داغِ رُخِ خورشید
محتاج ہے فن کار کی چشمِ نگراں کا
گو وقت شب و روز کے چکر میں رواں ہے
جب بھی نظر اُٹھتی ہے گجر دم کا سماں ہے

رہ رہ کے مجھے اب یہ خیال آنے لگا ہے
صدیوں کے اصولوں کو زوال آنے لگا ہے
مرمر کے دریچوں پہ ہیں ظلمات کے پہرے
مٹی کے گھروندوں پہ جمال آنے لگا ہے
ہے دھول سے لبریز اُدھر ساغرِ جمشید
گردش میں اِدھر جامِ سفال آنے لگا ہے
بہتر ہے کہ انجم حدِ امکاں سے نکل جائیں
انساں کو مقدر پہ جلال آنے لگا ہے
کیا خلد کی میراث پہ کچھ حق نہیں میرا؟
آدم کے لبوں پہ یہ سوال آنے لگا ہے
سوئی ہوئی کس دُھن میں تری غیرتِ فن ہے؟
جاگا ہوا انساں بھی تو موضوعِ سخن ہے!

○

احمد ندیم قاسمی

گل ترا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاروں میں

مجھ سے کترا کے نکل جا، مگر اے جانِ حیا
دل کی لَو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں

حسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غنچے کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں

ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے بعنوان جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں

زخم چھپ سکتے ہیں، لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی ہے شامل مرے شہکاروں میں

منتظر ہیں کہ کوئی تیشۂ تخلیق اٹھائے
کتنے اصنام ابھی دفن ہیں کہساروں میں

مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

غلام ربانی تاباں

کھو گئے ہم مگر تری راہ گزر نہ مل سکی
غم کو اثر نہ مل سکا شب کو سحر نہ مل سکی

ہوش و خرد کو پھونک دے ایسی نظر نہ مل سکی
خرمنِ آرزو کو اک موجِ شرر نہ مل سکی

اہلِ ہوس کو دولتِ سوزِ جگر نہ مل سکی
جام پہ جام تو ملے پیاس مگر نہ مل سکی

محو کیا تھا اس قدر ساقیٔ خوش نگاہ نے
بادہ کشوں کو فرصتِ کیفِ اثر نہ مل سکی

سوختہ قسمتوں کی اور بڑھ گئیں نارسائیاں
نکہتِ گل کا ذکر کیا بادِ سحر نہ مل سکی

محوِ تلاش ہی رہی دشتِ جنوں میں آگہی
گمشدگانِ عشق کی گرد مگر نہ مل سکی

بزمِ سخن میں اور بھی اہلِ کمال تھے مگر
رنگِ جگر* نہ پا سکے طرزِ جگر* نہ مل سکی

* جگر مراد آبادی مرحوم

ہیولیٰ

مجید امجد

برگ و بَر پر، — بام و دَر پر — برف برف
کوئی نگری، کوئی نگری، برف . . . برف!
زرد سورج — سیمگوں میداں — رپہلی سیڑھیاں،
سیڑھیوں کی مَوج اندر مَوج ڈھلوانوں پہ چہرے، جُھنڑ جُھنڑ،
سیڑھیوں پر، سَو قمر قوس آئینوں کی اوٹ اوٹ،
منتظر نظروں کی دُنیا، عکس عکس!

کتنے رنگوں سے، جو زیبِ دامنِ احساس تھے،
بھر گئے تھے، سیڑھیوں تک راستے،
جانے کس کے واسطے!

ساز جاگے ، پھول برسے ، اک نوا !
اک صدا ، جیسے سلگتی چاہتوں کے دیس سے آتی صدا ،
اک صدا ، جیسے زمانوں کے اندھیروں میں صدا دیتی وفاؤں کی صدا
—— اک صدا ، جیسے مرے دل کی صدا !

لے تھمی اور نغمہ گر کا پیکرِ بے جاں گرا ،
سیڑھیوں سے آسماں کی ٹوٹتی محراب تک ،
بکھرے پھولوں کی چٹختی پنکھڑیوں پر تیز قدموں کی دھمک ،
آہٹوں کے اس بھنور میں ، اک جھجکتی چاپ کی دھیمی جھنک ،
میرے دل کی دھڑکنوں کو روندنے والی کسک ، !

رات —— بجھتی شمع —— نیندوں کا غبار
برف کی زنجیر میں جکڑے ہوئے جھونکوں کی بزم ،
میں کہاں تھا —— کچھ بتا —— اے دل کی لو پر ناچتی ، ناگفتہ ، نظم !

تشبیہات

قتیل شفائی

(جوش صاحب کی نذر)

رقص کرتی ہوئی نرتکی کا بدن
جیسے دیپک کی لو، جیسے ناگن کا پھن
جیسے چٹکے کلی، جیسے مہکے چمن
جیسے اوڑھے گھٹا، جیسے پھوٹے کرن
جیسے آندھی اُٹھے، جیسے بھڑکے اگن
جیسے پہلو میں دل، جیسے دل میں لگن
جیسے مڑتی ندی، جیسے اُڑتی پون
جیسے تتلی کا پر، جیسے بھونرے کا من
جیسے برہا کا دکھ، جیسے چوری کا دھن
جیسے من میں تڑپ، جیسے بن میں ہرن
رقص کرتی ہوئی نرتکی کا بدن

قتیل شفائی

عجیب لوگ

اداسی کے ہزاروں زاویے ہیں
اسے دیکھوں میں کس کس زاویے سے؟

ترے چہرے پہ سرسوں پھولتی ہے
مری آنکھوں میں جلتے ہیں دِئے سے

مگر وہ لوگ بھی مجھ سے ملے ہیں
جو روتے ہیں نہ جن کے لب ہلے ہیں

فن اور بھوک

کہیں آڑی ترچھی لکیروں کے جال
کہیں جلوہ آرا نگارِ خیال
کہیں ساز و آواز کے زیر و بم
کہیں پتھروں سے ہمکتے صنم
کدھر جائیں ہم —؟
بتا اے زمانے بتا اے شکم
کدھر جائیں ہم —؟

۱۰

○

قتیل شفائی

یہ سلوکِ زندگی اک بے سروساماں کے ساتھ
اب غمِ دوراں بھی شامل ہے غمِ جاناں کے ساتھ

زندگی بھر چند سایوں کا تعاقب کیجیے
آرزوؤں نے کیے کیا کیا مذاق انساں کے ساتھ

کیوں کھلیں آخر ہمارے دل میں امیدوں کے پھول
کیا تعلق حسن کا اس قریۂ ویراں کے ساتھ

ہم ہی کچھ مطلب نہ سمجھے ورنہ اے شامِ الم
وہ نگاہیں تو جھکی ہیں ہر نئے پیماں کے ساتھ

دور تک کالی گھٹا چھائی، مرے گلشن کی خیر
آنہ جائیں بجلیاں بھی موسمِ باراں کے ساتھ

ایک چھوٹا سا نشیمن اے صبا ان کے لیے
جن کی تقدیریں ہیں وابستہ درِ زنداں کے ساتھ

اعتدال آنے ہواؤں میں تو کچھ سمجھیں قتیل
کیا ہے باقی اور کیا کچھ اڑ گیا طوفاں کے ساتھ

حرف و سخن

مختار صدیقی

حرفِ آغاز :

سانس کی بیاکل ڈوری پیاری ، ایک ہی نام جپے
ایک ہی نام کہ جو کبھی تیرا ، اور کبھی ہے خدا کا نام
ایک ہی نام کہ جس کے آگے ، ہر شے ہے بے نام
ایک ہی نام کہ اب جو بنے گا تیرے نام سے میرا نام

ایک ہی نام کہ جس سے من میں چین بھی اور بے چینی بھی ۔
ایک ہی نام کہ ذہن میں جس سے شہر بسا ہے خیالوں کا !
ایک ہی نام کہ جس کی دُوری آگ ہے ؛ قرب الاؤ !
ایک ہی نام جو ایک جواب ہے سکھ اور دُکھ کے سوالوں کا !

ایک ہی نام کہ جس نے بندھائی دور دراز کی آس
ایک ہی نام کہ جس کے ہوتے کوئی دُور نہ پاس
ایک ہی نام کہ جس نے بجھائی روح کی اَن مٹ پیاس
ایک ہی نام کہ جس کی ودیعت بے بنیاد ہراس !

ایک ہی نام کہ جس نے کیا ہے حال سے یوں بے حال ہمیں
ایک ہی نام کہ جس نے بنایا بلا جواب سوال ہمیں
ایک ہی نام کہ جس نے بخشی ، گھٹتے چاند کی چال ہمیں
ایک ہی نام کہ جس نے کیا ہے پیڑ سے ٹوٹی ڈال ہمیں

سوال :

سو باتوں کی اک بات یہ پوچھوں، کیوں یہ "حجاب نام؟"
کون ہے جس کا نام بنا ہے، نام کا حسنِ کلام؟

"حجابِ سوال":

کون ہے وہ؟ یہ کون بتائے، بات کے بھید سے بات
شعر شعار ہوا جس کارن، یہ بھی اسی کے ہاتھ!

کون ہے جس کا ساتھ بنا ہے جان اور تن کا ساتھ
ایک ہیں مرنا جینا جب سے ہاتھ میں آیا ہاتھ!

کون ہے جس کی بات بھی پیاری، بات میں ایسا دُلار؟
دل پر مرہم رکھے جیسے، موسمِ گل کی پھوار

کون ہے جس کا پیار بھی پیارا، جیسے بہار کا چاند
آپ ہی سونا، آپ ہی خوشبو، کچھ اُجلا کچھ ماند!

کون ہے جس کے رُوپ کی ضَو سے ہم ایسے بھی حسین؟
تن سونا من کندن ہے اب، ہم سا نہ کوئی حسین!

سخنِ آخر :

سُن جاناں، یہی پردہ سخن کا، عینِ سخن یہ لگن
جس میں ہم تم دونوں برابر، باقی باتیں فن!

سن جاناں، کوئی چیز جہاں میں کتنی بھی ہو انمول
مل جاتی ہے — گر اس کے لیے خود زیست بنے کشکول

سُن جاناں: بس تیرے لیے معبود نما ہی سہی
دلبر کیا جو دل بھی نہ رکھے، چاہے خدا ہی سہی!

سُن جاناں، یہ میل یہ دوری، لمس ہوس کے چاؤ
دو روحیں ہوں ایک تو اس کے اور ہزار سبھاؤ

سن جاناں، یہ میل یہ دوری، طول امل کے پھیر
دو روحیں ہوں ایک تو قربت، لازم دیر سویر!

سن جاناں یہ میل یہ دُوری، برکھا اور گھٹائیں
ساتھ نہ رہنے پائیں دونوں، ایک مگر کہلائیں!

سُن جاناں یہ میل یہ دوری، باس کلی کی ادا
میل خدا نے ملایا جن کا، پھر بھی ہوں گے جُدا

سن جاناں، یہ پیار انوکھا، جس کے اسیر آزاد
دونوں ہی آباد رہیں اور دونوں ہی برباد!

سن جاناں، یہ پیار انوکھا، میں باندی تم سردار
تم بندے میں صاحب و مالک، میں ذرّہ تم مختار

سن جاناں یہ پیار انوکھا، میں گُل، تم شبنم ریز
میں خوشبو، تم اس کی حسرت، اس کارن کم آمیز

سن جاناں، تم سب سے اچھے، تم سے بھی بہتر، میں!
تم منزل، میں حاصل منزل، تم رہرو تو رہبر میں!

○

ماہر القادری

نور کی تحریر تھا، ہر خطِ پیمانہ مجھے
یاد ہے اب تک طلوعِ صبحِ میخانہ مجھے

عشق نے بخشا ہے جذبِ سرفروشانہ مجھے
اُن کو کیا کہیے کہ جو کہتے ہیں دیوانہ مجھے

بزم میں احساسِ فرقت اور ہو جاتا ہے تیز
مار ڈالے گا یہ قربِ شمع و پروانہ مجھے

بھیجتا ہوں چشمِ ساقی کی توجہ پہ درود
کر دیا ہے بے نیازِ جام و پیمانہ مجھے

میری وحشت ڈھونڈتی ہے اور ہی کوئی فضا
اب گلستاں روک سکتا ہے نہ ویرانہ مجھے

یہ شبِ غم کا اندھیرا، ہائے یہ تنہائیاں
جذب کر لے اے خیالِ بزمِ جانانہ مجھے

اس تغافل کے تصدق، اس توجہ کے نثار
جاتے جاتے اُس نے دیکھا بن کے بیگانہ مجھے

میں ہوں ماہر میگسار و بادہ آشامِ غزل
یہ شرف بخشا ہے پیمانہ بہ پیمانہ مجھے

○

شاد عارفی

صبر کرنا چاہیے اے دل، مگر
کہہ نہیں سکتا کہاں تک صبر کر

میرے ہاں وہ اور کبھی میں اس کے گھر
اک قدم پھولوں پہ اک تلوار پر

بات کچھ خطرے کی ہوگی نامہ بر
ورنہ وہ اور یہ "جوابِ مختصر"

"اس کے مڑ کر دیکھنے سے پیشتر"
پاسبانانِ نظر تھے "بے خبر"

سب سے اونچی شاخ پر تازہ گلاب
جیسے کوئی ماہ پارہ بام پر

یہ تکلف چھوڑ دینا چاہیے
رازِ دلداری چھپانا ہے اگر

بڑھتے بڑھتے عشق کی پینگیں بڑھیں
رفتہ رفتہ آ گئے وہ راہ پر

یہ رہا مجھ پر کہ دامن تھام لوں
تو دبے قدموں برابر سے گزر

کیا قیامت ہے وہاں جاتے ہوئے
ٹوکتے ہیں دوست "اے حضرت کدھر"

ضبطِ الفت نے یہ ثابت کر دیا
دل ابھی حاوی ہے "اپنے آپ پر"

یوں بھی ہوتا ہے دمِ سیرِ چمن
تتلیاں پہلو میں، پھولوں پر نظر

یہ اشاراتِ تغزل آفریں
میں ادھر بیٹھا رہوں اور تم اُدھر

شاد جن کو اصطلاحی خبط ہے
کہتے ہیں محبوب کو "شمس و قمر"

○

عبدالمجید حیرت

آج جو کچھ بھی زمانہ کہہ لے
حال ایسا تو نہیں تھا پہلے

ظرف اتنا تو کوئی رکھتا ہو
بات کڑوی بھی کسی کی سہہ لے

دل وہاں بھی نہ کسی طور لگا
باغ وبستاں میں بھی جا کر ٹہلے

جب وہ رونق ہی گلستاں میں نہیں
دل یہ بہلے بھی تو کیونکر بہلے

اس نشیمن سے تو بہتر ہے یہی
بلبلِ زار قفس میں رہ لے

وہ بھلا دادِ وفا کیا دیں گے
دیکھتے ہیں جو خطائیں پہلے

آج موقع ہے کہ حیرت کے خلاف
جس کو جو کچھ بھی ہو کہنا، کہہ لے

○

عبدالمجید حیرت

مدتوں دیکھ لیا چپ رہ کے
آؤ کچھ اُن سے بھی دیکھیں کہہ کے

اس تغافل پہ بھی اللہ اللہ
یاد آتا ہے کوئی رہ رہ کے

ہے روانی کی بھی حد اک آخر
موج جائے گی کہاں تک بہہ کے

شاذ ہوگا کوئی طائر ایسا
قید رہ کر جو قفس میں چہکے

دیکھنا یہ ہے کہ غوّاصوں میں
کون لا سکتا ہے موتی تہ کے

کوئی طالب ہی نہیں تھا، ورنہ
پھول تو باغ میں اکثر مہکے

سچ تو یہ ہے کہ ندامت ہی ہوئی
راز کی بات کسی سے کہہ کے

اپنی یہ خشک لبی ہی اچھی
کون میخانے میں جا کر بہکے

بات تو جب ہے کہ حیرتؔ کی طرح
سختیاں کوئی دکھائے سہہ کے

○

امتیاز علی عرشی

کون گلشن میں رہے نرگسِ حیراں کی طرح
آؤ چمکا دیں اسے مہرِ درخشاں کی طرح

عمر بھر راہ نوردی کا رہا ہم کو جنوں
خارزاروں سے بھی گزرے ہیں گلستاں کی طرح

تار باقی ہیں جو دو چار گریباں میں مرے
ٹوٹ جائیں نہ کہیں تارِ رگِ جاں کی طرح

لوگ کہتے ہیں کہ ہو باغ میں، لیکن ہم کو
یاں کی ہر شے نظر آتی ہے بیاباں کی طرح

"زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا"
دور ہی ہم سے رہو چشمۂ حیواں کی طرح

ہم کو بھاتا ہے چمن دل سے، مگر کیا کیجے
اس میں آرام نہیں گوشۂ زنداں کی طرح

دال گلتی نہیں بستی میں ہماری، عرشی
آؤ ویرانے ہی میں بیٹھے انساں کی طرح

○

انجم رومانی

خرقۂ سبز سے نے پیرہنِ سُرخ سے ہے
زینتِ اہلِ تمنا کفنِ سرخ سے ہے

اُس کی محفل سے نہیں کوئی بھی جس کو دیکھو
حلقۂ سبز سے ہے، انجمنِ سرخ سے ہے

وائے کم بینی کہ اربابِ چمن کے نزدیک
آتشِ لالہ و گل پیرہنِ سرخ سے ہے

آتشِ شوق ہے اور ہم ہیں غرض کیا اس سے
زلفِ شب تاب سے ہے یا دہنِ سرخ سے ہے

جس سے خوں گشتہ امنگوں کا بیاں ہو انجم
وہ سمجھتا ہے کہ یہ انجمن سرخ سے ہے

صبا اکبر آبادی

جو دیکھئے تو کرم عشق پر ذرا بھی نہیں
جو سوچئے کہ خفا ہیں تو وہ خفا بھی نہیں

جہانِ دیر و حرم دل کو پوچھتا بھی نہیں
نصیبِ عشق میں بت بھی نہیں خدا بھی نہیں

وہ اور ہوں گے جنھیں مقدرت ہے نالوں کی
ہمیں تو حوصلۂ آہِ نارسا بھی نہیں

زہے حیات طبیعت ہے اعتدال پسند
نہیں ہیں رند اگر ہم تو پارسا بھی نہیں

حدِ طلب سے ہے آگے جنوں کا استغنا
لبوں پہ آپ سے ملنے کی اب دعا بھی نہیں

شگفتِ گل میں بھی زخمِ جگر کی صورت ہے
کسی سے ایک تبسم کا آسرا بھی نہیں

حصول ہو ہمیں کیا مدعا محبت میں
ابھی سلیقۂ اظہارِ مدعا بھی نہیں

اگر شعورِ محبت نہ درمیاں ہوتا
کوئی کسی کو زمانے میں پوچھتا بھی نہیں

سنا تو کرتے تھے لیکن صبا سے مل دیکھا
بھلا وہ ہو کہ نہ ہو آدمی برا بھی نہیں

سترھویں کا چاند

ظہور نظر

یوں تو تھا شام سے ہی سوچ کا انداز کچھ اور
پھر بھی یہ وہم نہ تھا یوں شبِ مہ گزرے گی
جس طرح کوئی چھلکتا ہوا ساغر لے کر
پاس سے اپنے شرابی کے گزر جائے جیسے
تشنگی سے کی درمک پہ لے آئی ہو۔

نیند کا نشہ تھا
سپنوں کی عملداری تھی
دل میں دربار لگا تھا ترے ارمانوں کا
چار سُو محفلِ موسیقی بپا رہی تھی

یوں لگا ہے
جیسے صدا دی ہو، بلایا ہو کسی نے مجھ کو
ایسے محسوس ہوا ہے،
جیسے جھنجھوڑا ہو، جگایا ہو کسی نے مجھ کو

اور جب آنکھ کھلی ہے،
دل میں مہماں کوئی نہ تھا
سوتی آنکھوں نے جہاں دیکھا تھا ہنگامِ ہجوم
جاگتی آنکھوں نے دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا

وادیٔ وقت میں جھانکا، تو وہاں

رات نے کاٹا تھا بس ایک ہی موڑ
رقص فرمانے کو تھی کاہکشاں
ان گنت تارے، مجھے دیکھ کے مسکانے لگے
دید نی تھا مری وحشت کا سماں

موڑ اک اور مڑی رات ـــــ،
فضا حسن سے زرتاب ہوئی
دیکھتے دیکھتے ـــ، چاند ابھرا سرِ بامِ فلک
مجھ پہ ہنستے ہوئے تاروں کی ہنسی خواب ہوئی
رقص فرمانے سے پہلے ہی سُبک کاہکشاں
مرمریں نور کے سیلاب میں غرقاب ہوئی

اور میں ہنسنے لگا، میری ہنسی ـــــ،
چاند سے ماند ستاروں نے سنی تو کانپے
یک بہ یک مجھ پہ طاری ہوا اک خوف سا، اور
دیر تک میرے دل و ذہن بھی ہل کر ہانپے
دیر تک میرے تصوّر کے نہاں خانے میں
برق کی طرح مچلتا رہا ـــــ،
یہ ایک سوال، ایک خیال
کیا کبھی وقت کی شاہی پہ بھی آئے کا زوال ؟

اور اک موڑ مڑی رات ـــــ،
ڈھلکنے لگا چاند
ملگجی دھند سے بوجھل ہوئے شب کے سائے
چشمۂ ماہ سے امڈا ہوا سیلاب رُکا
دیکھتے دیکھتے تاروں کے چمن نکھرائے
پھیلتے پھیلتے
بے رنگ سا کہرا پھیلا

رینگتے رینگتے گدلانے لگی فکر کی لہر
سوچتے سوچتے ویران ہوئی محفلِ ذہن
یوں مرے حال پہ ڈھایا مری تخئیل نے قہر
اوس کے لمس سے مدہوش ہوا چلتے ہی
جسم میں جان میں سلگنے لگا تنہائی کا زہر
شہر پر ایک نظر ڈالی تو محسوس ہوا
حشر تک اب نہیں جاگے گا یہ سویا ہوا شہر
دیر تک جاگا کئے
کوئی در کانپا نہ دروازوں پہ لٹکتی ہوئی زنجیریں ہلیں
ابدی سوگ میں ڈوبی ہوئیں کھوئی ہوئیں دیواریں رہیں

حد سے جب بڑھ گئی تو پھر
کون سی یاد تھی، میں نے جسے آواز نہ دی
کون سی بات تھی دہرایا نہ جس کو میں نے
کوئی بھی روح کے ویرانے میں اک پل نہ رکا
کون سا دھیان تھا ٹھہرایا نہ جس کو میں نے

منزلِ فکر، سکونِ دل و جاں کی خاطر
کون سی راہ میں احساس نہ بھاگا شب بھر
درد بھی سویا رہا، غم نے بھی انگڑائی نہ لی
کوئی بھی دوست مرے ساتھ نہ جاگا شب بھر

تو بھی یاد آئی ـــ
تو کچھ یوں، کہ نہ دل بیٹھا نہ آنکھیں بھیگیں
رات بھر ذہن الجھتا رہا جن سوچوں سے
صبحدم بھی وہی ادراک میں تھیں
یوں تو تھا شام سے ہی سوچ کا انداز کچھ اور
پھر بھی یہ وہم نہ تھا یوں شب یہ گذرے گی

میرے دشمن کی موت

منیر نیازی

تیغ لہو میں ڈوبی تھی اور پیڑ خوشی سے جھوما تھا
بادِ بہاری چلی جھوم کے جب اُس نے مجھے دیکھا تھا
گھایل نظریں اُس دشمن کی ایسے مجھ کو تکتی تھیں
جیسے اَن ہونی کوئی دیکھی ان کمزور نگاہوں نے

یہ انصاف تو بعد میں ہوگا کیا جھوٹا کیا سچا ہے
کون یقین سے کہہ سکتا ہے کون بُرا کون اچھا ہے
لیکن پھر بھی ایک بار تو میرا دل بھی کانپا تھا
کاش یہ سب کچھ کبھی نہ ہوتا میں نے دُکھ سے سوچا تھا
گھایل نظریں اُس دشمن کی گہری سوچ میں کھوئی تھیں
جیسے انہونی کوئی دیکھی اُن کمزور نگاہوں نے
کون ہوں میں اور کون تھا وہ جس پر ہونی نے وار کیا
کون تھا وہ جس شخص کو میں نے بھری بہار میں مار دیا

○

اقبال صفی پوری

غم میں تسکیں کے پہلو بدلتے رہے
دھوپ کے ساتھ سائے بھی چلتے رہے

دل میں وہ کروٹیں سی بدلتے رہے
دیپ بجھتے رہے دیپ جلتے رہے

حادثے اُن سے بچ کر نکلتے رہے
جو ترے غم کی چھاؤں میں چلتے رہے

ہم تو تسکینِ دل اُن کو سمجھے مگر
وہ خلش بن کے دل میں مچلتے رہے

دیکھ لے مڑ کے شاید وہ چشمِ کرم
دور تک اس سہارے پہ چلتے رہے

گردشِ چشم سے گردشِ جام تک
حادثے سیکڑوں رُخ بدلتے رہے

اُن نگاہوں کی لغزش میں کیا چیز تھی
دیر تک اہلِ محفل سنبھلتے رہے

دل لہو ہو گئے غم کے احساس سے
تندیٔ مے سے شیشے پگھلتے رہے

وہ نہیں تھے تو لطفِ شبِ ماہ کیا
چاندنی سے بھی شعلے نکلتے رہے

سحر کی رات کا نور بڑھتا گیا
شمع کے ساتھ ہم خود بھی جلتے رہے

ہم نے اقبالؔ بدلی نہ رسمِ وفا
زندگی کے اشارے بدلتے رہے

○

شاد امرتسری

تیرا خط پڑھ کے مرے دل میں یہ بات آئی ہے
تو بھی میری طرح دل پھینک ہے ہرجائی ہے
تو نے مجھ سے جو نہ ملنے کی قسم کھائی ہے
بس یہی ایک ادا تیری مجھے بھائی ہے
درد کے چاند نے منہ ڈھانپ لیا دل میں کہیں
پھر اندھیرا ہے وہی کالی گھٹا چھائی ہے
تجھ سے مل کر بھی سلگتی تھی مرے شوق سے آگ
اب بچھڑ کر بھی مرے شوق نے سلگائی ہے
اب تو آنسو بھی نہیں آنکھ میں کیا ڈھلکے گا
تیری باتوں سے مری آنکھ بھی پتھرائی ہے
ہائے وہ راگ کہ جو ہم نے الاپا تھا کبھی
میرے ہونٹوں پہ ابھی راگ کی اکتائی ہے
کون سنتا ہے کسی درد کے مارے کی صدا
کوئی سن لے بھی تو کہتا ہے کہ سودائی ہے
رات تاریک سہی ، راہ بھی دشوار سہی
میرے ہمراہ ازل سے مری تنہائی ہے
بات سچی ہو تو کہتے ہیں کہ نشے میں ہے شاد
اور جھوٹی ہو تو کیا طبع رسا پائی ہے

جمیل ملک

پربت سے جو چشمہ پھوٹے، دھرتی اور سہے
ہونی کا کیا رونا یارو، ہونی ہو کے رہے

لاکھ پتنگے جان سے جائیں، دیپک ایک جلے
دیکھتی آنکھیں سب کچھ دیکھیں منہ سے کون کہے!

وہ سمجھیں اور کوئی نہ جانے بھید بھاؤ کی بات
جو کہنا ہو ہم کہہ آئیں، دل کی سانکھ رہے

رستہ تکتے تکتے ٹوٹی، یوں ہر دوسے کی آس
جیسے پچھلی رات کو جلتے جلتے دیپ بجھے

چاند نہیں، تو اپنے اپنے من کی جوت جگاؤ
اک اک تارا ڈوب چکا ہے دیپ سے دیپ جلے

دنیا رنگ بدلتی جائے، پل پل سوانگ رچائے
صحرا سے ساگر اُمڈے، ساگر میں آگ لگے

مایا کا بازار ہے دُنیا لوبھ کے سب بیوپاری
بے قدروں کی اس نگری میں دل کا نام نہ لے

رفعت سلطان

نہ کوئی دوست نہ دنیا میں ہے کوئی دشمن
عجیب ہے مری افسردہ زندگی کا چلن

وہی ہیں چاند ستارے وہی ہے نیل گگن
مگر نہیں مری نظروں کے سامنے ساجن

نہ جانے کون مجھے یاد آ گیا ہے معاً
کہ بڑھ گئی ہے مری نبضِ زیست کی دھڑکن

اگر لگائی گئی آبِ نور پر قدغن
طلوع ہو گی نہ دل کے افق سے کوئی کرن

تکلفات بھی ہیں جزوِ زندگی، لیکن
نہ آپ پوچھا کریں مجھ سے حالِ دل رسماً

مجھے خدا کے لیے دے نہ تو دعائے خرد
کہ آ گیا ہے مجھے راس میرا پاگل پن

نہ پوچھ ہم پہ جو دُنیا نے سختیاں کی ہیں
تو سُن سکے گا نہ میرے حبیب نرم سخن

جبیں جبیں پہ ہے تحریرِ صد جنوں، پھر بھی
ترے خطوطِ بدن ہیں ترے خطوطِ بدن

برس پڑیں گے مری آنکھ سے وہیں آنسو
کرے گا بات جہاں ہنس کے کوئی غنچہ دہن

یہ کس نے روح کی گہرائیوں سے دی آواز
کہ چھڑ گیا ہے مرے دل کے ساز پہ ایمن

مسرتوں کی تمنا، نہ راحتوں کا خیال
نہ جانے سوچ کے کیا زیست بن گئی جوگن

یہی تو بات توجہ طلب ہے میرے کریم
کہ تُو ہے فیضِ رساں اور میں تہی دامن

خدا کرے کبھی ان پُرسکوت راہوں پر
چھنک اُٹھے تری پازیب چھن چھنا چھن چھن

کوئی کرے نہ کرے آج میری قدر مگر
کریں گے یاد مجھے میرے بعد اہلِ وطن

ترے جمال کا عرفان جب سے حاصل ہے
زمانہ مجھ کو سمجھنے لگا ہے صاحبِ فن

خُدا کا بیٹا

پریم وار برٹنی

بڑے وقار سے زخموں کا تاج پہنے ہوئے
ہزار بار میں دار و رسن سے گزرا ہوں
مٹا سکے گی نہ جس کو کوئی قیامت بھی
وہ نقش چھوڑے ہیں مہر و وفا کی راہوں میں

مری نظر نے جلائے ہیں ظلمتوں میں چراغ
مرے لہو سے اُجالا ہے قتل گاہوں میں

ارے زمیں کے خداؤ، مجھے بھی پہچانو
تباہیوں نے مجھے گود میں کھلایا ہے
مری خودی، مرے پندار کی صلابت کو
ہزار بار حوادث نے آزمایا ہے

وہ نور ہوں کہ جسے ظلمتوں نے پالا ہے
وہ طور ہوں جو اندھیروں کے دل میں رہتا ہے

گناہ گار صلیبو! مجھے سلام کرو
مجھے بھی میرا زمانہ "مسیح" کہتا ہے

سرِ بالیں

احمد ظفر

پھر مرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے   پھر مرے سامنے تقدیر کھڑی ہو جیسے
پھر کسی عالمِ رفتہ کا سماں دیکھا ہے   پھر مری آنکھوں میں ساون کی جھڑی ہو جیسے
پھر وہی سنگِ گراں رنگِ جہاں کی باتیں   پھر مرے سینے میں زخموں کی لڑی ہو جیسے
پھر کسی یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے   پھر وہی غم ہے قیامت کی گھڑی ہو جیسے
پھر وہی پیاس کی شدت ہے بہر گام کڑی   پھر وہی وسعتِ غم دھوپ کڑی ہو جیسے
پھر وہی لمحے ہیں شعلے سے فضائیں پرّاں   پھر وہی زیست جہنم میں پڑی ہو جیسے

پھر کسی پھول کو شعلوں میں جھلستے دیکھا
پھر مرے سامنے کانٹوں کی چھڑی ہو جیسے

پھر کسی عالمِ رفتہ کا سماں دیکھا ہے   پھر وہی بدلا ہوا رنگِ جہاں دیکھا ہے
کون ہے جو مری پلکوں پہ جلائے گا چراغ   کون ہے جس نے مرے دل کو تپاں دیکھا ہے
کون ہے جس نے مجھے دیکھ کے دیکھا بھی نہیں   کون ہے جس نے مجھے نالہ کناں دیکھا ہے
کون ہے جس نے مجھے موت کا احساس دیا   کون ہے جس نے مرا رنگِ فغاں دیکھا ہے
کون ہے جس نے مجھے پھول دیئے ہیں برسوں   کون ہے جس نے مرا دورِ خزاں دیکھا ہے
کون ہے جس نے مجھے وقت کی تصویر بھی دی   کون ہے جس نے مجھے سینہ کتاں دیکھا ہے

کون ہے جس نے مجھے چھوڑ دیا خار بدست
کون ہے جس نے مجھے شعلہ بجاں دیکھا ہے

کون ہے جو مری پلکوں پہ جلائے گا چراغ   کون ہے جو میرے سینے میں سجائے گا چراغ
میں تو وہ تیرہ و تاریک مکاں ہوں جس میں   روشنی بن کے کسی طور نہ آئے گا چراغ
میں بھٹکتا ہوں کہ گم کردہ منزل ٹھہرا   راستہ اندھے کو کس طرح دکھلائے گا چراغ
میں یہی سوچ کے دل تھام کے رہ جاتا ہوں   عمر بھر شام و سحر مجھ کو رُلائے گا چراغ
کس طرح سوچا تھا کیوں سوچا تھا کیا سوچا تھا   صبح سے پہلے کوئی کیسے بجھائے گا چراغ
میرے احساسِ فروزاں سے بھی روشن نہ ہوا   اس طرح چپ ہے کہ آنسو نہ بہائے گا چراغ

چند ہی گام پہ تھک ہار کے میں بیٹھ گیا
منزلیں اور ابھی کتنی دکھلائے گا چراغ؟

کوثر نیازی

برہمن نہ تھے، دیر و حرم نہ تھے
اے دل کب ان کی راہ میں یہ پیچ و خم نہ تھے
ید انھیں کبھی نہ کبھی یاد آ سکے!
ان سے تعلقات ہمارے بھی کم نہ تھے
ام کس لیے تجھے اے چشمِ دوست دیں
شایانِ التفات ہی در اصل ہم نہ تھے
معترف ہے آپ کے الطافِ خاص کا
یہ اور بات ہے وہ برنگِ کرم نہ تھے
یں ہوں اور شکوۂ آلامِ روزگار
تیری فضا میں کوچۂ جاناں یہ غم نہ تھے
کے غنا نے رتبۂ شاہی عطا کیا
ہم کیقباد و خسرو و دارا و جم نہ تھے
کوثر یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ بخیل ہے
پھر بھی جو غم ملے وہ توقع سے کم نہ تھے

خیالِ ترکِ الفت ہم نشینو! آ ہی جاتا ہے
دُفورِ یاس ہو تو آدمی گھبرا ہی جاتا ہے
ہمیشہ سطحِ دریا ایک حالت پر نہیں رہتی
سفینہ تند موجوں سے کبھی ٹکرا ہی جاتا ہے
تباہی کی گھڑی شاید زمانے پر نہیں آئی
ابھی اپنے کیے پر آدمی شرما ہی جا
جسے آوارگی بیگانۂ منزل بنا ڈالے
فریبِ رہنما اکثر وہ رہرو کھا ہی جا
نگاہِ دوست کے آگے سپر کوئی نہیں ممکن
یہ تیرِ نیم کش قلب و جگر برما ہی جاتا
نہیں رُکتی خرامی کارواں کی بے سبب کوثر
خموشی سے جو اٹھتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

اختر ہوشیار پوری

کوئے جاناں کا وہی موڑ نشاں ٹھہرے گا
کارواں اہلِ تمنّا کا جہاں ٹھہرے گا

یہ دیارِ غمِ محبوب ہے اے دل مرے دل
جو یہاں آئے گا بے نام و نشاں ٹھہرے گا

ہم تو جاتے ہیں کہ ویرانیٔ دل عام ہوئی
تو کہاں اب غمِ جاں اے غمِ جاں ٹھہرے گا

رات ڈھلتے ہی چراغوں کی لویں کانپتی ہیں
کہ یہاں قافلۂ دل زدگاں ٹھہرے گا

فصلِ گل آئی تو پھولوں نے بھی آنکھیں کھولیں
جیسے اب کوئی سرِ کوئے بتاں ٹھہرے گا

ہم اگر آج نہیں کل کو سنبھل جائیں گے
دل تو دیوانہ ہے دیوانہ کہاں ٹھہرے گا

یہ کوئی شہرِ نگاراں ہے کہ ویرانہ ہے
دوستو! کچھ تو کہو کون یہاں ٹھہرے گا

وہ کڑا وقت بھی آنے کو ہے ہم پر اختر
جب غمِ دل کے مقابل غمِ جاں ٹھہرے گا

آتش لودھیانوی

زیست کیا زیست کا صلا کیا ہے
موت آئے گی موت کا کیا ہے

جو تبسم بھی، لطف پنہاں بھی
کون جانے کہ وہ ادا کیا ہے

زندگی درد ہی سہی لیکن
زندگی درد کے سوا کیا ہے

اک خلش ایک آہ اک آنسو
اور حاصل امید کا کیا ہے

پیار کرتا ہے کج اداؤں سے
جانے اس دل کا مدعا کیا ہے

آج تک یہ نظر پہ کھل نہ سکا
حسن کیا چیز ہے ادا کیا ہے

رنگ بھی شعلہ بھی، روحِ نغمہ بھی
وہ لپکتی ہوئی صدا کیا ہے

ہو طلب میں اگر یقیں پیدا
راہ کیا شے ہے رہنما کیا ہے

دل کے آنے کا اک بہانہ ہے
ورنہ یہ ناز یہ ادا کیا ہے

یار کا انتظار ہے آتش
ورنہ جینے کا مدعا کیا ہے

○

بشیر بدر

فضا نیم شبی ہے بہ حسنِ صبحِ حیات
ہمارے اشکوں سے دھل کر نکھر گئی ہے رات

مثالِ خوشبو پھرو گیسو گیسو آوارہ
یہ رہگذر ہے یہاں کیا قیام کیسا ثبات

مری تباہی کا الزام اب شراب پہ ہے
میں اور کرتا بھی کیا تم پہ آ رہی تھی بات

کھلی جو آنکھ تو دامن فضا کا لہرایا
گذر گئی تھی دبے پاؤں چپکے چپکے حیات

سنا ہے نارِ جہنم انھیں جلا نہ سکی
جو دامنوں سے بجھانے گئے چراغِ حیات

یہ ہاتھ اب ترے نقشِ قدم بھی چھو نہ سکیں
کبھی انھیں سے گذرتی تھی گیسوؤں کی برات

اسے دوستو۔ ابھی فرمائشِ غزل نہ کرو
مجھے یہ ڈر ہے نہ آجائے لب پہ دل کی بات

جو سونے والے سرِ شام سوئے صبح اُٹھے
وہ خوش نصیب ہیں کیا جانیں کیا ہے غم کی رات

کچھ اور چاہیے خونِ جگر اسے دیوانو
بجھے بجھے ہیں ابھی تک چراغِ راہِ حیات

بشیر بدر ہیں کچھ عیب بھی ضروری ہیں
کہ پاک وصاف فقط ایک ہے خدا کی ذات

ممتاز مرزا

دغا فریبِ نظر کھا گئی تو کیا ہوگا
خلوصِ شوق پہ آنچ آ گئی تو کیا ہوگا

کرن نگاہ کی بس شرما گئی تو کیا ہوگا
جو لَو ستاروں کی تھرّا گئی تو کیا ہوگا

یہ نو دمیدہ، یہ معصوم آرزو کی کلی
بھری بہار میں مرجھا گئی تو کیا ہوگا

نویدِ فصلِ بہاراں کی آرزو ہے ہمیں
مگر چمن پہ خزاں چھا گئی تو کیا ہوگا

یہ آرزو یہ تمنائے سادہ و رنگیں
غموں کی دھوپ میں سنولا گئی تو کیا ہوگا

یہ چاندنی جو تیری یاد سے عبارت ہے
یہ چاندنی بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا

ہزار بار دیئے ہیں اجل کو ہم نے فریب
حیات لغزشِ پا کھا گئی تو کیا ہوگا

جنوں نے راہِ وفا میں جلائے لاکھوں چراغ
خرد اندھیروں میں بھٹکا گئی تو کیا ہوگا

الٰہی اہلِ تمنا کی سخت جانی سے
جفائے دوست بھی شرما گئی تو کیا ہوگا

حدیثِ شوق کبھی نغمۂ جنوں بن کر
مرے لبوں پہ اگر آ گئی تو کیا ہوگا

ابھی تو ایک شرارہ ہے غنچۂ نورس
یہ آگ نشو و نما پا گئی تو کیا ہوگا

میں دل کو راہِ دغا سے ہٹا تو لوں ممتازؔ
جبیں نشانِ قدم پا گئی تو کیا ہوگا

آخری داؤ

شاعر ندیم

یہ رات بہت بے رحم بھی ہے
یہ رات بہت بدنام بھی ہے
یہ رات بہت برہم بھی ہے
یہ رات بہت ناکام بھی ہے

اس رات کی بے جاں خاموشی — قدموں کی مدھم سی رفتار
اس رات کی مردہ سرگوشی — تاروں کی مبہم سی جھنکار
دھرتی پہ صلیبوں کے سائے — مردہ جسموں کی سنگینی
دھرتی پر بازو پھیلائے — خونی ارماں کی رنگینی،
زنداں کی سسکتی دیواریں — دیواروں کے بے جاں روزن
بھٹی کی ہو مکتی آوازیں — اور سانچوں میں ڈھلتا آہن
ابنِ آدم کے جسموں پر — زنجیر و سلاسل کی لہریں
انسان کے ہاتھوں رقص کناں — انساں کے لہو کی سو نہریں

فٹ پاتھ پہ کروٹ لیتی ہیں — زندہ لاشوں کی تصویریں
یونہی ہنستی رہ جاتی ہیں — روٹھی تصویر پہ تقدیریں
یہ روپ بھری سرسوں رانی — کیوں کھیتوں کھیتوں مرجھائی
یہ گنگا جمنی سنگتوں میں — کس کس نے عصمت تلوائی
یہ گندی نظروں کے حربے — یہ ہاتھوں کی سینہ زوری
یہ بے شرمی کے جوالا مکھ — اور گھونگھٹ میں جلتی گوری
کیا دنیا مہنگی کیا سستی — جب جیون بے بس دکھیارا
جب پیاسی بستی کی بستی — جب اندھیارا ہی اندھیارا

یہ ایسی رات کی بپتا ہے
جس کی نس نس پر چھاتی ہے
یہ رات بہت بے درد سہی
یہ رات بہت دل سرد سہی
یہ رات بہت بھاری بھی سہی
یہ رات پگھلنے والی ہے
یہ رات بھی ڈھلنے والی ہے
یہ رات کا آخری داؤ ہے

راجہ مہدی علی خاں

دو شرابی

پہلا شرابی	زمانہ گردش میں جھومتا ہے۔ نشے نگاہوں کو آ رہے ہیں وہ ہاتھ زندہ رہیں خدایا۔ جو مجھ کو وسکی پلا رہے ہیں
دوسرا شرابی	جناب کیا آپ ہوش میں ہیں؟ اگر ہے ایسا تو اور لیجے شراب خانے میں آ گئے ہیں تو خود ہی کو غرق شراب کیجے
پہلا شرابی	نشہ بہت ہو گیا ہے صاحب نہ اور دیجئے شراب مجھ کو کہ اک بڑا سانپ لگ رہا ہے یہ لمبا لمبا کباب مجھ کو
دوسرا شرابی	کباب تو بہترین ملتے ہیں شام کو میرے گھر کے آگے اور ایسے خستہ کہ ٹوٹ جائیں اگر نہ لپٹے ہوں ان پہ دھاگے
پہلا شرابی	پتہ جناب اپنے گھر کا اس خاکسار کو بھی بتائیے گا
دوسرا شرابی	یہ کارڈ میرا ہے بھائی صاحب ضرور تشریف لائیے گا
پہلا شرابی	اٹھارہ نمبر؟ نظام منزل یہ میرے گھر کا پتہ ہے صاحب
دوسرا شرابی	منگا دوں ٹیکسی، بہت نشہ آپکو اگر ہو گیا ہے صاحب
پہلا شرابی	نشے میں کوئی بھی اپنے گھر کا پتہ نہیں بھولتا ہے مسٹر
دوسرا شرابی	بہت سی پی لے تو ماں بہن تک کو بالیقیں بھولتا ہے مسٹر
پہلا شرابی	میرے مکرّم! یقین کر لو — بہک گئے ہو نشے میں گم ہو
دوسرا شرابی	تو گویا فرحت کے نام پر جو مکاں ہے اُس کے مکین تم ہو؟
پہلا شرابی	قسم خدا کی۔ اٹھارہ نمبر نظام منزل — میرا مکاں ہے
دوسرا شرابی	کرایہ دیتی ہے اس کا فرحت تو کہہ رہا ہے تیرا مکاں ہے

پہلا شرابی — نشے میں کہتا ہوں صاف تجھ سے۔ بہت ہے فرحت کو پیار مجھ سے
دوسرا شرابی — زبان کو دے لگام ورنہ تو آج کھائے گا مار مجھ سے
پہلا شرابی — جو ہاتھ تجھ پر کبھی اُٹھایا۔ طلاق لے لے گی تجھ سے فرحت
دوسرا شرابی — وہ تجھ کو سینڈل سے پیٹ دے گی کہ عشق کرتی ہے مجھ سے فرحت
پہلا شرابی — اگر تجھی سے وہ عشق کرتی۔ گلے لگاتی نہ وہ مجھے بھی
دوسرا شرابی — ابھی جہنم میں بھیجتا ہوں۔ تیرے نشے کو بھی اور تجھے بھی
پہلا شرابی — گلا پکڑ مت! ہٹالے اپنے یہ ہاتھ گندے۔ یہ کالے کالے
دوسرا شرابی — تباہ کر دوں گا۔ مار ڈالوں گا۔ میں نہ چھوڑوں گا۔ تجھ کو سالے
پہلا شرابی — اٹھارہ نمبر۔ نظام منزل میں۔ بول بیٹا کبھی گھسے گا؟
دوسرا شرابی — تمھاری ماں کو گلے لگانے۔ تمھارا یہ باپ ابھی گھسے گا۔
پہلا شرابی — کمینے کتے! (پھٹے گریباں) رذیل پاجی! (گئی وہ ٹائی)
دوسرا شرابی — سؤر کے بچے! (گلاس ٹوٹے) حرامزادے! (گری تپائی)

{ شڑاپ تھپڑ۔ کھٹاک گھونسے۔ دھڑم بھڑم۔ دھاپ۔ چل رہے ہیں
گلے پھُلا کے۔ دُمیں اُٹھا کے۔ یہ دونوں مرغے اچھل رہے ہیں }

تیسرا شرابی — حسیں ہے موسم۔ سماں ہے رنگیں۔ لڑو نہیں بھائی! باز آؤ
ارے او بیرا۔ یہ کیا ہے گڑ بڑ؟ یہ مر نہ جائیں اِنھیں چھڑاؤ!
بیرا — جناب یہ دونوں باپ بیٹے ہیں۔ جھول جاتے ہیں روز پی کے
یہ دونوں رہتے ہیں ایک ہی گھر میں غل مچاتے ہیں روز پی کے
تیسرا شرابی — مگر وہ فرحت کا کیا ہے قصہ؟ جو بن گئی زیبِ داستاں ہے
بیرا — اجی وہ ہے ایک نیک عورت۔ جو اِس کی بیوی اور اُس کی ماں ہے

(۲)

ضرورت رشتہ اور تصویریں

ممی اس سے نہیں توبہ۔ کروں گی قدر خاک اس کی
مجھے لگتا ہے ڈر اِس سے بہت لمبی ہے ناک اس کی
ہوئی شادی تو پہلا کام ؟ میں ڈائی ووَرس مانگوں گی
میں اس کی ناک پھر لیا اپنا اوور کوٹ ٹانگوں گی
نہیں بابا۔ نہیں بابا

ارے ٹانگیں تو دیکھو "لانگ فیلو" سے بھی لمبا ہے
کہیں گے لوگ اِس کا پارٹنر بجلی کا کھمبا ہے
چڑھی سیڑھی لگا کر بھی تو ڈر جاؤں گی میں امّی
وہیں سیڑھی سے گر کر کھٹ سے مرجاؤں گی میں امّی
پرے پھینکو۔ پرے پھینکو

نہیں اِتنا بُرا لیکن یہ اوور ایج لگتا ہے
کتاب عاشقی کا آخری یہ پیج لگتا ہے
نہیں بابا نہیں لگتا ہے یہ تو ہُو بہو ڈیڈی
اسے تو اپنا دل دینے کو ہو جاؤ گی تم ریڈی
"اری لڑکی۔ اری لڑکی"

یہ اچکن پہنے بیٹھے ہیں غلط بولیں گے انگریزی
ہلاکو جیسی آنکھیں ہیں نگاہیں ان کی چنگیزی
میں کوئی ملک ہوں جو مجھ پہ حملہ کرنے آئے ہو؟
میاں جاؤ میں اک تلوار ہوں کیوں مرنے آئے ہو؟
نہیں جچتا - نہیں جچتا

بہت خط اس نے بھیجے ایک بھی بھیجا نہ لو لیٹر
میں پچھلے ویک اس سے کر چکی ہوں ڈراپ یہ میٹر
میاں تم مشرقی اور مغربی ہے خاندان اپنا
میں باز آئی محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا
نہیں جچتے - نہیں جچتے

ممی غنڈہ ہے یہ اور نام ہے بی۔اے شریف اس کا
شراب اور بدمعاشی میں نہیں کوئی حریف اس کا
ادھر یہ ڈال کر ڈورے مجھے اپنا بنا لے گا
ہو تم بھی خوبصورت یہ نظر تم پر بھی ڈالے گا
مداری لڑکی - اری لڑکی"

نگاہیں نیچی نیچی نام ہے ایم۔اے لطیف اس کا
خدایا توبہ توبہ جسم ہے کتنا نحیف اس کا
میری نظروں کا پہلا تیر بھی یہ سہہ نہیں سکتا
یہ مر جائے گا بے چارہ یہ زندہ رہ نہیں سکتا
چلو آگے - چلو آگے

نظر خونخوار - ریچھوں کی طرح وحشی ہیں ہاتھ اس کے
بہت نازک بدن ہوں رہ سکوں گی میں نہ ساتھ اس کے

بہت ہی تنگ کر دے گا یہ ظالم قافیہ میرا
بدل ڈالے گا دو ہی دن میں یہ جغرافیہ میرا
میں باز آئی۔ میں باز آئی

یہ اس کے منہ پہ "مسٹر دُر پھٹے منہ" کس نے لکھ ڈالا؟
یہ میرا نام تھا لیکن شرارت کر گئی خالا
ذرا ٹھہرو میں اس کے ساتھ خالہ کو پھنساؤں گی
اسی خالہ کو "بیگم دُر پھٹے منہ" میں بناؤں گی
" اری لڑکی۔ اری لڑکی!"

یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے ان وکیلوں سے
یہ ہر اک بات منوا لے گا قانونی دلیلوں سے
مجھے ڈائی وورس یہ بائی فورس دے سکتا ہے حیلوں سے
میرا گھر لوٹ لے گا قرقیوں سے اور اپیلوں سے
نہیں دیکھو۔ پرے پھینکو

یہ شاعر ہے یہ ہر لڑکی کو آہیں بھر کے تکتا ہے
جب اُکتا جائے گا کہہ دے گا میڈم تجھ میں سکتا ہے
کرے گا شاعری دن بھر نہیں پیسہ کمائے گا
میں جب مانگوں گی کھانا یہ مجھے غزلیں سنائے گا
نہیں بابا۔ نہیں بابا

یہ پروفیسر ہیں ازبر ان کو دنیا بھر کے ڈرامے ہیں
میں ڈرتی ہوں یہ کیوں ہاتھوں میں آسکر وائلڈ تھامے ہیں؟
کہیں مجھ سے زیادہ یہ نہ لیں لڑکوں سے دلچسپی،
سہاگن ہو کے بھی بیوہ نہ ہو جائے میری ہستی
نہیں امی۔ نہیں امی

ارے یہ ڈاکٹر نبضیں حسینوں کی ٹٹولے گا۔
گِنے گا دھڑکنیں دل کی گریبانوں کو کھولے گا

شریکِ زندگی بن کر میں جینے کو تو جی لوں گی
جو اس پر شک ہوا میں ٹنکچر آیوڈین پی لوں گی
نہیں بابا۔ نہیں بابا

ممی اب بس کرو بس بس غلط ہیں سب یہ تدبیریں
محبت میں نہ کام آتی ہیں تصویریں نہ تقریریں
جو سچ پوچھو "شرابِ عشق" سپ کرتی رہی ہوں میں
وہی اچھا ہے جس سے کورٹ شپ کرتی رہی ہوں میں

(۳)

ایک اور ضرورتِ رشتہ اور تصویریں

پولیس کپتان کی پوتی ہے یہ۔ اِس سے نہیں امّی
جہاں ڈانٹا پولیس آجائے گی فوراً وہیں امّی
ذرا "فوں فوں" کیا تو اپنے ڈیڈی کو بتا دے گی
یہ خود باہر رہے گی اور مجھے اندر کرا دے گی
نہیں امّی۔ نہیں امّی

ممی یہ وہ ہے جو پٹنے میں ہاکی میچ کھیلی تھی
خوشی سے پنچ کی موٹر میں اس نے لِفٹ لے لی تھی
وہ اِس گوری پہ کالا ہاتھ اپنا دھر چکا ہوگا
وہ موقع پا کے موٹر میں اسے کِس کر چکا ہوگا۔
نہیں امّی۔ نہیں امّی

ممی کیا یہ وہی ہے جس کی تم ہو عاشق و شیدا؟
یہ ہندی ہو کے کیوں انگلینڈ میں جاکر ہوئی پیدا؟
سوئیٹزرلینڈ میں ہے باپ امریکہ میں ماں اس کی
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں اس کی
نہیں امّی۔ نہیں امّی

عدالت حسن کی ہے بن کے مجسٹریٹ بیٹھی ہیں
یہ شادی کے لیے "ملزم" کو دینے ڈیٹ بیٹھی ہیں
چھوا ان کو تو بولیں گی "رذالت کر رہے ہو تم!
پرے ہٹ جاؤ توہینِ عدالت کر رہے ہو تم"
نہیں امی۔نہیں امی

بھویں تنتی ہیں کتنا سا تھ میں ہے تن کے بیٹھی ہیں
کلام داغ شاید پڑھ کے یہ بن ٹھن کے بیٹھی ہیں
کہیں گی میرے کتے کے لیے بھی پارکلنز لاؤ
کسی ایسیشن کتیا سے آنکھیں اس کی لڑواؤ
نہیں امی۔نہیں امی

یہ دوڑی جا رہی ہے جیسے یہ ہو ریس کی گھوڑی
نہ میں نے عشق کے جنگلے سے اسکی باگ اگر موڑی
کسی جا کی کو کندھوں پر بٹھا کر بھاگ جائے گی
بہاریں لوٹ آئیں گی مگر یہ پھر نہ آئے گی
نہیں امی۔نہیں امی

سنا ہے فلم میں بھی یہ حسینہ کام کرتی ہے
نہ جانے ایک دن میں کتنے دل نیلام کرتی ہے
جو ہیرو مل گیا کوئی۔مجھے وہ تن بنا دے گی
یہ دو ہی چار سینوں میں مجھے گھر سے بھگا دے گی
نہیں امی۔نہیں امی

ارے اس کو تو اس دن پارٹی میں ہم نے دیکھا تھا
کسی لڑکے نے اس پر دور سے اک پھول پھینکا تھا

یہی ہے تاپس کانوں میں یہی ٹیشو کی ساڑی تھی
نظر سب سے بچا کر اس نے مجھ کو آنکھ ماری تھی
نہیں امی۔ نہیں امی

ہے ریکٹ ہاتھ میں، کیا بیڈمنٹن اس نے سیکھی ہے؟
تنتنا مرچ کی مانند کتنی تیکھی تیکھی ہے
اسی ریکٹ سے اک دن میرا قصہ پاک کر دے گی
یہ میرے عشق کو دو دن میں شٹل کاک کر دے گی
نہیں امی۔ نہیں امی

دکن کی جادوگرنی آئی دامِ زلف کو کھولے
کہے قینچی کو "کینچی" اور قسم کو یہ "خصم" بولے
قسم کھانے کے دھوکے میں "خصم" شاید یہ کھا جائے
مری امی جوانی میں نہ مجھ کو موت آ جائے
نہیں امی۔ نہیں امی

سنا ہے فنِ موسیقی میں ماہر ہے یہ نیک ابلا[1]
کہے گی مجھ سے "میں گاؤں گی تم چھیڑو ذرا طبلا"
میرے گھر کی چھتیں اڑ جائیں گی سب اسکی تانوں سے
نہ سارنگی جدا تو کر سکے گی اسکی رانوں سے
نہیں امی۔ نہیں امی

غزالی آنکھ۔ چہرہ پھول۔ شرمیلی نظر اس کی
حسیں گالوں پہ دو دو تل ہیں اور غائب کمر اس کی
ممی یہ سرو قد لڑکی نہیں میرے نصیبوں میں
یہ بٹ جائے گی فوراً شاعروں میں اور ادیبوں میں
نہیں امی۔ نہیں امی

۱ـ [illegible]

کھڑی ہے ریگِ ساحل پر۔ امیر البحر کی پوتی
صراحی دار گردن میں ہیں کچھ مرجان کچھ موتی
میرے دل کے سفینے کو چٹانوں سے نہ ٹکرا دے
کسی ملاح سے مجھ کو سمندر میں نہ پھکوا دے
نہیں امی۔ نہیں امی

یہ نیلی نیلی آنکھیں۔ ہونٹ پتلے ہو بہو ہو تم
اسے تک کر میرے ڈیڈی کا دل بھی ہو نہ جائے گم
سمجھ کر تم ہو۔ ڈیڈی چوم لیں گے اس کو دھوکے سے
نہیں امید مجھ کو رُک سکیں وہ میرے روکے سے
نہیں امی۔ نہیں امی

ممی اب تو سمندر ہی میں پھینک آؤ یہ تصویریں
نہیں ڈالو میرے قدموں میں تم شادی کی زنجیریں
جو سچ پوچھو۔ یہ سب شادی نہ کرنے کے بہانے ہیں
مچلتا تیر ہوں سب لڑکیاں میرے نشانے ہیں
مجھے دنیا کی ہر لڑکی حسیں معلوم ہوتی ہے
ہر اک صورت مجھے سحر آفریں معلوم ہوتی ہے
اگر ان لڑکیوں میں ایک سے شادی کروں گا میں
یقیں ہے مجھ کو باقی کے لیے آہیں بھروں گا میں
کہو اب تم ہی امی میں کروں گا کس طرح شادی
میں ڈیڈی کی طرح ہرگز قناعت کا نہیں عادی

(۴)

بیوی کی سہیلیاں

آئی جو ایک اور بھی آتی چلی گئیں　　چھوٹے سے ایک گھر میں سماتی چلی گئیں

بچوں کی فوج لے کے ہوئیں گھر پہ حملہ زن　　ہم "دشمنوں" کے ہوش اڑاتی چلی گئیں

غنچہ دہن اُگلتے رہے دُودھ بار بار　　یہ بار بار دودھ پلاتی چلی گئیں

ننھوں نے ڈرائینگ روم میں دریا بہا دیئے　　دریاؤں میں یہ بند لگاتی چلی گئیں

بچوں نے چھیڑے ناک سے نغمے سُڑ سُڑ سُڑ　　ناکیں پکڑ کے "چھوں" یہ کراتی چلی گئیں

دیوار پر جہاں بھی سفیدی نظر پڑی　　کھتّے کے پھول اُس پہ بناتی چلی گئیں

اوراقِ ہر کتاب سے اُلٹے لگا کے تھوک　　پیکوں کی مہریں اُن پہ لگاتی چلی گئیں

کھینچے انھوں نے آ کے مرے ریڈیو کے کان　　چاروں طرف سے اس کو بجاتی چلی گئیں

کھانے پہ نقص انھوں نے نکالے ہزار ہا　　ہر ناپسند چیز کو کھاتی چلی گئیں

بولی جو ایک "کائیں" تو سب بولیں "کائیں کائیں"　　پھر "کائیں کائیں کائیں" سناتی چلی گئیں

اس گھر میں آ کے کھلنے لگے سب گھروں کے راز　　پردے پڑے ہوئے تھے اٹھاتی چلی گئیں

ہر ایک کا تھا یاد انھیں شجرۂ نسب　　ہے کون کس کا باپ؟ بتاتی چلی گئیں

ہمسائیوں کے سر کی حجامت کے بعد بھی　　قینچی زبان کی یہ چلاتی چلی گئیں

ہر سال ان کی عمر گھٹی تھی یہ پانچ سال　　ہر سال "عمرِ غیر" بڑھاتی چلی گئیں

دلہن کی طرح گھر تھا ہمارا سجا ہوا　　بیوہ کی طرح اس کو مٹاتی چلی گئیں

رو رو کے آج مانگ رہا ہوں یہی دعا
اس گھر میں یہ بلائیں نہ پھر آئیں اے خدا

(۵)

میاں کے دوست

آئے میاں کے دوست تو آتے چلے گئے
چھوٹے سے ایک گھر میں سماتے چلے گئے

وہ قہقہے لگے کہ چھتیں گھر کی اُڑ گئیں
بنیاد سارے گھر کی ہلاتے چلے گئے

بکواس اُن کی سن کے شیاطین رو پڑے
رویا جو ایک سب کو رُلاتے چلے گئے

نوکر نے آج چائے کے دریا بہا دیئے
دریا سمندروں میں سماتے چلے گئے

الماریوں میں سہم گئے بسکٹوں کے ٹِن
چُن چُن کے ایک ایک کو کھاتے چلے گئے

کھانے کی چیزیں نادر و نایاب ہو گئیں
دِلّی کا قتلِ عام مچاتے چلے گئے

شہدوں کی طرح ٹوٹ پڑے آ کے میز پہ
جو چیز بھی ملی وہ چباتے چلے گئے

جیسے پولیس میں پکڑتا ہے چور کو
ہر شئے پکڑ کے پیٹ میں لاتے چلے گئے

انجن کی طرح منہ سے اُگلتے رہے دھواں
اور سگرٹوں کی راکھ گراتے چلے گئے

ہر سمت پھینک پھینک کے ماچس کی تیلیاں
کمرے کا فرش گھر میں بچھاتے چلے گئے

کمرے میں گھومتے ہوئے کیچڑ بھرے وہ بوٹ
قالین کے نصیب جگاتے چلے گئے

دیواروں سے ٹکے رہے چپکے ہوئے وہ سر
ہر نقش ماسوا کو مٹاتے چلے گئے

آوازیں "آخ تھوخ" کی ہوتی رہیں بلند
سوئے ہوئے گلوں کو جگاتے چلے گئے

کوئی کتاب اپنے ٹھکانے نہ رہ سکی
ہندی کو فارسی میں ملاتے چلے گئے

اخباروں کی وہ ہتکِ عزت ہوئی کہ آہ
اب ان سے وہ نگاہ کے ناتے چلے گئے

دیواریں وہ نہیں رہیں وہ در نہیں رہا
جس گھر پہ مجھ کو ناز تھا وہ گھر نہیں رہا

(۶)

وفا کی دیویاں

دوست: چھوڑ اے دوست کہ جلدی کہیں جانا ہے مجھے
اپنی اجڑی ہوئی دنیا کو بسانا ہے مجھے
بید کے سائے میں نکہت میری رخشندہ جبیں
مرمریں جسم لیے حور کے مانند حسیں
ہو گی بیتاب گھڑی دیر نہ ہو جائے کہیں
دردِ فرقت میں وہ بے ہوش نہ ہو جائے وہیں
گر گئی کھا کے جو غش اُس کو اٹھانا ہے مجھے
اُسے باہوں کا حسیں ہار پہنانا ہے مجھے
تیرے چہرے پہ ہیں کیوں رنج و الم کے آثار؟

آم کے باغ میں ثروت میری خورشید جمال
ریشمی برقعے میں میرے لیے ہو گی بے حال
وہ چمکتی ہوئی آنکھیں وہ بہکتی ہوئی چال
میری آغوش میں گر جائے گی وہ ہو کے نڈھال
مژدۂ شامِ وصال اُس کو سنانا ہے مجھے
نصف شب کو اُسے کل گھر پہ بلانا ہے مجھے
تیرے اوسان خطا کیوں ہوئے جاتے ہیں یار؟

سیب کے پیڑ کے نیچے میری پیاری گلنار
بے قراری کو مری آج تو دے دے گی قرار
وہیں سب کچھ مری الفت پہ وہ کر دے گی نثار
سیب کے پیڑ تلے روئے گی وہ زار و قطار
شبنمی گھاس سے ہرنی کو اٹھانا ہے مجھے
اپنی الفت کا یقیں اُس کو دلانا ہے مجھے
آج کیوں لگتا ہے تو جیسے کوئی ہو بیمار؟

پیاری چڑیاں ہیں یہ سب گیت میرے گاتی ہیں
اپنے "پنجرے" میں تڑپتی ہیں یہ گھبراتی ہیں
عشق کے بن میں یہ چہک کے چلی جاتی ہیں
ایک ہی گھر سے سنا ہے کہ یہ سب آتی ہیں
آج اُس گھر کا پتہ پوچھ کے آنا ہے مجھے
وہ ہیں بیتاب انھیں گھر سے بھگانا ہے مجھے
تو انھیں دیکھے تو ہو جائے گا جینا دشوار

ارے دیوانہ ہے کیا؟ ہوش میں آ۔ ہوش میں آ۔
ارے میں خوب سمجھتا ہوں نہیں مجھ کو بنا
میں ذرا نبض تو دیکھوں۔ ارے لا ہاتھ تو لا
اے خدا کیا میں کروں۔ یہ تو گیا۔ یہ تو گیا
ہے کوئی گھر میں؟ ارے جلدی سے باہر آؤ!
ڈاکٹر لاؤ! ارے جلدی سے پانی لاؤ!!

بوڑھا ملازم: آپ اُٹھئے یہاں کچھ پردہ نشیں آتی ہیں
بیبیاں سامنے غیروں کے نہیں آتی ہیں

دوست: ڈاکٹر لینے میں جاتا ہوں بلا لو اُن کو
مرد گر کوئی نہیں تم ہی سنبھالو ان کو

بوڑھا ملازم: ساری طاقت میری صدمے سے ہوئی جاتی ہے سلب
نبض ساکت ہے اِدھر اور اُدھر حرکتِ قلب

اری نگہت! اری گلنار! اری ثروت آؤ
آ گئی وقت سے پہلے ہی قیامت آؤ

نگہت: ہائے کیا ہو گیا یہ؟ اے میرے بھیّا تجھ کو
کیوں تڑپنے کے لیے چھوڑ گیا تو مجھ کو
باپ بن کر مجھے پروان چڑھایا تو نے
علم و اخلاق کے زیور سے سجایا تو نے
چھپ گئے آنکھ سے کیوں آنکھ کے تارے بھیّا
کون سی ہم سے خطا ہو گئی پیارے بھیّا؟

ثروت: ہائے ہم کیسے جئیں؟ کیسا یہ طوفان مچا؟
کیوں تڑپنے کے لیے چھوڑ گئے ہم کو چچا
کون ظالم تھا نظر کھا گئی جس کی تم کو؟
ظلم بے قہر ہے موت آ گئی کس کی تم کو؟
زندہ تم رہتے جہاں میں ہمیں موت آ جاتی
تیرہ بختی نہ ہماری یہ قیامت ڈھاتی

گلنار: لُٹ گیا میرا سہاگ اے میرے پیارے سرتاج
کیا خطا تھی میری؟ کیوں مجھ کو دغا دے گئے آج؟
کون ہنس ہنس کے کہے گا مجھے اب جانِ وفا؟
کس سے باندھوں گی میری جان میں پیمانِ وفا؟
پہلے پہناتی تھی میں ہار تجھے باہوں کے
آج پہناتی ہوں میں ہار تجھے آہوں کے
اپنی دنیا میں نہ کوئی بھی رہا تیرے بعد
اب نہیں آئے گا جینے میں مزا تیرے بعد

(۲)

دوست: "حسن" پردے کی کشاکش سے چھٹا تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد
اے میرے دوست نہ جنت میں پریشاں ہوتا
سب کی قسمت میں تھا عاشق کا گریباں ہوتا

میرے گھر آیا ہے "سیلابِ بلا" تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد

خوں تھا دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
میں بھی دے جاتا حسینوں کو دغا کیا معنی
میں نے کی "تعزیتِ مہر و وفا" تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد

جن کے صدمے سے کبھی چہرہ تیرا زرد ہوا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
مجھ کو دکھلاتی ہیں وہ ناز و ادا تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد

کبھی بھولے سے نہ تینوں نے تیرا نام لیا
دو میرے ہاتھ تھے تینوں نے جنہیں تھام لیا
مجھ سے ہوتی نہیں اک پل کو جدا تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد

روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو نہ سکیں
شوخ تھیں ہر بناں پابندِ وفا ہو نہ سکیں
پھیلیں کرنے لگیں پہلے سے سوا تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد

گرچہ صدمہ ہے تیری موت کا تازہ تازہ
گھومتی پھرتی ہیں وہ منہ پہ لگا کے غازہ
سب کے ناخن ہوئے پابندِ حنا تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد

سوچتا ہوں کہ انھیں چھوڑ کے بھاگوں میں دمشق
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرر میرے ہونٹوں پہ صلا تیرے بعد
بارے آرام سے ہیں "اہلِ وفا" تیرے بعد

بسمل سعیدی

محکومِ مشیّت آدمی ہے — ہر معصیت ایک بندگی ہے
حد بھی کوئی انتظار کی ہے — اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے
یہ عشق کی وضعِ زندگی ہے — دشمن سے بھی اپنی دوستی ہے

قطعہ

کیا دَیر و حرم کو بدظنی ہے — میخانے کی بات اور ہی ہے
کچھ مصلحتاً نگاہِ ساقی — رندوں کے خلاف ہو گئی ہے

کیونکر رہے عشق بے تمنّا — خود حسن کا مقتضا یہی ہے
ہم بے خبرِ عدم نہیں صرف — ہستی بھی فریبِ آگہی ہے
اللہ ری ظلمتِ شبِ غم — تاروں کی سیاہ روشنی ہے
دوزخ سے بھی ہے سوا بھیانک — عصیاں جو بہ شکلِ بندگی ہے
اب حسن سے بھی ہے عشق بیزار — دیوانے کی کس سے دوستی ہے
کیفیتِ عشق اب تو شاید — کچھ عشق کی حد سے بڑھ گئی ہے
ہے میری محبت اُن کو معلوم — محسوس ابھی نہیں ہوئی ہے
اللہ رے تری جفا کے انداز — سانچے میں وفا کے ڈھل گئی ہے

دل اس سے سوا ہے آرزو مند
جتنا اُسے آنکھ دیکھتی ہے
غنچہ دہنی تو کوئی دیکھے،
آواز میں اک شگفتگی ہے
معصومیٔ حسن پر بھی کمبخت
یک عشق و ہزار بدظنی ہے
یاد اُن کی نہ ہے دل میں اب بھی لیکن
آواز سی ایک دُور کی ہے
میخانے میں بن رہی ہے دُنیا
مسجد میں قیامت آ رہی ہے

قطعہ

ہے جُزو بھی اپنے کل کے مانند
ہر چیز کا فلسفہ یہی ہے
اِک موت ہے ہر نفس میں پنہاں
ہر سانس میں ایک زندگی ہے

قطعہ

دریا ہی کا نام ہے تلاطم
دریا ہی سکوتِ سطح بھی ہے
ہے عشق ہی عالم جنوں بھی
اور عشق ہی عینِ عقل بھی ہے

قطعہ

ہر شام کی نیرگی سے غافل
اک صبح طلوع ہو رہی ہے
جاری ہے۔ یہی نظامِ عالم
ہر شام میں ایک صبح بھی ہے

قطعہ

آئینہ اگر نہ عکس دکھلائے
آئینہ نہیں ہے ٹھیکری ہے
جذبات نہ ہوں تو شاعری کیا
جذبات کا نام شاعری ہے

الہام نہیں ہے وحی ، بسمل
کیا شاعری بھی پیمبری ہے

(۲)

شبِ تاریک میں پیدا سحر کرنا بھی آتا ہے
ہمیں داغِ جگر کو جلوہ گر کرنا بھی آتا ہے

بدل جاتی ہیں جب ہم سے نگاہیں شادمانی کی
ہمیں ناشادمانی میں بسر کرنا بھی آتا ہے

زمانہ چھین لیتا ہے جب ایوانِ طرب ہم سے
ہمیں غمخانوں میں رہ کر گزر کرنا بھی آتا ہے

طرب کی شاہراہیں بند ہو جاتی ہیں جب ہم پہ
سرِ راہِ الم چل کر سفر کرنا بھی آتا ہے

غبارِ کارواں بر سر ہیں راہوں میں مگر ہم کو
غرورِ رہبراں کو بے اثر کرنا بھی آتا ہے

ہمارا مقصدِ ہستی کوئی رہنِ وسائل ہے
ہمیں اپنا سفر بے بال و پر کرنا بھی آتا ہے

بچاتے ہیں نگاہیں خاک کے ذرّوں سے بھی لیکن
ہمیں افلاک پر نقد و نظر کرنا بھی آتا ہے

ہم اک عمرِ خضر ہر آن ضائع کر چکے لیکن
ہمیں ہر آن کو عمرِ خضر کرنا بھی آتا ہے

ہمارا ہر ہنر اک عیب ہو کر رہ گیا لیکن
ہمیں ہر عیب کو اپنے ہنر کرنا بھی آتا ہے

جو دن کٹتے نہیں تقدیر کے زیرِ اثر ہم سے
اُنھیں تدبیر کے زیرِ اثر کرنا بھی آتا ہے

سجودِ بندگی کی ناپذیرائی کی غیرت سے
جبینِ شوق کو بیزارِ در کرنا بھی آتا ہے

غرورِ چارہ گر جب درد کی حد سے گزر جائے
ہمیں اطلاقِ درماں درد پہ کرنا بھی آتا ہے

ابھی جنسِ ہنر ہے منفعل جس نقدِ دولت سے
اُسے شرمندۂ جنسِ ہنر کرنا بھی آتا ہے

زمانے کے بلند و پست کے نرغے میں ہیں لیکن
زمانے کو ہمیں زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے

نظر کو ٹھوکروں میں رکھنے والو! جلوہ گاہوں میں
ہمیں جلووں کو پامالِ نظر کرنا بھی آتا ہے

مِلا کر اپنی قسمت کے ستارے خاک میں بسملؔ
ہمیں ذرّوں کو خورشید و قمر کرنا بھی آتا ہے

(۳)

خدا کرے مجھے دم بھر کو بھی نصیب نہ ہو
وہ زندگی جسے تیری خوشی نصیب نہ ہو

ترے لیے ہی نہ ہو زندگی و موت اگر
تو زندگی ہی نہیں موت بھی نصیب نہ ہو

جو سر جھکا ہو کہیں تیرے آستاں کے سوا
مری جبیں کو تری بندگی نصیب نہ ہو

کبھی اٹھی ہو جو ہنستی ہوئی بہار کی سمت
مری نگاہ کو تیری ہنسی نصیب نہ ہو

اگر پیا ہو کسی چشمِ مست کا ساغر
تری نظر سے مجھے میکشی نصیب نہ ہو

اگر ہوا ہوں میں آلودۂ شباب کہیں
ترے جمال کی پاکیزگی نصیب نہ ہو

سکوں نصیب ہوا ہو کبھی جو تیرے بغیر
خدا کرے کہ مجھے تو کبھی نصیب نہ ہو

نہ ہو جو وردِ زباں تیرے نام کا کلمہ
تو تیرا نام دمِ آخری نصیب نہ ہو

ترے بغیر اندھیری نہ ہو جو چاندنی رات
تو قبر میں بھی مجھے روشنی نصیب نہ ہو

اگر نہ ہو تری خاطر سے پاسِ دشمن بھی
خدا کرے کہ تری دوستی نصیب نہ ہو

جو تیرے غم پہ لٹا دوں نہ ہر خوشی اپنی
خدا کرے مجھے کوئی خوشی نصیب نہ ہو

خدا سے تیرے سوا اور کچھ اگر مانگوں
خدا کرے کہ مجھے بھیک بھی نصیب نہ ہو

اگر نہ ہو تری تصویر مونسِ بسمل
تو بدنصیب کو صورت تری نصیب نہ ہو

(۴)

وہ جس سے ہم کو کچھ ایسے ستم نصیب ہوئے
کسی کو ویسے کرم بھی تو کم نصیب ہوئے

ہوئے تمام ستم شاملِ شمارِ کرم،
ستم کے بعد کچھ ایسے کرم نصیب ہوئے

خوشی بھی ایسی کسی کو نہ مل سکی ہوگی
کہ جیسے ہم کو محبت میں غم نصیب ہوئے

وہ جس کے عارض و کاکُل کے مست نظارے
شروعِ شام سے تا صبح دم نصیب ہوئے

وہ جس کے حسن میں عالم ہمارے عشق کا تھا
ہُوا وہ ہم کو نصیب اُس کو ہم نصیب ہوئے

وہ جس کی خوئے تلوّن سے بارہا ہم کو
نصیبِ غیر کے قول و قسم نصیب ہوئے

ہُوا ہو جذب ہر اک جیسے اپنی ہستی میں
ہم ایک دوسرے کو یوں بہم نصیب ہوئے

وہ لطف جس نے کیے جو نصیب میں بھی نہ تھے
جو بے نوشتۂ لوح و قلم نصیب ہوئے

زہے نصیب کہ مدّت کے بعد نظروں کو
پھر آج اُس کے سجودِ قدم نصیب ہوئے

نگاہِ شوق بہ ہر گام سجدہ ریز رہی
نگاہِ شوق کو کتنے حرم نصیب ہوئے

نظر پڑی تو کچھ اس طرح ڈگمگائے قدم
نظر کو نغموں کے کچھ زیر و بم نصیب ہوئے

زہے وہ نقشِ کفِ پائے رہگزارِ چمن
بہارِ باغ کو جیسے اِرم نصیب ہوئے

تنہائی

مجنوں گورکھپوری

(۱۷)

اتوار کا دن تھا، ۸ بجے تھے، میں نے جلد جلد دو پرزے لکھے۔ ایک شاہدہ کو دوسرا پرویز کو۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پرویز کی مصلحت یا اس کی مرضی ہو یا نہ ہو میں اس کو دیکھنے ضرور جاؤں گی۔ اس کی بیماری کی خبر سن کر میرا جی سن سے ہو گیا تھا۔

نو بجتے بجتے میں سیدھی شاہدہ کے وہاں پہنچی۔ شاہدہ نے جس طرح بھینچ کر مجھے پیار کیا اس کی یاد زندگی بھر میرے دل میں باقی رہے گی۔ وہ اور ایوب ناشتے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ کچھ حلق کے نیچے اتارنے کے خیال سے مجھے ابکائی آ رہی تھی۔ شاہدہ نے یہ کہہ کر کہ "میں تم سے بہتر طبیب ہوں" دو انڈے اور دو توس کھانے پر مجھے مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ایوب ہم دونوں کو اپنی موٹر میں لے کر پرویز کے گھر روانہ ہوئے۔

پرویز کی جو حالت ہو گئی تھی اس کو دیکھے بغیر میرا تخیل اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ پرویز یوں بھی اپنے تمام جسمانی تناسب اور دلآویز صورت کے باوجود دھان پان ہی تھا لیکن آج ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سالوں سے بیمار ہے اور زندگی جڑ چھوڑ چکی ہے۔ اس کے چہرے میں مجھے ہمیشہ ایک رچی ہوئی متین روشنی محسوس ہوتی۔ اس کی آنکھوں کی اتھاہ گہرائیاں زندگی کے نازک اسرار و رموز سے معمور معلوم ہوا کرتی تھیں۔ آج اس کا چہرہ میلا نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھیں اجاڑ اور سنسان تھیں۔ ایسے دلدوز منظر کی خواب میں بھی امید نہیں رکھتی تھی میرا دل بیٹھنے لگا اور اگر میں اس وقت پرویز کے کمرے میں اکیلی ہوتی تو اس سے لپٹ کر بے اختیار روتی ——— لیکن چار کے بیچ میں ضبط کرنا پڑا۔ شاہدہ میرے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے تھی شاید اس نے میرے اندرونی تشنج کے آثار میرے چہرے پر دیکھ لیے۔ اس نے ایوب کو چند خانگی امور سے متعلق ہدایتیں کر کے جلد سے جلد رخصت کر دیا اور خود کسی بہانے سے جانے لگی۔ میں نے کہا "شاہدہ! ٹھہرو کہاں جاتی ہو۔ ذرا میں ان کا معائنہ کر کے ان کی بیماری کو سمجھ لوں تو جانا۔"

پرویز نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں اذیت اور بے بسی کا احساس تھا لیکن تھی وہ وہی نرم جی اور تیکھی مسکراہٹ جو اپنے پرویز کی انداز کے لیے مشہور تھی۔ اس نے کہا "ہاں مجھو شاہدہ، ڈاکٹر کشور رشید میرے ساتھ تنہا رہتے ہوئے گھبراتی ہیں۔"
اس کی آواز میں عجیب تھاہت اور زندگی نا آشنائی تھی۔ میں اس کو کبھی اس سے منسوب نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے مجبور

کر دیا کہ میں تحمل سے کام لوں ورنہ اس کا آخری حملہ میرے لیے زہر میں بجھا ہوا نشتر تھا۔ میں صرف اتنا کہہ کر رہ گئی "پرویز صاحب! اس وقت آپ ہرگز اس قابل نہیں کہ اپنی طبیعت پر زور دیں اور بلاوجہ کی نوک جھونک کریں۔ آپ ذرا سکون کے ساتھ خاموش پڑے رہیں تو میں بھی سمجھنے کی کوشش کروں کہ آپ کا حال کیا ہے اور اس کے تدارک اور ازالہ کی تدبیروں پر غور کروں۔"

پرویز کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے اپنے چہرے کو معصوم بنا کر کہا "یہ ایک عقل اور با تدبیر انسان کی آواز ہے۔ ہاں تم کو ہر طرح سے حق ہے کہ تم میرا معائنہ کرو اور مجھے سنبھالنے اور بچانے کی جو تدبیر ہو سکے کرو۔ میں تمہارے ظرف کا پہلے بھی قائل تھا اور آج اور بھی زیادہ قائل ہو گیا۔ میں اب سب کے سامنے بغیر کسی قسم کی مصلحت اندیشی کے تم کو کشور کہوں گا اور تکلف کا ہلکے سے ہلکا پردہ بھی تمہارے اور اپنے درمیان حائل نہ ہونے دوں گا۔ تم ان معدودے چند معصوم اور سچی ہستیوں میں سے ہو جن کے طفیل میں کائنات کا نظام درہم برہم ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ جو میں نے تمہارے بارے میں کہا ہے وہ جاہل اور ریاکار دنیا اقطاب و ابدال کے بارے میں کہا کرتی ہے جو سراسر جھوٹ ہے۔ ہاں اب تم میرا معائنہ کرو اور آج سے مجھے اپنا مریض سمجھو اور اب اپنے فرائض منصبی ادا کرنے سے فراغت پا کر تم روز صبح و شام کم سے کم ایک وقت مجھے آ کر دیکھ جایا کرو۔ اپنی فیس کا معاملہ شاہدہ سے طے کر لینا۔" یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کی مسکراہٹ میں پھر وہی دلکشی آ گئی تھی جو میں کیا بقول شاہدہ کے بہنوں کے لیے ایک سے زائد مرتبہ قلب و روح کی شدید آزمائش بن چکی تھی۔

میں نے دل و دماغ اور روح کی ساری قوتیں مجتمع کر کے پرویز کا معائنہ کیا اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر ہونے نہیں دیا لیکن میں ہی جانتی ہوں کہ مجھ پر کیا بیت گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ پرویز کے ساتھ ساری کائنات اور سارا زمانہ بیمار ہے اور اب صحت اور زندگی کے آثار زمین و آسمان میں کہیں باقی نہیں رہے۔

پرویز نے شاید میرے احساس کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے بڑے تھکے ہوئے لہجہ میں کہا "کشور! عرفی کا ایک شعر سنو اور اس کے بعد جو سمجھ میں آئے تشخیص کرو۔

کفن بیاور و تابوت و جامہ نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

ڈاکٹر کشور! میں ہی بیمار نہیں ہوں سارا نظام زندگی بیمار ہے۔"

"منظور بھائی! آپ کا لہجہ غیر مانوس ہے۔" شاہدہ نے کہا "اگر اس وقت سارا نظام زندگی سقیم ہے تو یہ عارضی صورت ہے آپ تو اس کو سدھارنے کا عہد کیے ہوئے ہیں۔ ایسے مایوس لہجے میں تو آپ زندگی اور صحت کا پیغام نہیں دے سکتے۔"

پرویز نے مسکراتے ہوئے کہا "شاہدہ! تمہاری چھیڑ کی عادت ہے۔ آدمی [illegible] کبھی کبھی انسان اپنی ذاتی ہستی پر ساری کائنات سے الگ ہو کر غور کرنے لگتا ہے۔ یہ کمزوری اور غلط اندیشی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ شکست خوردگی اور بدحالی کا احساس ہے لیکن جب تک سارا نظام زندگی سدھر نہ جائے ایسے کمزوری کے لمحے انسان کی زندگی میں آتے رہیں گے اور پھر میں نے تو ڈاکٹر کشور کو ایک لطیف اور نازک شعر سنانا چاہا تھا۔"

میں نے کہا "یہ شعر واقعی بہت نازک ہے" اور اس کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی بیماری کا ایک پہلو کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر ظاہر ہو گیا تھا اور مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ [illegible] سے بد ہضمی کسی قسم کی تھی کیسی؟ میں نے

اس خیال سے اپنے کو اطمینان دلانا چاہا کہ ممکن ہے اتنے دنوں سے بستر پر پڑے پڑے کثرتِ جمود (HYPOSTASIS) کی وجہ سے دورانِ خون میں ٹھہراؤ یا سستی پیدا ہو گئی ہو اور کھانسی آنے لگی ہو لیکن ستھاسکوپ (STELHESCOPE) مجھے کچھ اور بتا رہا تھا اور جب دریافتِ حال کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ پہلے ہی دن سے پرویز بائیں کندھے کے پاس درد کی شکایت کرتا رہا ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس کو خشک ذات الجنب (PLEURICY) ہے اور بائیں طرف کا پھیپھڑا بھی کچھ مبتلا معلوم ہوتا ہے۔ میرے دل میں ایک کھٹ کھٹ سی ہونے لگی۔ میں نے بڑے ضبط سے کام لیا اور اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ پرویز اپنے کو بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی اس کے اور مشاہدہ کے ہوشمند اندازوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ فضا میں ایک تناؤ سا تھا شاہدہ نے اس کو محسوس کر لیا اور چند منٹ کے بعد کوئی بہانہ کر کے اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی پرویز نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے پھیلا کر کہا "کشور!" اس ایک لفظ میں نہ جانے کتنی جوہری کشش تھی۔ میں بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور خوب روئی۔ پرویز خاموش مجھے لپٹائے ہوئے میرے سر اور بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر میرا چہرہ اوپر اٹھا کر کہنے لگا "کیوں کشور! تم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میری محبت رفتنی اور گزشتنی ہے۔ کشور! جب تک میں نے تم کو نہیں پایا تھا اس وقت تک اس خیال سے اپنے کو تسلی دیتا رہا کہ میری تخئیل کا جواب اس کثیف دنیا میں نہیں اس لیے اس کی آرزو کرنا عبث ہے لیکن تم کو پا کر اپنے کو پھر اب اس دھوکے میں بھی نہیں رکھ سکتا۔ میرا ایمان یہ ہے کہ اگر تم میری زندگی میں مستقل طور پر آ جاؤ تو میں زمین اور آسمان کو بدل سکتا ہوں اپنی تمام ناطاقتیوں اور مجبوریوں کے باوجود۔ کسی شاعر نے کتنی بلیغ بات کہی ہے۔

شبے بہ رغمِ فلک روئے خویشتن بنما
کہ زہرہ را بہ درم ماہ را بہ پا فگنم

اور اپنے خیال میں تمہیں کو مخاطب کر کے کچھ دن ہوئے میں نے بھی ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر ہے

جو تم کہو تو یہ سارا جہاں بدل ڈالیں
زمیں بدل کے چلو آسماں بدل ڈالیں"

"جب ہی تو اتنے دنوں سے نہ اپنی خبر دی اور نہ میرا حال پوچھا" میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

پرویز نے مجھے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجہ میں جواب دیا "کشور! اتنے دنوں سے میں اپنے کو اس قابل نہیں پاتا تھا کہ تم جیسی معصوم اور پاکیزہ ہستی سے ملوں۔ مجھ سے ملنے میں تمہارے لیے خطرہ ہے اور یہ خطرہ روز بروز سنگین ہوتا جائے گا۔ تم اس نکتے کو شاید نہ سمجھ کو۔ میں اتنے عرصے تک تم سے دور دور رہا اس لیے نہیں کہ تمہارے ساتھ دغا کرنا چاہتا تھا بلکہ اس لیے کہ مجھے اپنی ذات سے انتقام لینا تھا۔ مجھے کیا حق تھا کہ تم جیسی سراپا خلوص و ایثار ہستی کے ساتھ محبت کا نازک اور خطرناک واسطہ پیدا کر دوں۔ غالب کا ایک شعر ہے

مجبوری و دعوئ گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

ایسے پیمانِ وفا کا کیا اعتبار۔"

میں نے محسوس کیا کہ پرویز کا ہیجان بڑھ رہا ہے جو یقیناً اس کی حالت کو اور نازک کر دے گا۔ اس کو یوں بھی اس وقت [illegible]

کا بخار تھا۔ میں نے اس کو پیار کیا اور بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا "اب تم اجازت دو یا نہ دو میں روز دونوں وقت تم کو دیکھنے آؤں گی۔ آج سے تم میرے مریض ہو"

"میں اس سے پہلے بھی تمہارا ہی مریض تھا" پرویز نے ہنس کر کہا اور اس کے بعد اس نے شاہدہ کو پکارا۔ شاہدہ فوراً آ گئی۔ آج اس کے چہرے پر عجب غمگینی تھی۔

بارہ بج چکے تھے میں نے کہا "اب میں چل رہی ہوں، شام کو پھر آؤں گی۔ شاہدہ! اب میں روز دو وقت آؤں گی اور آج سے پرویز صاحب میرے مریض ہیں"

شاہدہ نے بڑے اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک بڑا گہرا سوگ تھا۔ وہ میرے ساتھ باہر سڑک تک آئی۔ میں نے اپنے کانپتے ہوئے دل کو سنبھال کر کہا "شاہدہ معلوم نہیں شیو جی لال کیسے ڈاکٹر ہیں لیکن آج پرویز صاحب کا معائنہ کر کے میرے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے ہیں۔ ان کو یا تو دق ہو گیا ہے یا ہوا چاہتا ہے۔ ان کے پھیپھڑوں کی جھلی میں ورم ہے اور شاید بائیں طرف کے پھیپھڑے میں بھی کچھ خلش ہے۔ اللہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے"

شاہدہ کے چہرے کا رنگ اس طرح زرد پڑ گیا جیسے اس کے سارے بدن سے خون کھینچ کر نکال دیا گیا ہو۔ میں نے کبھی اس کو اس عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ شاہدہ ایسا نازک دل رکھتی ہے اور کوئی موقع ایسا بھی آ سکتا ہے جبکہ وہ اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکے۔ اس نے یکایک مجھے پکڑ لیا اور کہا "کشور! ذرا بیٹھ جاؤ۔ مجھے چکر آ رہا ہے"

میں نے دیکھا کہ اس کو غش آیا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو دالان میں پڑے ہوئے بید کے صوفے پر بٹھا دیا اور کچھ بس نہ چل سکا تو اپنے بیگ سے "امونیا" نکال کر اس کو سونگھانے لگی۔ اس نے سنبھل کر کہا "کشور! میں اس قابل نہیں کہ اس وقت منظور بھائی کا سامنا کر سکوں یا اپنے گھر جا سکوں۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور منظور بھائی سے جا کر کہہ آؤ کہ چند ضروری ہدایتیں اور کچھ دوائیں دینے کے لیے تم مجھے اپنے ساتھ لیے جا رہی ہو"

(۱۸)

اس روز شاہدہ کا میرے ساتھ ساڑھے بارہ بجے سے ساڑھے تین بجے سہ پہر تک رہنا میرے لیے ایک الہامی انکشاف تھا میں نے اس کو ایک مفرح اور مقوی قلب مرکب دے کر اپنے ساتھ زبردستی کھانا کھلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد شاہدہ نے اپنے کو سنبھال لیا لیکن وہ خلافِ معمول خاموش اور سوچ میں پڑی رہی۔ ڈھائی بجے چائے کے وقت اس نے بڑے سنجیدہ اور متین لہجے میں کہا "کشور! اگر تم مجھے معاف کر دو اور تم کو میرے ساتھ جو پُرخلوص تعلق ہے اس میں خلل نہ پڑے تو میں آج تم سے ایک اعتراف کرنا چاہتی ہوں، اور منظور بھائی کے کردار اور زندگی کے متعلق تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ....."

میں نے کہا "شاہدہ! اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ میں اپنا دل اپنی ہتھیلی پر لیے پھرتی رہی ہوں اور تم نے مجھے پہلے دن سے اچھی طرح جان پہچان لیا ہے لیکن اتنی مدت میں میں نے بھی دھیرے دھیرے تمہارے کردار اور تمہاری اندرونی سرگزشت کا بہت کچھ اندازہ کر لیا۔ معاف کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر تم میری دشمن بھی ہو جاؤ تو تمہارے

میرے پُرخلوص تعلق میں بال برابر فرق نہ آئے گا۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی ورنہ مجھ کو تم سے اتنی شدید محبت نہ ہو جاتی۔ ہاں تو سنو ——— میں بچپن سے منظور بھائی کو پوجتی رہی ہوں۔ میری منگنی ان کے ساتھ ہوئی تھی اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میرے اباجی نے عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم مجھے جی کھول کر دلوائی تھی اور مزاج اور تعلیم و تربیت دونوں کے اعتبار سے اگر میں کسی کو بیک وقت اپنا حریف اور رفیق پاتی تھی تو وہ منظور بھائی تھے لیکن منظور بھائی کی سرفروشانہ سچائی اور ان کا جانبازانہ جذبۂ آزادی ہمارے درمیان حائل ہو گیا۔ ان کا ایمان ہے کہ جہاں سچائی اور آزادی نہیں وہاں محبت پنپ نہیں سکتی اور اباجی یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ منظور بھائی اپنی ذہانت اور قابلیت کے زور سے کوئی بہت بڑا عہدہ پا جائیں گے۔ اباجی خالص زمیندارانہ ذہنیت کے آدمی تھے اور ان کے تخیل کی معراج اس سے آگے نہ تھی کہ ان کا داماد دنیوی اور مادی اعتبار سے کامیاب ہو اور ان کی بیٹی کو سونے سے لاد سکے۔ منظور بھائی اس کے بالکل ضد ثابت ہوئے اور میرے باپ نے میرے مستقبل کا لحاظ کر کے ان کو اپنا داماد بنانے کا خیال بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ترک کر دیا اور میری شادی ایوب کے ساتھ ہو گئی۔ ایک شوہر کی حیثیت سے ایوب ایک معیاری ہستی ہے اور جہاں تک بیوی اور میاں کا تعلق ہے مجھے کسی قسم کی شکایت یا ناآسودگی کے اظہار کی وجہ نہیں ہے مگر اس کا کیا علاج کہ ایک مرتبہ جو خلا پیدا ہو گیا وہ معمور نہ ہو سکا۔ ایک کمی کا احساس زندگی میں باقی رہ گیا۔ کشور! تم سے بہتر اس المناک حقیقت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ جو آرزو انسان کی تخیل ہو اس کا پورا نہ ہونا کتنی بڑی نامرادی ہے۔ منظور بھائی میری تخیل تھے اور ہیں۔ ایوب اس راز کو جانتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں اور مجھ سے خوش ہیں۔ میں بھی ان سے بہت خوش ہوں۔ میں اپنے کو اس لحاظ سے بہت خوش نصیب سمجھتی ہوں۔ کشور! تم نے شاید میرے مزاج کا صحیح اندازہ کر لیا ہو۔ میری شادی ایوب کے ساتھ ہو گئی، منظور بھائی کی شادی خورشید کے ساتھ۔ میں منظور بھائی کو نہ پا کر بھی ان کی ویسی ہی محبت کرتی رہ گئی اور خورشید ان کو پا کر بھی محبت تو ایک طرف آج تک ان کی قدر نہ کر سکی۔ یہ پندار زندگی بھر میری روح کا سہارا رہا کہ منظور بھائی جہاں بھی رہیں اور سماج جس کے ساتھ چاہے ان کا دامن باندھ دے وہ جب تک اس دنیا میں سانس لے رہے ہیں میرے ہیں اور مشین کی طرح بے حس دنیا مجھے جس کے چاہے حوالے کر دے میں منظور بھائی کی ہوں۔ میں یہ سمجھتی رہی ہوں کہ منظور بھائی اور میں ایک دوسرے کے شریک ازلی اور ہم تقدیر ہیں۔ ایسے راسخ اعتقاد اور ایسے شدید اعتماد کے ساتھ میرا بائی نے اپنے کو کرشن کا بھی نہیں سمجھا ہو گا جیسا کہ میں اپنے کو منظور بھائی کا سمجھتی رہی ہوں اور جب وہ ہر طرف سے دامن سمیٹ کر بستی آ گئے تو سب ان سے علانیہ یا در پردہ آزردہ یا مایوس تھے لیکن میں بہت خوش تھی۔ نہ صرف اس لیے کہ اس طرح وہ مجھ سے بہت قریب رہیں گے اور میں روز ان کو دیکھ سکوں گی، ان کی زندگی اور زندگی بخش آواز سُن سکوں گی بلکہ خاص کر اس لیے کہ میں ان کی افتادِ طبیعت اور ان کے کردار سے اچھی طرح واقف تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ کسی فرد یا ادارہ کی ماتحتی اور پابندی زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتے اور آزادی اور بےباکی کے ساتھ وہ بستی میں جتنا خوش اور مطمئن رہ سکتے ہیں اتنا خوش دوسروں کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے ساتھ بہشت میں بھی نہیں رہ سکتے۔"

اتنا کہہ کر شاہدہ دم لینے کے لیے ایک لمحہ کے لیے رُک گئی۔ اس کے بعد مجھ کو دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر شروع کیا۔ "اور کشور! تمھارے آنے سے پہلے میں اپنے کو منظور بھائی کی اکیلی پجارن سمجھتی تھی لیکن اب تم بھی ان کی گرویدہ ہو اور منظور بھائی نے بھی تم کو اپنے دل میں ایک نرم گوشہ دے رکھا ہے۔ مجھے اس خیال سے بڑی راحت ہے کہ کوئی ہستی تو ایسی ہے جو اس قابل ہے کہ اپنے کو محبت اور محبوبیت کے ساتھ ان کی خدمت کے لیے وقف کر سکے۔ کشور! رشک و رقابت، بغض و عناد بڑے غیر انسانی جذبات ہیں۔

معلوم نہیں انسان صحیح معنوں میں ہر حالت سے برتر کب ہو سکے گا۔ یوں بھی مجھے تمہاری رفاقت پر ناز ہوتا لیکن یہ رفاقت اس احساس کی وجہ سے لامحدود اور لافانی ہو گئی ہے کہ تم نے بھی اسی کی محبت کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیا ہے جو میری آرزوؤں کا مرکز ہے۔ کشور! مجھ کو غلط نہ سمجھنا اور مجھ سے آزردہ یا کشیدہ نہ ہونا۔ میری واقعی دلی تمنا ہے کہ تم اور میں دونوں منظور بھائی کو چاہیں اور ان کو ہر طرح کے جسمانی، ماحولی اور روحانی خطرات سے بچائے رہنے کی جانبازانہ کوشش کریں۔ کشور! منظور بھائی کو میں ایک فرشتہ سمجھتی ہوں جو سوءِ اتفاق سے ملاءِ اعلیٰ سے باہر آ گیا ہو اور اب وہ واپس جانے کا راستہ بھول گیا ہو اور بھٹکتا پھر رہا ہو۔ کشور! آج میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ تم ایک ایسا عہد نامہ کرو جس کو صحفِ آسمانی کی زبان میں میثاق کہتے ہیں۔ بولو منظور ہے؟ . . . ''

شاہدہ پھر رک گئی اور میرے چہرے پر نگاہیں جما کر دیکھنے لگی۔ میرے جذبات بڑے مخلوط اور پیچیدہ تھے۔ میں نہ صرف شاہدہ کے جذبات کی معصومیت اور پاکیزگی کی معترف ہو رہی تھی بلکہ اس کو اپنے سے بہت زیادہ بلند اور مقدس پا رہی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ کسک بھی دل میں محسوس کر رہی تھی کہ کاش میں بھی شاہدہ کی سی بلند اور رفیع شخصیت کی مالک ہوتی اور ایسی شخصیت لے کر یزدان کو تنہا چاہنے والی ہوتی۔ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر نہ کہوں تو فریب ہوگا کہ تھوڑی دیر کے لیے میرے اندر وہ جذبات ابھر آئیں جن کو رقابت ہی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ میری زبان جیسے بندھ گئی ہو۔ میں چند لمحوں تک کچھ نہ کہہ سکی۔ شاہدہ میری کشمکش کو سمجھ گئی۔ میری طرف جھک کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی "کیوں کشور! یہ سکوت کیسا؟ تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟ آج عجب قسم کی ہذیانی کیفیت طاری ہے۔ یہ منظور بھائی کی بیماری کا ہذیان ہے۔ میں آج بغیر تمہارے جواب . . سنے ہوئے یہاں سے ہٹوں گی نہیں۔ مجھے تم کو اور پوری صورتِ حال کو قطعی اور آخری طور پر سمجھنا ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنا ہے کہ مجھے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے . . . . . ''

میں نے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے کچھ کہنا چاہا لیکن شاہدہ نے یہ کہتے ہوئے مجھے روک دیا "ٹھہرو میری پوری بات سن لو۔ شاید تم کو ایسے خیالات کی توقع نہ ہو لیکن سنو۔ اگر تم کو واقعی یقین ہے کہ منظور بھائی جیسی دوسری ہستی تم کو آج تک نہیں ملی تو یہ بھی یقین کر لو کہ مجھ جیسی دوسری عورت بھی تم کو اب تک نہ ملی ہے نہ ملے گی۔ یہ سچ ہے کہ میں اس تعلیمی جلا سے محروم ہوں جو تم کو اور منظور بھائی کو خاطر خواہ میسر ہوئی ہے لیکن خارجی تعلیم و تربیت ہی سب کچھ نہیں ہے، انسان کی کچھ پیدائشی صلاحیتیں بھی ہوتی ہیں جن کو تمام رکاوٹوں اور محرومیوں کے باوجود بغیر کسی خارجی امداد کے وہ فروغ دے سکتا ہے۔ میں سوچتی رہی ہوں کہ آخر انسان رشک و رقابت، بغض و حسد، بدبینی، کم نگاہی، خود پرستی، غیر انسانی حیوانی کے پردے میں جھوٹ کی حمایت کے بہیمانہ میلانات سے پاک کب ہوگا۔ کشور! یہ کب ہوگا کہ اچھائی یا حُسن کی پرستش سب کریں اور سب پرستار ایک دوسرے کے صحیح معنوں میں ہر لحاظ سے اور ہر وقت رفیق اور خیر خواہ رہیں؟ اگر حسین چیز ایک قوت ہے، اگر حسین چیز ایک فطری مسرت ہے تو وہ ایک کے لیے نہیں ہے سب کے لیے ہے۔ پھر یہ کب ممکن ہوگا کہ ایک ہستی کو بہت سے لوگ چاہیں اور ایک ہستی بہت سے لوگوں کو چاہے؟ مگر تم کہتی ہوگی کہ آج شاہدہ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسی ہذیانی باتیں کر رہی ہے؟ یہ ہذیان نہیں ہے۔ یہ سوالات اور تردّدات مجھے سالوں سے بے چین کیے ہوئے ہیں۔ میں اپنے اس خروش کو اس وقت سے دبائے ہوئے ہوں جب سے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں اور منظور بھائی ایک دوسرے کے شریکِ زندگی نہیں ہو سکتے لیکن دنیا نے مجھے ان کی زندگی میں شریک نہیں بنایا! تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں خیال اور ارادہ سے اور جہاں تک دنیوی علائق کے بندھن مجھے اجازت دیتے ہیں عملی طور سے بھی ہر حال میں ان کی ہمدرد اور رفیق ہوں۔ مجھے یہ ایمان سہارا دیے ہوئے ہے کہ وہ جو کچھ سوچتے یا کرتے ہیں، موجودہ سماج کو اس سے لاکھ اختلاف ہو وہ برحق ہے۔ مگر میں بہت تھک چکی اور تم نے سکتہ کی

جذبات تحمل کے ساتھ سُنا۔ اب تم کیا کہتی ہو؟"

شاہدہ نے اپنی بات ختم کی تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی ساری ہستی کی دولت لُٹ گئی ہو۔ اس کے چہرے پہ ایک تمتماہٹ تھی اور اس کے سارے بدن میں ایک ہلکی کپکپی۔ اس کے ہونٹوں پہ پپڑیاں جم رہی تھیں جیسے اس کو بخار چڑھا ہو۔ اس نے ایک گلاس پانی مانگا۔ خود میرے بدن میں ایک لرزش سی تھی۔ کچھ نہیں سمجھ سکی میں کس طرح سے اٹھی اور گلاس میں پانی لا کر اس کو پلایا۔ پانی پی چکی تو وہ سراپا انتظار و امید ہو کر میری صورت دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میرا دل دیر سے اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ میں ضبط نہ کر سکی اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میں نے اس کو لپٹا لیا اور کہا "شاہدہ! تم کتنی بلند و برتر ہستی ہو۔ تمہارے سامنے مجھے اپنے وجود سے خجالت ہو رہی ہے۔ تمہارے فکر و احساس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تم کو پرستان کی زاد اور رومانی دنیا کی تشبیہ زیبا ہی ہوگی۔ لوگ اس کی مجاز اور حقیقت، سبزہ اور گل کی فرسودہ اور بے معنی اصطلاحات استعمال کر کے جو دور از کار تاویل چاہیں کریں اس وقت تو یہ اشعار میری اور تمہاری نمائندگی کرتے ہیں۔ سنو کتنے احساس خیز اور فکر انگیز اشعار ہیں:

یکے قطرہ از ابر باراں چکید   خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ آنجا کہ دریاست من کیستم   گر او ہست حقا کہ من نیستم

مجھے یقین ہے کہ اس زندگی میں اگر پرویز کا کوئی ساتھ دے سکتا تھا تو وہ تم ہو۔ مجھے تم سے کوئی رقابت نہیں ہو سکتی۔ یہ سچ ہے کہ پرویز سے قطع کرنا اب میرے لیے بڑی سخت آزمائش ہوگی۔ ان کے بغیر میری زندگی سنسان اور تیرہ و تار ہوگی لیکن مجھے اس خیال سے آج راحت محسوس ہو رہی ہے کہ تم جیسی عورت ان کو اس محبت اور ایثار کے ساتھ چاہتی ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہو رہا ہے کہ اگر میں نہ رہوں تو بھی کوئی صدق اور سچائی کے ساتھ پرویز کی زندگی کے درد کو محسوس کرنے والا ہے اور ان کو خطروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ وار سکتا ہے۔ ایسے دو ازلی رفیقوں کو دنیا نے رفاقت کی اجازت نہیں دی، اس سے بڑا ظلم نہیں ہو سکتا اور پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ پرویز تمہارے خیال اپنے دل سے نکال کیسے سکے؟ شاہدہ! میں تم کو محبت میں اپنی توام بہن سمجھتی ہوں، اس سے زیادہ کیا کہوں؟ اس وقت میری زبان میرے احساسات و خیالات کا ساتھ نہیں دے رہی ہے ......"

شاہدہ نے ایک والہانہ انداز میں کہا "دیکھو کشور! منظور بھائی کو کوئی الزام نہ دو۔ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تم نے تمام ادعائے محبت کے باوجود ان کو نہیں سمجھا۔ بقول شاعر:

تجھے تیر سمجھا ہے یاں کم کسو نے"

میں نے شاہدہ کی بات کاٹ کر کہا "شاہدہ! میں اس نازک معاملہ میں تم سے بحث کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر تقدیر کے تصور کو تھوڑی دیر کے لیے برقرار رکھا جائے تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم اور پرویز دونوں ہستیاں ایک دوسرے کی شریک ازلی ہم نفس ہو۔ آج اگر پرویز آزاد ہوتے اور تمہارے گلے میں جوا نہ پڑ چکا ہوتا تو میں اپنی تمام شدتِ محبت کے باوجود تمہارے حق میں پرویز سے دست بردار ہو جاتی اور تم کو بڑے حوصلوں کے ساتھ ایک دوسرے کے حوالے کر کے سمجھتی کہ میری اپنی مراد پوری ہو گئی۔"

شاہدہ نے میرے گلے میں باہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک عجیب مدہوشی کے ساتھ پوچھا "سچ کشور!" اور پھر کہنے لگی "تم جانتی ہو میں کیا کرتی؟ میں اپنے کو اور پرویز کو تمہارے حوالے کر دیتی اور تم کو مجبور کرتی کہ میرے ساتھ تم بھی پرویز کی ہم تقدیر بنی رہو۔"

کے سامنے خلوص، فراخدلی اور حوصلہ مندی کی ایک تخیلی مثال پیش کرتی . . . . " اتنا کہہ کر وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ میں وہ شوخی تھی جو صرف معصومیت اور سچائی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کا سارا ہیجان و اضطراب دور ہو گیا۔ اس نے بڑی پاکیزہ شرارت کے ساتھ مجھے بھینچ کر لپٹا لیا اور کہا: "اور کشور تم کو معلوم ہے میں اور کیا کرتی؟ میں اکثر اپنی راتیں تم کو دے دیتی اور اس خیال سے خوش ہوتی کہ تم اور منظور بھائی دونوں خوش ہیں مگر تم بھی شاہد دنیا کی طرح یہ سمجھ رہی ہو کہ میں باؤلوں کی سی باتیں کر رہی ہوں لیکن کشور! میں نے جو کہا ہے وہ مذاق ہے نہ دیوانہ پن۔"

میں حیرت اور سکتہ کے عالم میں شاہدہ کا منہ تک رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ خواب ہے یا اصلیت۔ پرویز کو تو میں ایک دوسرے عالم کی مخلوق ایک مدت سے سمجھ رہی تھی لیکن آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شاہدہ بھی کسی کہکشاں یا قوسِ قزح کی بستی کی رہنے والی ہے جو ہم لوگوں سے بہت برتر ہے۔ شاہدہ نے مجھے خاموش پا کر کہا: "کیوں کشور کیا سوچ رہی ہو؟"

میں نے اس کو پیار کر کے کہا: "کچھ نہیں شاہدہ، میں یہ سوچ رہی تھی کہ تم ہم جیسی ہی ارضی مخلوق ہو یا کوئی فردوسی تیتری ہو جو کسی مخالف ہوا کے ایک جھونکے میں اس دنیا میں آ پڑی ہے۔"

شاہدہ نے ہنس کر کہا: "میں انہی چار عناصر سے بنی ہوں جن سے تم بنی ہو۔ لیکن اب بہت دیر ہو گئی، اب مجھے چلنا چاہیئے۔ کل پھر آؤں گی اور تم کو بتاؤں گی کہ تمہارا پرویز کس دنیا کی مخلوق ہے۔"

مجھے واقعی محسوس ہوا کہ باتوں میں وقت گزر گیا اور عصر کا وقت آ گیا۔ میں نے کہا: "شاہدہ! آج تم نے مجھے بہت سی نئی بصیرتیں دی ہیں۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔"

شاہدہ نے بڑے سنجیدہ تیور اور گمبھیر لہجے میں کہا: "خدا منظور بھائی کو اپنی پناہ میں رکھے اور ان کو ہر طرح کے خطروں سے بچائے رہے۔"

شاہدہ چلی گئی اور مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

رات چور اور چاند

بلونت سنگھ

(مسلسل)

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جوالا سنگھ کالی لوئی بدن پر لپیٹتا ہوا اپنے گھر میں سے نکلا اور جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا گاؤں کی گلی میں گھس گیا۔ نیم تاریک گلیوں میں گھومنے والی آوارہ بھیڑیوں کو دھتکارتا ہوا کرم دین کے گھر پہ پہنچ گیا اور اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ پہلی بار تو خاموشی طاری رہی دوسری بار کنڈی بجانے پر اندر سے ہلکی سی آواز آئی، پھر کرم دین رضائی لپیٹے باہر نکلا۔ جوالا سنگھ کو دیکھا تو ذرا گھبرا سا گیا کہ آخر اس قدر بے وقت آنے میں کیا بھید ہے۔

وہ زمانے کا نشیب و فراز دیکھے تھا بظاہر دل کا حال چھپا کر بولا۔

"آؤ بھئی جوالا سنگھ اندر چلے آؤ۔"

اندر لے جا کر اسے تکریم سے چارپائی پر بٹھایا اور خود ذرا پرے ہٹ کر حقے کے ہلکے ہلکے کش پینے لگا۔ کرم دین کو معلوم تھا کہ ڈاکے والا معاملہ تو ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے بالکل دب گیا تھا اب نہ جانے اور کیا آفت آن پڑی تھی۔

"کیا سو گئے تھے" جوالا سنگھ نے بات شروع کی۔

"نہیں تو ــــ میں بوڑھا آدمی ٹھہرا اب اتنی نیند کہاں؟ ابھی ابھی تو میں نے حقہ تازہ کیا تھا۔ ذرا اونگھ آئی کہ تم نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ . . . . لیکن بھئی تم جو اس بے وقت آئے ہو اس لئے دل میں کھُد بُد ہو رہی ہے کہ کوئی خاص بات ہے . . ."

"ہے تو خاص بات" جوالا سنگھ نے کھانس کر گلا صاف کیا اور پھر کرم دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

کرم دین کا ذہن کچھ کام نہیں کرتا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو رہا تھا۔

جوالا سنگھ نے رازدارانہ لہجے میں کہنا شروع کیا "ایک بہت بڑی خبر آئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ٹنڈپور والوں نے پالا سنگھ کو جان سے مار دیا ہے۔"

حقے کی نے کرم دین کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور حقہ گرنے سے بال بال بچا۔

"نہیں . . . . . یہ کبھی نہیں ہو سکتا . . . ."

" ہاں مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا ـــــ لیکن یہ بات سچ ہے "
" تم سے کس نے کہا "
" ٹنڈ پور کے دو چمار یہ خبر لائے ہیں "
" انھیں کس نے بتایا ...."
" وہ کہتے ہیں جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا انھوں نے بتایا ہے "
" لیکن پالا سنگھ مار کھانے والی آسامی نہیں ہے "
" شاید اسے دھوکے سے مارا گیا ہو "
" آخر اس کا کچھ سبب بھی تو ہونا چاہیئے "

جوالا سنگھ کو کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ بولا " بھئی اس سے زیادہ مجھے کچھ خبر نہیں ... اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں یہ خبر پاتے ہی پہلے تمھارے پاس لپکا ہوا آیا ہوں۔ تمھارے مشورے ہی سے کچھ کرنا ہوگا "

کرم دین سوچ میں پڑ گیا پھر سر ہلا کر بولا " ہائے کیسا کرارا جوان تھا۔ بھئی خدا کرے یہ خبر غلط ہو...... ایسی دشمنی بھی کس کی تھی اس سے ....."

" کیا پتہ خدا ہی اُلجھ پڑا ہو کسی سے "
" ہاں بھئی کیا پتہ ہے اس کا "

یہ کہہ کر کرم دین پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ چند ثانئے کے بعد اس نے سر اُٹھایا اور جوالا سنگھ کے چیچک بھرے چہرے کی جانب دیکھ کر بولا۔

" بھئی ایک بات اور ہے میرے خیال میں تایا ہر پرشاد سے ملنا چاہیئے "

" یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ بھی بڑا سیانا آدمی ہے لیکن میں پہلے تمھارے پاس چلا آیا۔ کیونکہ وہ ذرا پڑھا لکھا آدمی ہے اور پڑھے لکھے آدمی کی کھوپڑی کا ایک آدھ پیچ ضرور ڈھیلا ہوتا ہے ... چلو اب اس کے پاس چلیں ... اگر یہ خبر سچ ہے تو ہم پالا سنگھ کے قاتلوں کا آج ہی سپھایا بول دیں گے "

" دیکھو جلد بازی مت کرو اور نہ ابھی شور ہی مچاؤ "

جب وہ دونوں دروازے سے باہر نکلے تو آگے سے نواب کندھے پر لٹھ دھرے آتا دکھائی دیا۔ جوالا سنگھ نے للکار کر کہا " اوئے نواب یہ بے وقت کہاں کو جا رہے ہو بھاگے ہوئے "

انھیں دیکھ کر نواب فوراً ان کے قریب چلا آیا اور گھبرائی آواز میں بولا " میں پالی کے گھر جا رہا ہوں میں نے بہت بُری خبر سُنی ہے کہ ٹنڈ پور والوں نے پالی کو بہت مارا ہے ......"

" بہت مارا ہے یا جان ہی سے مار دیا ہے "
" نہیں جان سے تو نہیں مارا لیکن شاید مار دیں "

" مگر اس کو مارنے والے ہیں کون " کرم دین نے سوال کیا۔

" اوسے وہی پرلتی پال سنگھ کے کھاندان والے تو ہیں اور کون ہوتا . . . "

" آکھران کی کیا دشمنی ہے جی ؟"

نواب نے اصل راز سے پردہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ بولا " بھئی ہے تو عورت وورت کا جھگڑا . . . "

اس پر جوالا سنگھ کے کان کھڑے ہو گئے " اچھا بھئی جرا کھل کر بتاؤ . . . "

" کھل کر کیا بتاؤں یونہی کیا س سے کہتا ہوں کوئی جر دری تو ہے نہیں یہی بات ہو "

کرم دین نے نواب سے کہا " دیکھو ابھی پالی کی ماں کو اس کی کوئی کھبر نہ دو، نہیں تو وہ سارا گاؤں سر پہ اٹھا لے گی آؤ تم ہمارے ساتھ تایا ہر پرشاد کے پاس چلو ؟"

ان تینوں نے تایا ہر پرشاد کو جا جگایا۔ وہ بچارا بھونچکا سا رہ گیا کہ آخر نصف رات گئے یہ کیا مصیبت آن پڑی۔ جب اسے ساری کہانی کا پتہ چلا تو وہ بولا " بھائیو اب تو جلد از جلد کچھ کرنا چاہیئے۔ راستے میں شنگارے کو کہتے چلو کہ گاؤں میں پہنچتے ہوئے جوانوں کو بھی کھبر کر دے اتنے میں ہم جوالا سنگھ کے گھر میں بیٹھ کر مشورہ کر لیں گے۔

جوالا سنگھ کے وہاں کوئی نہ کوئی چور اُچکا پناہ لینے کے لئے آ ہی نکلتا تھا ہر روز۔ اس رات بھی دو آدمی آئے ہوئے تھے جو صورت سے ٹھگ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی صورتیں مکروہ اور تیور شیطانی نظر آتے تھے۔

رفتہ رفتہ لوگ اکٹھا ہونے لگے۔

نواب کی اطلاع یہ تھی کہ پالا سنگھ ابھی تک جان سے نہیں مارا گیا تھا۔

جس طرح جنگل میں دو خشک بانسوں کی رگڑ سے چنگاری پیدا ہو کر آناً فاناً سارے جنگل میں آگ بھڑک اٹھتی ہے اسی طرح گاؤں کے جوانوں کے کانوں تک بھنک پہنچتے ہی وہ جوق در جوق جوالا سنگھ کے گھر پہ جمع ہونے لگے اور جوں جوں لوگ جمع ہوتے جاتے تھے توں توں موقعہ کی نزاکت اور اہمیت کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔

پالا سنگھ کی بابت تفصیلی خبر نہیں مل سکی۔ اس وقت تک متضاد قسم کی خبریں ملی تھیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ معاملہ نازک تھا جو کچھ کرنا ہو وہ فوراً ہونا چاہیئے۔

مختلف قسم کے منصوبے باندھے گئے۔ یہ ڈنگا کی عزت اور آبرو کا سوال تھا۔ گاؤں کے طاقتور ترین نوجوان کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر ٹنڈ پور والے اس طرح پالی کو گتے کی موت مار کر اسے کہیں غائب کر دینے میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً بڑی مشکل کا سامنا ہوگا۔ یہ بات ڈنگا کی روایات کے سراسر خلاف تھی۔ اور اس نگر کی جو ساکھ سالہا سال سے قائم تھی وہ مٹی میں مل جائے گی۔

جوالا سنگھ نے سرخ آنکھیں گھما کر کہا " واہگورو نہ کرے کہ پالی کو کوئی آنچ آئی ہو لیکن اگر اس کا بال بھی بینکا ہوا تو ہم پٹھن کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور ان کی عورتوں اور بچوں سب کو ختم کر دیں گے ؟"

ہر پرشاد نے جوالا سنگھ کو چپ کراتے ہوئے کہا " سردار صاحب! اس وقت تو یہ سوچئے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔

کونسا قدم کس طرح اُٹھانا ہوگا ۔"

یہ صلاح بھی ٹھہری کہ مخالف پارٹی کو پیغام بھیج دیا جائے کہ وہ پالی کو صحیح و سالم ہمارے حوالے کر دیں ورنہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی ...... اس پر نواب کو بڑا طیش آیا جھک کر بولا " دیکھئے اس طرح کام نہیں چلے گا۔ میں آپ سب سے ایک ہی بات کہوں گا کہ ہم لوگوں کو ہر طرح سے طیار ہو کر ان پر حملہ کر دینا چاہیئے جو ہو سو ہو ———— پالی کو ان سے اس طرح طلب کرنے میں ہماری توہین ہے ۔ ہم طاقت سے اسے چھین کر لائیں گے اور اگر ہم نے پالی کا پتا نہ پایا تو پھر جو ہم سے بن پڑے گا کریں گے ۔"

جوالا سنگھ کا تو پہلے سے ہی یہ خیال تھا وہ تہبند پھڑ پھڑاتا ہوا اُٹھا اور اس نے اپنے طویل اور عریض صحن میں اپنی لاٹھی سے زمین پر لکیر کھینچتے ہوئے بھاری آواز میں بولا " میرا بھی یہی خیال ہے ...... اب جس مائی کے لال کو میدان سے پیچھے نہیں ہٹنا ہے اور جو جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن سے ٹکر لینے کو طیار ہو وہ اس لکیر سے اِس پار چلا آئے ۔"

اس براہِ راست چیلنج پر چند لمحوں تک تو سکوت طاری رہا، پھر من چلے جوان لکیر کے اس پار آنے لگے ۔

بڑے بوڑھوں کے سوا سب لوگ لکیر پار کر چکے تھے ۔ ان میں سے ہر ایک خود سر اڑیل جوان تھا بھلا پیچھے کون رہتا ۔ انھیں یک جا جمع دیکھ کر جوالا سنگھ نے گہری سانس لی اور اس کا سینہ اُبھر کر بہت بڑے صندوق کے مانند دکھائی دینے لگا ۔ اس نے اپنی موٹی گردن گھما کر ان سب کا جائزہ لیا ۔ اس نے اپنے دو مہمانوں کو بھی ان میں شامل کر لیا ۔ اور پھر بولا " اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے ۔"

کرم دین اور ہر پرشاد محتاط ضرور تھے لیکن نوجوانوں کے جوش و خروش کو دبانا ناممکن تھا ۔ بلکہ اس وقت تو ان کی سوکھی رگوں میں بھی گرم گرم خون گردش کرنے لگا ۔

ہر پرشاد اور کرم دین نے آپس میں مشورہ کر کے کہا " لیکن بھائی اس بات کا خیال رہے کہ یہیں سے شور مچاتے ہوئے مت جانا ۔ ابھی تو کسی کو کانوں خبر بھی نہیں ہونی چاہیئے ...... اور دیکھو بھئی جوالا سنگھ اگر پالی زندہ ہو تو کوشش اسی بات کی کرنا کہ بغیر کسی کو جان سے مارے تمھارا کام بن جائے ، یوں لڑنا پڑے تو بے شک ڈٹ کر لڑو لیکن اگر کسی کی جان نہ لو تو اچھا ہے ۔"

اس فساد کے نتائج بھی دونوں بوڑھوں کے پیشِ نظر تھے ۔

اس وقت جوالا سنگھ سب کو سامان بانٹنے میں مصروف تھا ۔ ہر جوان کو ایک مضبوط ڈا اور بوقتِ ضرورت اس پر چڑھانے کے لئے چھوی ، بعض نے صفا جنگ لینے پر بھی اصرار کیا لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ صفا جنگ ہمراہ لے لئے جائیں ۔ اس خطرناک ہتھیار کا استعمال محض بوقتِ ضرورت ہی کیا جائے ۔ یوں ساتھ لے جانے کو تو جوالا سنگھ کے دو مہمانوں نے موٹر کے اسٹیرنگ کی نالیوں کی بنی ہوئی بندوقیں اور ایک تھیلا کارتوسوں کا بھی ہمراہ لے لیا ۔ جوالا سنگھ نے لاٹھی اور چھوی کے علاوہ دیسی ساخت کا بے ڈول بڑا سا پستول تہبند میں اُڑس لیا ۔ اور پھر ہر پرشاد کی بات کا جواب دینے کے لئے گھوم کر ان کی طرف تیز و تند نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا " اس چیز کا فیصلہ تو اُنھیں پر ہے ۔ اگر موت اُن کے سروں پر منڈلا رہی ہے تو

پھر کوئی طاقت بھی انھیں بچا نہیں سکتی۔"

کل چھتیس آدمی ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس جوالا سنگھ کے گھر سے نکلے۔ جنتو جو ہتھیار بانٹنے میں مصروف رہی تھی اسے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ حالانکہ وہ ان کے ہمراہ جانا چاہتی تھی۔

یہ قافلہ تیز تیز قدم اٹھاتا کھیتوں میں اگی ہوئی فصلوں کو روندتا ہوا طوفانی سیلاب کی مانند بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ سامنے چاندنی کے دھندلکے میں ٹنڈ پور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کچھوے کے مانند نظر آنے لگا۔

جوالا سنگھ نے قدم روک کر ساتھیوں کی جانب ایک نظر دیکھا اور دغرا کر بولا "جوانو! اب ہم منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اب بھی موقعہ ہے۔ تم میں سے جو کوئی واپس جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آگے بڑھ کر جس کسی نے بھی قدم پیچھے ہٹایا تو یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

جوالا سنگھ کی یہ بات خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ تاہم ان میں سے ہر ایک نے آگے بڑھنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

اب سارے گاؤں کی ناکہ بندی کر دی گئی تاکہ برھمی پال سنگھ کے خاندان کا کوئی فرد بھاگ نہ سکے۔ احتیاطاً ہر گلی کی ناکہ بندی کے لئے دو دو آدمی روانہ کر دیئے گئے باقی لوگ کھیتوں میں جھک جھک کر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے جگمگاتی ہوئی چھویاں اور آسمان کی جانب اٹھی ہوئی بندوقوں کی نالیاں ایک نئے طوفان کا پتہ دیتی تھیں۔

پالا سنگھ کو اس علاقے میں سب لوگ جانتے تھے، برھمی پال کے آدمیوں نے اسے بری طرح پیٹا تو ضرور تھا لیکن چونکہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہ سکی تھی اس لئے وہ اسے جان سے مار ڈالنے سے ہچکچاتے رہے اور پھر ادھر ادھر کے لوگوں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ اول تو جو سلوک وہ اب تک پالی کے ساتھ کر چکے تھے اسی کا نتیجہ ان کے حق میں بہت برا نکلے گا لیکن اگر کہیں اس کی موت ہو گئی تو پھر وہ خود بھی بچ نہیں سکیں گے۔

اس پر ان لوگوں کو بہت طیش آیا۔ ایک تو زیادتی سراسر پالی کی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ دھمکیاں۔ لیکن جاننے والے کہتے تھے کہ جو کچھ پالی نے کہا تھا اسے نظر انداز کر دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ اس طرح جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ وہ پالی کو جان سے مار ڈالنے کا پروگرام فی الفور پورا نہ کر سکے۔

پالی بھوسے کی کوٹھری میں بند تھا۔ اس کے زخم اسے مار ڈالنے کے لئے کافی تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی جائے مگر وہاں اس کا کون تھا چنانچہ وہ بدستور نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔

نصف رات گذر چکی تھی۔ سارے گاؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ در و دیوار اور مکانوں میں کھڑے ہوئے پیپل کے پیڑ بے حد پراسرار دکھائی دیتے تھے۔ کتنے اناج بھوننے والی بھٹیوں کے اندر دبکے پڑے تھے۔ سردی کی شدت کی وجہ سے کوئی شخص ادھر ادھر پھرتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بھینس و دیگر مویشی تک چھپروں کے نیچے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گاؤں کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ نہ جانے اب کیا طوفان آئے۔

دفعتہً ٹھیں کرتی ہوئی بندوق کی گولی رات کی مکمل خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی

گاؤں میں کئی اشخاص نے آنکھیں کھول دیں۔

دوبارہ ایک اور گولی کی آواز سنائی دی۔

لوگوں نے کہا کہ پہتیں کے مکان کی جانب سے بندوق چلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

گھر والوں کے کان بھی کھڑے ہوگئے۔ پرتھی کا باپ چھت پر چڑھ گیا کہ شاید قریب کی کھیتوں کی جانب کچھ دکھائی دے۔ اس کے ہاتھ میں بھی پکی رائفل تھی۔ دھندلی روشنی میں اس نے سر اٹھایا ہی تھا کہ ایک گولی شائیں سے آئی اور اوپر رکھی ہوئی ایک ناکارہ مدھانی کا ایک سرا صاف اڑ گیا۔ اور اس کے بعد تو تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں معلوم ہوتا تھا کہ باقاعدہ فوج نے حملہ بول دیا ہے۔ گاؤں میں لوگوں نے چلانا شروع کر دیا کھیتوں میں بلند جنگی نعروں اور گالیوں کی بوچھار شروع ہوگئی غرض کہ کچھ ایسا ہنگامہ مچا کہ مویشی کھونٹوں سے رسیاں تڑا کر بے مہار بھاگ نکلے۔ کتنے کمین گاہوں سے نکل کر بے تحاشہ بھونکنے لگے۔ ایک آدھ چھپر اگنے پر بٹیاؤں ٹیاؤں کا شور مچانے لگی۔

کوئی شخص ڈر کے مارے گھر سے باہر قدم نہیں نکالتا تھا۔ جن لوگوں کو اس واقعہ کا علم تھا وہ سمجھ گئے کہ پرتھی کے گھر والوں پر آفت نازل ہوچکی ہے۔ اس کے ساتھ سب کو اپنی اپنی جان و مال کی فکر بھی لاحق ہوگئی انھیں اس بات کا علم تھا کہ ان لٹیروں سے کوئی بات بھی بعید نہ تھی۔ ممکن ہے اسی بہانے سے گاؤں بھر کو لوٹ لے جائیں۔

اسی ہنگامے میں بیس پچیس آدمی پرتھی کے مکان کی جانب بڑھے۔ کچھ تو پیچھے چھپ گئے اور انھوں نے نگاہ چھت پر رکھی تاکہ اگر اوپر سے کوئی شرارت ہو تو گولی داغ دیں اور کچھ نچلے دروازے پر پہنچ کر گالیاں دے دے کر دروازہ کھولنے کے لئے للکارنے لگے۔

جب اس طرح دروازہ نہیں کھلا تو انھوں نے کندھوں سے دھکے مار مار کر دروازہ توڑ ڈالا۔ شاید اس قدر شدت سے حملہ نہ کیا جاتا تو پالی ان کے حوالے کر دیا جاتا ———— اب یہ سمجھا گیا کہ لڑائی ناگزیر ہے۔ چنانچہ چند لٹیرے بازو کھلاتے ہوئے آئے اور اندھادھند لاٹھیاں گھمانے لگے۔

اب باقاعدہ لاٹھیوں سے لڑائی ہونے لگی۔ چھوریوں اور بندوق یا پستول کا استعمال نہیں ہوا۔ مدافعت کرنے والے مٹھی بھر آدمی چند گھڑی بعد یا زخمی ہو کر گر پڑے یا بھاگ نکلے اور میدان حملہ آوروں کے ہاتھ رہا۔ پرتھی پال سنگھ کے قریبی رشتے دار رائفل چلاتے پہلے ہوئے تھے لیکن پرتھی پال سنگھ کی ماں نے چلا کر کہا "بھائیو! ہمیں کچھ مت کہو تمہارا آدمی اس کمرے میں بند ہے۔"

دو چار آدمی ادھر بھاگے۔ دروازہ کھول کر پالی کو باہر نکالا گیا۔

دفعتاً آواز بلند ہوئی "پالا سنگھ مر گیا ہے۔"

اس پر جوالا سنگھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے چلا کر کہا "اوئے شیرا"۔ لاٹھی پر چھوی چڑھا لو جرا۔ شیرا چھوی چڑھانے لگا۔ اور جوالا سنگھ کا اشارہ پا کر پرتھی پال سنگھ کے گھر کے سارے افراد کو عورتوں اور بچوں سمیت کھدیڑ کر مکان کے سامنے کھلی جگہ میں لے آئے۔ مردوں نے کچھ مدافعت کی کوشش کی لیکن ان پر قابو پا لیا گیا۔

قریب تھا کہ ان کے سر گاجر مولی کے مانند کٹنے شروع ہو جائیں۔ اڑوس پڑوس کے لوگ جو ان کی مدد کی جرأت نہیں کر سکتے تھے چپکے چپکے اپنے مکانوں ہی میں سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے ———— عین اس وقت پالی کا سر ہلا۔ پھر شور مچ گیا "پالی زندہ ہے ... پالی زندہ ہے"۔

اس طرح بے گناہوں کے سر کٹنے سے بچ گئے۔

بے ہوش پالی کے جسم کو ایک چارپائی پر ڈال کر کندھوں پر اٹھا لیا گیا اور وہ سب اپنے گاؤں کو روانہ ہو گئے۔

حملہ آور بگولے کی طرح آئے اور آندھی کے مانند چلے گئے۔

لیکن جاتے جاتے جوالا سنگھ نے پھیکی چاندنی میں چمکتی ہوئی چھوی ہلائی اور کہا کہ اگر پالی کی جان نہ بچ سکی تو پھر لوٹ کر آؤنگا اس گھر کے ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

پالی تو خیر بچ نکلا۔ لیکن اس واقعہ کے دوسرے روز ہی پرتھی پال سنگھ کے گھر والے شہر کے ایک رشتے دار کے وہاں چلے گئے۔

پولیس میں رپورٹ ہوئی تو شام سے پہلے پہلے پولیس ڈنگا پہنچ گئی اور پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔

اس ہنگامے میں حصہ لینے والے سارے آدمی حراست میں لے لئے گئے۔

گاؤں میں بڑی گہما گہمی رہنے لگی۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے خاصی مدت کے بعد اس قدر زوردار واقعہ پیش آیا تھا گاؤں میں گھر گھر سے مقدمہ لڑنے کے لئے چندہ وصول کیا گیا۔

اردگرد کی بستیوں میں بھی یہ بات مشہور ہو گئی لوگ اس مقدمے کی خبریں سننے کے لئے بے چین رہتے تھے ہر رہٹ، ہر دھرمشالہ اور ہر گوردوارے میں اسی واقعہ کا چرچا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ آخر پالی نے پرتھی پال سنگھ کو کیوں مارا۔ اس پر خوب چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔

چند دنوں بعد بالا سنگھ کے زخم بھر گئے اور وہ ایک مرتبہ پھر مشکی گھوڑے کے مانند چاق چوبند للکارتا ہوا گھومنے لگا۔ لیکن زیادہ تیزی سے حصہ لینے والوں کی ضمانتیں بھی منظور ہو گئیں۔

چھ مہینے تک مقدمہ چلتا رہا۔ آخر فیصلہ ہوا تو ہر ایک کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملی۔

بالا سنگھ کو ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

دلِ مرحوم

شوکت تھانوی

ایک تو دل یوں ہی کمزور ہے اس پر طرّہ یہ کہ روسی پروفیسر کوانوف کی تقریر نے اس کمزور دل کو ایسا ہلایا کہ جب میں تقریر سُن کر ہال سے نکلا ہوں تو محسوس یہ ہو رہا تھا کہ میں سرتا بقدم دل ہوں اور وہ دل بھی دہشت و اختلاج میں مبتلا ہو۔ چونکہ میں سرتا بقدم دل ہی دل تھا لہٰذا دماغ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ البتہ میں اپنے اس انجام سے لرزہ براندام تھا کہ یہ ڈوبتا ہوا دل کسی نہ کسی دن مجھ کو ڈبو کر رہے گا اور زہرہ بے چاری جو میری وفاؤں کا دم بھرتی رہتی ہے میرے قلب کی حرکت بند ہونے کے بعد صحیح معنوں میں سمجھ پائے گی کہ میں دراصل کتنا بڑا بے وفا تھا۔ رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ کہیں میری یہ محبت بھی دل کی کمزوری کا نتیجہ تو نہیں ہے۔ اچھا فرض کر لیجئے کہ ہے تو بھی اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو محبت ہو ہی چکی ہے اور اس حد تک ہو چکی ہے کہ زہرہ بھی اس کی قائل ہو کر محبت کا جواب محبت سے دے رہی ہے۔ اور کوئی ہوتا تو اس موقع پر یہ مصرع ضرور لکھ دیتا کہ۔ ع

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

مگر میں اپنی محبت کی اس قسم کے مصرعوں سے توہین کرنا نہیں چاہتا۔ مجھ کو تو صرف یہ سوال الجھا رہا ہے کہ کیا اسی کا نام محبت ہے کہ میں اپنے دل کی اس مہلک اور خوفناک بیماری کو زہرہ سے چھپائے ہوئے ہوں۔ آخر میں ہمت کر کے اس سے کیوں نہیں کہہ دیتا کہ اس محبت میں جہاں تک تم پہنچ چکی ہو بس وہیں سے واپس لوٹ جاؤ۔ اس لیے کہ میں چند روزہ مہمان ہوں اور اتنا خود غرض بھی نہیں کہ ان چند دنوں کے لیے تم کو شریکِ حیات بنا کر بقیہ عمر کے لیے بیوہ بنا دوں۔ مگر یہ میں کیسے کہوں۔ یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔

نہ جانے کیا خدا کی مار تھی کہ آج یہ پروفیسر کوانوف کی تقریر سننے آگیا۔ دل کے بیماروں کا کیا خوفناک نقشہ کھینچا ہے اس شخص نے بیماری کی جس منزل پر میں ایک سال کے بعد پہنچتا اس پر اس روسی پروفیسر نے مجھ کو آدھ گھنٹہ میں پہنچا دیا۔ مگر اس نے یہ بھی تو کہا ہے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقیاں موت کی فاتح بن چکی ہیں۔ وہ موت جس کو برحق کہا جاتا ہے اب برطرف کی جا چکی ہے اور سرجری نے ملک الموت ایسے جری کو معزول کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم انسان کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھ سکتے ہیں ہم نے اتنی قدرت حاصل کر لی ہے کہ آپریشن کر کے دل کو سینے سے باہر نکال لیں اور ایک گھنٹہ تک مصنوعی طور پر دورانِ خون کو جاری رکھ کر مرمت طلب دل کی مرمت کریں اور اس کو پھر کارآمد بنا کر اس کی جگہ پر لگا دیں۔ یا اگر وہ ایسا ہی ناکارہ اور ناقابلِ اصلاح ہو چکا ہے تو ہم اس کی جگہ کسی جانور کا دل لگا کر انسان کو اس کے ہاتھوں موت سے بچا سکتے ہیں۔ مگر اللہ جانے یہ سب کچھ صحیح بھی ہے یا زیبِ داستان ہی ہے۔

گھر پہنچ کر بھی مجھ کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔ اس خیال کو ہر طرح ٹالنے کی کوشش کی مگر میرے دل کی بیماری آج مجھ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھی اور آج سے زیادہ زندہ رہنے کی طلب اور تڑپ شاید مجھ میں کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زہرہ کے لیے اس زہرہ کے لیے جو اپنی زندگی مجھ سے وابستہ کر کے سراپا سپردگی بنی ہوئی تھی۔ مگر میں کس طرح زندہ رہ سکتا ہوں۔ دل کا ایسا بیمار بھی کہیں زندہ رہا ہے۔ جیسا میں ہوں کتنی الجھنیں ہی جا رہی تھی۔ نہ دل کو قرار تھا نہ آنکھوں میں نیند تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دل پہلو سے نکل کر نگاہوں کے سامنے آ گیا ہے اور اپنے ڈوبنے کا ہر منظر مجھ کو دکھانے پر تلا ہوا ہے۔ لاکھ کروٹیں بدلیں مگر ہر کروٹ کے ساتھ یہ ڈوبتا ہوا دل نگاہوں کے سامنے ہی رہا۔۔۔

میں یکایک تڑپ کر اٹھا اور ایک عزم کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں اب طے کر چکا تھا کہ مجھ کو زندہ رہنا ہے۔ مجھ کو پروفیسر کوانتوف سے فوراً ملنا ہے۔ ابھی اور اسی وقت اور خواہ وہ مجھ کو اپنا تختۂ مشق ہی کیوں نہ بنائیں مگر میں زہرہ کے لئے زندگی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں تیر کی طرح گھر سے نکلا۔ اور اس ہوٹل میں جا کر دم لیا۔ جس میں پروفیسر کوانتوف کا قیام تھا۔ پروفیسر چونکہ اپنے دل کی طرف سے مطمئن تھے لہذا بستر پر جا چکے تھے مگر ان کے سیکرٹری کو میری بات ماننا پڑی اور اس نے پروفیسر سے آخر مجھ کو ملا ہی دیا۔ لہٰذا میں پروفیسر کی نرم گرم ہر قسم کی باتیں سننے کے لیے تیار ہو کر اس طرح آیا تھا مگر پروفیسر مجھ کو میری توقع کے خلاف نہایت بھلا مانس اور ملنسار آدمی ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف پوری توجہ کے ساتھ میرے دل کی بیماری کی تمام تفصیلات سنیں بلکہ اسی وقت میرا معائنہ بھی شروع کر دیا۔ اس نے عجیب عجیب آلات کی مدد سے میرا معائنہ کیا اور پچاسوں آلات سے دیر تک معائنہ کرنے کے بعد وہ پہلے تو کچھ زیر لب بڑبڑاتا رہا۔ اس کے بعد میرے سامنے بیٹھ کر اس نے ایک زبردستی کا تبسم اپنے لبوں پر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ اپنی موت سے ٹھیک پینتالیس منٹ پیشتر میرے پاس پہنچ گئے ہیں اور قسمت نے آپ کی اتنی رہنمائی کر دی ہے تو میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آپ موت کو شکست دے دیں گے۔"

میں چونکہ کوئی بات سمجھنے کے قابل نہ تھا لہذا میں نے صرف یہ کہا کہ "میں اپنی زندگی کے یہ پینتالیس منٹ آپ کے حوالے کیے دیتا ہوں۔"

پروفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا "اس اعتماد کا شکریہ۔ ان پینتالیس منٹ کا معاوضہ حیات ابدی کی شکل میں آپ کو ملے گا۔ بس آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور مجھے نہیں معلوم کہ ٹیلیفون پر اس نے کس سے کیا کہا البتہ ٹیلیفون کرنے کے بعد اس نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ پوچھ کر اپنے سیکرٹری کو لکھوایا اور خود برابر والے کمرے میں جا کر ایک ہینڈ بیگ لیے اپنے شب خوابی ہی کے لباس میں فوراً واپس آ گیا اور مجھ کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آئیے میرے ساتھ اسپتال میں سب کچھ تیار ہے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ کب پروفیسر کی کار روانہ ہوئی۔ کس راستہ سے گذری اور کب اسپتال کے آپریشن تھیٹر کے باہر آ کر ٹھہری۔ میری نگاہیں تو صرف گھڑی پر تھیں اور میں دیکھ رہا تھا کہ میری زندگی اب پینتالیس منٹ کے بجائے صرف آدھ گھنٹے کی رہ گئی تھی۔ پروفیسر واقعی ایک ایک منٹ کی قدر کر رہا تھا اس نے آناً فاناً مجھے آپریشن تھیٹر میں پہنچایا جہاں کئی ڈاکٹر اور نہ جانے کتنی نرسیں پہلے

ہی سے موجود تھیں اور ان سب نے مل جل کر مجھ کو اس آپریشن ٹیبل پہ لٹا دیا جہاں شاید دو منٹ سے زیادہ میں ہوش میں نہ رہ سکا۔

کپڑے دھونے کے لیے کسی برتن میں صابن کے چورے سے جس طرح جھاگ اٹھاتے جاتے ہیں اُسی قسم کے جھاگ سے میں نے اپنے کو ابھرتا ہوا محسوس کیا اور جب آنکھ کھولی تو محسوس ہوا کہ بہت سی دھنکی ہوئی روئی ہے جس میں ملفوف ہوں رفتہ رفتہ یہ روئی برسے ہوئے بادلوں کی طرح مجھ کو اپنی لپیٹ میں لیے اڑاتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں فوراً سمجھ گیا کہ میں جاں بحق ہو چکا ہوں اور یہ میری روح ہے جو عالم پرواز میں ہے۔ مگر ان ہی بادلوں میں کچھ دھندلے دھندلے جانے پہچانے چہرے بھی نمایاں ہونا شروع ہو گئے۔ یہ چہرے بڑی تیزی سے صاف ہوتے جاتے تھے اور اب میں ایک ایک کو پہچان سکتا تھا۔ یہ میرے والد محترم ہیں۔ یہ بدحواس ضعیفہ میری ماں ہیں۔ یہ دوپٹے کے آنچل سے بار بار آنسو خشک کرنے والی زہرہ ہے اور یہ فخر سے سرخرو پروفیسر کوالٹ ہیں جو میرے ماں باپ کو اور زہرہ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں یہاں تک کہ میں ان کے الفاظ صاف سننے لگا اور ان کا مفہوم بخوبی سمجھنے لگا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ :۔

"اب آپ لوگ ان کو مریض نہ کہئے یہ اب تندرست ہیں۔ میں نے ان کو موت کے منہ سے چھین کر موت سے بے نیاز بنا دیا ہے۔ یہ اب مر نہیں سکتے اور یہ اگر چاہیں تو ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ مگر فی الحال ان کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ ان کو خاموش پڑا رہنے دیجئے۔"

اور پروفیسر اپنے ساتھ ہی ان سب کو لے کے چلا گیا۔ میں تنہا رہ گیا اور اپنے کو غنودگی کے سپرد کر دیا۔ یہ کیفیت نہ جانے کب تک مجھ پہ طاری رہی کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے کو اٹھتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ البتہ دوسرے دن اور اس سے زیادہ تیسرے دن مجھ کو اپنی زندگی کا یقین آنا شروع ہو گیا۔ میرے عزیز میرے پاس برابر آتے رہے مگر میں نہ ان کے آنے کا انتظار کرتا تھا نہ ان کے جانے کو محسوس کرتا تھا رفتہ رفتہ پروفیسر نے مجھ کو بیٹھنے کی اجازت دے دی اور اب میرے عزیزوں کو بھی میرے پاس زیادہ ٹھہرنے کی ممانعت نہ تھی چنانچہ اور سب تو خیر صبح اور شام ہی کو آتے تھے مگر زہرہ صبح آکر شام تک میرے پاس ہی ٹھہرتی تھی اور میں حیران تھا کہ مجھے اس کی موجودگی ایک بوجھ سا کیوں محسوس ہوتی ہے۔ میں اس کی موجودگی میں ایک عجیب ذہنی کشمکش سی محسوس کرتا تھا کہ میرا دماغ مجھ کو سب کچھ یاد دلاتا تھا کہ میں نے اس کو کس کس طرح چاہا ہے مگر دل میں اب وہ وارفتگی اس کے لیے نہ پاتا تھا اور پہلے جس طرح اس سے دل کی بیماری چھپاتا رہا ہوں اسی طرح اب اس سے دل کی صحت چھپانے کو دل چاہتا تھا۔ میری خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھے آخر یہ ہو کیا گیا ہے کہ ذہن پوری روداد محبت دہراتا ہے مگر دل اس کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ بےچاری میری اس ذہنی الجھن اور قلبی بے حسی سے قطعاً بے خبر میری تیمارداری میں مصروف تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے دور ہی رہے تو اچھا ہے۔ آخر ایک دن اس نے پروفیسر سے میرے سامنے ہی کہا :۔

"پروفیسر صاحب آپ خود دیکھ لیجئے کہ روز کی طرح آج بھی یہ پھل بجنسہٖ رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے انگور کھلانا چاہے تو انکار کر دیا۔ مالٹے کا جوس دینا چاہا تو منہ پھیر لیا۔ کہتے ہیں کہ گوشت کے پائے لاؤ۔ ہڈیاں چبانے کو دل چاہتا ہے۔ دودھ البتہ شوق سے پی لیتے ہیں۔ یخنی کی بھی ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری پیالی مانگتے ہیں مگر پھلوں سے تو جیسے نفرت ہی ہو گئی ہے۔"

پروفیسر نے مسکرا کر کہا "یہ قدرتی بات ہے۔ بالکل قدرتی بات ہے۔ آپ ان کو پھل نہ کھلا سکیں گی ان کی خاطر آپ صرف

گوشت سے کر سکتی ہیں۔ ان کو گوشت دیجئے ان کے لیے مفید ہے۔"

زہرہ نے کہا "مگر ڈاکٹر صاحب پھل بھی تو مفید ہیں۔"

میرا جی چاہا کہ اس بدتمیز لڑکی کو بھنبھوڑ کھاؤں اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر اپنے پورے دانت اس کی پنڈلیوں میں پیوست کر دوں۔ یعنی اتنا بڑا معالج کہہ رہا ہے کہ گوشت دیا جائے اور یہ اپنی قابلیت بگھار رہی ہے۔ میں اس پر اتنی زور سے غرایا کہ وہ سہم کر رہ گئی اور اس کے سامنے ہی پروفیسر نے میرے لیے گوشت منگا کر میرے سامنے رکھ دیا جس کو میں تہذیب اور شائستگی کے تمام اعتبارات سے بیگانہ بن کر آناً فاناً چٹ کر گیا۔ اس کی ہڈیاں تک تڑاتڑ دانتوں سے توڑ کر کڑکڑا گیا اور جب پلیٹ میں کچھ نہ رہا تو میں نے زبان سے پلیٹ کو اس طرح صاف کر دیا کہ وہ دھلی دھلائی نظر آنے لگی۔ زہرہ بری اس کیفیت کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہی مگر میں نے اس کی ان نظروں کی پروا کئے بغیر پروفیسر سے کہا:۔

"آپ نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آپ کے قدموں پر لوٹوں آپ کے پیروں کو چاٹوں۔"

پروفیسر نے پھر کہا "یہ قدرتی بات ہے بالکل قدرتی بات ہے مگر مسٹر آپ دل پر زیادہ بار نہ ڈالئے دماغ سے بھی کام لیا کیجئے۔"

اور یہ کہہ کر پروفیسر کمرے کے باہر چلا گیا اور زہرہ نے حسب معمول جب میرا دماغ چاٹنا چاہا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں سونا چاہتا ہوں۔ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور تیلیوں سے سوئیٹر یا اللہ جانے کیا بننے لگی۔ اسی دن ایک عجیب و غریب واقعہ یہ پیش آیا کہ اسپتال کی ایک نرس کے ساتھ ایک رہزنِ تمکین و ہوش کافر ماجرا جھبرے جھبرے بالوں والی کتیا بھی میرے کمرے میں داخل ہو گئی اور اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں وہ جذبات یکایک جاگ اٹھے جو میرے دماغ کی مسلسل یاد دہانیوں کے باوجود میرے دل کے لیے قابلِ قبول نہ تھے۔ میں اس حسین و جمیل کتیا کو دیکھ کر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور نہایت بیساختگی کے ساتھ اس کی طرف ہاتھ جو بڑھایا تو وہ قاتلۂ عالم جفا پیشہ بن گئی اور لگی بھونکنے اور مجھے بے ساختگی کے ساتھ کہنا پڑا کہ ؎

اُن کو آتا ہے پیار پہ غصہ — مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

اور باوجود اس کے بھونکنے کے جب میں اس کی طرف بڑھنے سے باز نہ آیا تو نرس نے بھی کہا۔

"ہوئی تم کیسی نٹ کھٹ، ہو کہ وہ پیار کرتے ہیں اور تم بھونکتی ہو۔ شٹ اپ۔"

میں نے کہا "ڈانٹئے نہیں اس عتاب کی قدر میرے دل سے پوچھئے۔"

نرس نے غور سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا "اوہ۔ ہاں۔ ٹھیک تو ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

اور وہ ٹپر پھیرے کر جانے لگی تو وہ کج ادا بھی اسی کے ساتھ باہر نکل گئی مگر میں نے نرس کو آواز دے کے پھر بلایا کہ:۔

"سسٹر ذرا میری بات سن لیجئے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان کو لے آیا کیجئے۔"

سسٹر نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے اسپتال میں اس کو لانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ تو آج نہ جانے کس طرح میرے پیچھے پیچھے چلی آئی ہے۔ ہاؤس سرجن یا پروفیسر دیکھ لیں تو مصیبت آجائے۔"

میں نے کہا "میں پروفیسر سے اجازت دلوا دوں گا۔"

اور جب وہ نرس کے ساتھ چلی گئی تو میں ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ زہرہ نے بڑے تعجب سے کہا:۔

"آپ کو تو کتے کا کبھی شوق نہ تھا یہ کتیا کیوں اس قدر پسند آئی ہے؟"

میں نے دل گرفتہ انداز سے کہا "یہ باتیں سمجھنے اور سمجھانے کی نہیں ہوتیں۔ کاش اس کو تم میری نگاہوں سے دیکھ سکتیں۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ جب سے میں نے بیوٹی کو دیکھا ہے میں ایک عجیب عالم میں اپنے کو پا رہا ہوں۔ وہ میرے دل میں سمائی ہوئی ہے اور دل اسی کی طرف کھنچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ رات دیر تک اسی کے تصور میں کھویا رہا البتہ صبح جب پروفیسر کے آنے کے بعد زہرہ نے پروفیسر سے کہا تب مجھ کو خبر ہوئی کہ میں سوتے میں بھی بیوٹی بیوٹی کرتا رہا ہوں۔ یہ سن کر پروفیسر نے نہایت اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا:۔

"دیکھئے مسز میں آپ کو اور خود ان کو زیادہ دیر تک تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے بالکل قدرتی بات ہے قصہ دراصل یہ ہے کہ یہ جس حالت میں میرے پاس آئے تھے اس وقت ان کا دل اپنی عمر ختم کر چکا تھا اور صرف پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ میں نے فوراً ان کے آپریشن کا اہتمام کیا اور ان کا دل نکال کر چاہا کہ اسی کی اصلاح کر دی جائے مگر وہ ناقابل اصلاح ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً ایک نہایت تندرست السیشین کا سینہ چیر کر اس کا دل نکالا اور ان کے دل کی جگہ رکھ دیا۔ یہ تجربہ جس حد تک کامیاب رہا ہے وہ تو آپ خود ہی دیکھ رہی ہیں مگر چونکہ ان کا دل بدل چکا ہے لہٰذا دل کی کیفیات بھی بدل چکی ہیں۔ اب ان کا دل ہر وقت یہی بات چاہے گا جو ایک کتے کا دل چاہ سکتا ہے۔ یہ زندہ ضرور رہیں گے مگر کتے کے دل کے ساتھ اور اس کی خصوصیات کے ساتھ۔"

میں نے کہا "یعنی میں قلبی طور پر کتا ہو چکا ہوں۔"

پروفیسر نے کہا "مگر زندہ تو ہو یہی کیا کم ہے۔"

اس وقت میرے دل پر میرا دماغ حاوی ہو چکا تھا اور میں کتے کی زندگی بسر کرانے والے پروفیسر پر جھپٹا ہی تھا اور یقیناً اس کو بھنبھوڑ کھاتا، مگر یکایک آنکھ کھل گئی اور پروفیسر صاحب میرے ہاتھوں سے نکل گئے۔

جان بچی لاکھوں پائے

غلام احمد فرقت کاکوروی

آج تو مولانا کی دونوں باچھیں کانوں کی لوؤں سے ملی جا رہی تھیں۔ اور پان کی رال منہ سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔ دکان پر آج وہ پہلی بار اتنے صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آئے۔ دونوں آنکھوں میں کاجل لگا۔ کپڑوں میں اتنا عطر کہ بھپکے اٹھ رہے تھے۔ بڑی موری کا سفید پاجامہ، ادھی کا کرتا اور اس پر سفید بگلے سے زیادہ صاف شفاف دوپلی ٹوپی، ہر آنے جانے والے پر اچھی خاصی نشہ مار رہی تھی۔ ہم نے سامنے جا کر ایک زمیں بوس سلام کرتے ہوئے کہا کہ واللہ آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کپڑوں سمیت بھٹی پر سے اتار لئے گئے ہو۔ داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے بولے۔ یار! تم خوب آ گئے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ موٹر چلانا بھی جانتے ہو؟ ہم نے کہا ہماری ساری زندگی ٹانگوں پر چلتے گزری ہے۔ بولے۔ مذاق نہیں۔ اگر جانتے ہو تو بتاؤ۔ ہم نے کہا کہ یہ بیٹھے بٹھائے آج موٹر کا خیال کیسے پیدا ہوا؟ ڈبیہ سے پان کا بیڑا ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ کیا خیال ہے اگر میں موٹر خرید لوں؟ ہم نے کہا تو خودکشی کرنے میں کیا حرج ہے؟ بولے کیا مطلب؟ ہم نے کہا کہ ابھی پچھلے ہفتے ایک صاحب موٹر خریدنے کے پورے سال بھر بعد مرے ہیں۔ موٹر خریدنے کے آٹھ دس روز بعد جب وہ ہم سے ملے تھے تو ان کے چہرے پر اچھا بھلا یتیم خانہ برس رہا تھا۔ اس کے دو مہینے بعد جب ملے تو ایک پھٹا کوٹ پہنے کباڑیوں میں موٹر کے ٹائروں اور کل پرزوں کے [illegible] تلاش کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایک مرتبہ ہم نے ان کو سڑک پر موٹر میں نہایت گھبرائی ہوئی حالت میں دیکھا اور روک کر پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ معلوم ہوا کچہری میں موٹر کے مقدمہ کی پیشی ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی موٹر ایکسیڈنٹ کے سلسلہ میں جرمانہ ہو گیا ہے اور کسی دوست سے قرض لینے کی تلاش میں ہیں۔ آٹھ دس مہینے بعد معلوم ہوا کہ موٹر کے ایک سنگین حادثہ کے سلسلہ میں جیل ہو گئی ہے اور تین ماہ بعد جب جیل سے واپس ہوئے تو راستے میں قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ بولے۔ مگر میں نے تو موٹر خرید لی ہے۔ ہم نے کہا تو پھر مرنے کے دو گھڑی احتیاطاً دوست احباب سے قصور معاف کرانے کے بعد اپنی والدہ محترمہ سے دودھ دودھ بھی بخشوا لو۔ کیونکہ مرنے والے اور جیل جانے والے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ بولے۔ مذاق برطرف۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس آٹھ دس روز کے عرصہ میں میں نے اس کا دو تہائی چلانا بھی سیکھ لیا ہے۔ ہم نے کہا مگر استاد! ایک بات تو بتاؤ کہ اس میں بیٹھیں گے کون کون لوگ؟ بولے۔ دوست احباب، ہم اور ہمارے متعلقین بلکہ پہلی سواری تو تمہاری ہو گی۔ ہم نے کہا بھئی معاف کرنا۔ تمہاری موٹر کی خریداری کے سلسلہ میں ہم کو فیروز آباد کے ایک ڈپٹی صاحب کی موٹر یاد

آ رہی ہے۔ بولے اُس کی کیا خصوصیت تھی؟ ہم نے کہا خصوصیات تو اُس میں وہ تھیں کہ ڈپٹی صاحب کے عملے والے اور گھر کے آدمی جو ہر وقت بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتے تھے کہ اے پاک بے نیاز یا تو ہم سب کو موت دے دے یا ڈپٹی صاحب کی موٹر کو اُٹھا لے۔ چال ڈھال میں تو وہ ماشاء اللہ چار چھ فرلانگ یومیہ کی بلا شرکت غیرے مالک تھی ہی مگر وضعدار اس بلا کی تھی کہ آپ ایک نہیں پچاس نئے پرزے خرید کر اُس میں ڈلوا لیجئے رفتار میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اُسے دیکھ کر سودا کے گھوڑے کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ مقصد یہ کہ آپ لاکھ اُس کی دُم مروڑ مروڑ کر اس سے آگے بڑھنے کو کہیں مگر قطب از جا نمی جنبد۔ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کورو پانڈوں کو سلام کر آئی ہیں ملی تھی، اور ڈپٹی صاحب کا حسب نسب اُس سے وابستہ تھا کیونکہ اُس کی شکل و صورت پر سوائے موٹر کے دُنیا کی ہر ذی رُوح یا غیر ذی روح مخلوق کا گمان ہوتا تھا۔ جب اُس کا ہارن بجتا تو سُننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی گدھا انتہائی کرب کے عالم میں رینگ رہا ہے چلتے میں اُس کا عضو عضو باری باری سے رینگ کر ہارن کی نقل کرنے کی کوشش کرتا جس سے سڑک کے چلنے والے ڈر ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگنا شروع ہو جاتے۔ مائیں اپنے بچوں کو چھاتی سے لپٹا لیتیں۔ کُتے بھونک بھونک کر دُم دبائے سڑکوں کو پار کرتے دکھائی دیتے۔ سڑک کے دو رویہ مکانوں سے مٹی جھڑنے لگتی اور ڈپٹی صاحب چلاتے وقت زیر لب کوئی دعا پڑھتے معلوم ہوتے ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی سنگین جرم میں مُبتلا ہیں۔ مزدور جو اِدھر اُدھر عمارتوں یا میدانوں میں کام کرتے ہوتے ڈپٹی صاحب کی موٹر کی آواز سُنتے ہی اپنی اپنی جگہوں پر اِس طرح اوندھے جاتے کہ جیسے کسی بم ودم سے جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ ہر دس قدم کے بعد ڈپٹی صاحب کو دس بارہ آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی جو موٹر کو دھکا دے کر کسی ڈھال تک پہنچا آئیں۔ اِس پر مولانا۔ بولے۔ سبحان اللہ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

تم بھی کس سڑی موٹر کا ذکر کر رہے ہو میری موٹر تو ابھی ڈال کی ٹوٹی تازہ ولائت ہے اور جدید وضع کی جو موٹریں چلی ہیں اُن میں سے ایک ہے۔ ہم نے کہا تب تو اور مصیبت ہے۔ اُس کے چلانے والے کی تلاش بھی تو جوئے شیر لانے سے کم نہیں بولے اب چلانے کا سوال نہیں ہے سنسان سڑکوں پر تو میں خود اِس فراٹے سے چلاتا ہوں کہ خود رضی صاحب جو میرے استاد ہیں عش عش کرتے ہیں مگر چونکہ ابھی کسی قدر اناڑی ہوں اس لئے احتیاطاً میں اُنھیں اپنے برابر بٹھائے رکھتا ہوں۔ ہم نے کہا رضی صاحب شادی شدہ ہیں یا کنوارے؟ بولے۔ کیا مطلب؟ ہم نے کہا یوں ہی پوچھا کیونکہ بیوی بچوں والے کے مرنے کا غم زیادہ ہوتا ہے۔ وہ بھی یہ سمجھ کر بیٹھے ہوں گے کہ دیکھئے دوبارہ گھر جانے کو ملتا بھی ہے یا نہیں۔ بولے۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو بعض لوگ ایسے کل جبھتے ہوتے ہیں کہ اُن کے مُنہ سے جو منحوس بات نکل جاتی ہے وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ بہرحال آج ۴ بجے تم کو اپنی موٹر پر حضرت گنج لے جا کر چائے پلائیں گے۔ ہم نے کہا۔ یار ہم تو بیوی بچوں والے ہیں کسی دوسرے کو تلاش کر لو۔ بولے اب تو تخت یا تختہ۔ تم ہی کو چلنا ہوگا۔ ہم نے کہا اچھا تو پھر ہم گھر جا کر والدہ سے دُودھ بخشوا آئیں۔ بولے۔ پھر تم نے دل جلانے والی باتیں شروع کر دیں ایک مرتبہ چل کر دیکھو تو۔ مزا نہ ہو تو دام واپس۔

گھر میں بیوی بچوں سے رخصت ہو کر ہم ٹھیک ۴ بجے مولانا کی موٹر میں بیٹھے۔ اگلی سیٹ پر مولانا اور رضی صاحب براجمان ہوئے

رضی صاحب نے موٹر اسٹارٹ کی۔ مولانا کو اس کا اسٹیرنگ وہیل حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں مولانا!" مولانا نے رضی صاحب کی جگہ لے کر سرکس والوں کی جانشینی اختیار کی تو ہم نے دل ہی دل میں کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔ اور موٹر باادب با ملاحظہ ہوشیار کہتی ہوئی آگے بڑھی۔ رستے میں کچھ لوگ سڑک پر کھڑے ہو کر موٹر کو اس طرح دیکھنے لگے کہ جیسے سرکس کا اشتہار پڑھ رہے ہوں۔ اس وقت موٹر کی رفتار تقریباً چار چھ میل فی گھنٹہ ہوگی۔ مولانا کے استاد اس رفتار پر مولانا کی ہمت افزائی میں وہ کلمات استعمال کر رہے تھے کہ جیسے مولانا کوئی ہیلی کاپٹر یا راکٹ قسم کی کوئی چیز چاند کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ سڑک خاصی سنسان تھی کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد دور پر ایک گدھی سڑک کراس کرتی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر مولانا کے استاد نے آواز دی "مولانا بریک سنبھالے ہوئے" استاد کی آواز سنتے ہی مولانا نے نہ جانے گھبراہٹ میں موٹر کے کس مقام پر پیر رکھ دیا کہ موٹر بہت تیز ہو گئی۔ یہ دیکھ کر استاد نے گھبرا کر جلدی سے موٹر دھیمی کرنے والے حصّہ کو زور سے دبا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی موٹر گدھی کو موت کے گھاٹ اتارتے اتارتے رہ گئی۔ گدھی نے جو یہ بھیانک منظر دیکھا تو وہ دولتی جھاڑ کر ریکتی ہوئی اس طرح بے تحاشہ سڑک کے دائیں جانب بھاگی کہ ایک گڑھے میں چار خانے چت گری۔ اس پر استاد بولے۔ شاباش مولانا! خوب بچایا۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ گدھا بڑا صاحب اقبال جانور ہوتا ہے اس لئے کسی کام کو شروع کرتے وقت اس کی دم سے لڑ جانا بھی اچھا شگون ہے۔ اس پر مولانا نے بغلیں بجا کر مسکراتے ہوئے ہینڈل کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور ہم سے مخاطب ہو کر بولے۔ دیکھا دوست۔ اس طرح حادثہ کو بچاتے ہیں۔ یہ کہہ کر مولانا نے شعوری یا غیر شعوری طور پر نہ جانے کس پرزے کو دوبارہ دبا دیا کہ موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اس پر رضی صاحب نے چلا کر کہا۔ کیا کر رہے ہو مولانا؟ یہ سنکر مولانا گھبرا گئے اور بجائے اس کی رفتار کم کرنے کے نہ جانے کیوں ہارن بجانے لگے۔ ہارن سے ایک خاص قسم کی جو آواز نکلی تو ایک طرف سڑک کے کنارے جو مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں بھرا مار کر اڑیں اور ان میں سے ایک مرغی مولانا کی موٹر کے نیچے دب گئی۔ مولانا کی موٹر اب بالکل ہی بے قابو ہوتی جا رہی تھی اور اب سامنے کا ایک جھونپڑا براہ راست اس کی زد میں تھا جس پر سپاہی کھڑا تھا یہ دیکھ کر رضی صاحب کے منہ سے یا علی کی آواز نکلی اور نہ جانے شاگرد یا استاد میں سے کس نے پوری قوت سے گاڑی کے بریک مارا کہ موٹر جھونپڑا سے تقریباً ہاتھ کے فاصلہ پر پہنچ کر اس زور سے اچھلی کہ قریب کتے کے دو پلوں نے پیں پیں سے زمین و آسمان سر پر اٹھا لیا اور اس جھٹکے سے مولانا اور رضی صاحب دونوں کی کھوپڑیاں اس زور سے ایک دوسرے سے ٹکرائیں کہ جیسے کسی نے ناریل کی دو بٹیوں کو پوری قوت سے ایک دوسرے سے لڑا دیا ہو۔

دوسرے دن شام کو جب ہم مولانا کی خیریت پوچھنے گئے تو دونوں شہسواروں کے سروں پر پٹیاں بندھی تھیں اور موٹر علیحدہ کرنے پر بات چیت ہو رہی تھی۔

دُودِ چراغِ محفل

قاضی عبدالستار

تحصیل رام نگر کے اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اسٹیشن سے تحصیل تک راستے بھر میں بیداری کے خواب دیکھتا رہا اور خواب میں چلتا رہا۔ پھر تحصیلدار نے مجھے میرا آفس دکھایا۔ اور چپراسی نے اس مکان کی کنجی پیش کی جس میں وہ نائب تحصیلدار رہتے تھے جن کی جگہ پہ میرا تقرر ہوا تھا۔ اس دن مجھے یقین آیا کہ وقت ایک ایسی گاڑی ہے جس میں مریل بھینسے جتے ہوئے ہیں اور گاڑی بان سو رہا ہے۔ چار بجتے بجتے چار سال گذر گئے۔ چپراسی بھنگیوں سے مکان صاف ہی کرا رہا تھا کہ میں سیدھا اس چھتنار درخت کے نیچے آ گیا جس کے پاس ریلوے لائن کا پھاٹک تھا اور جس کے اندر سے وہ سڑک جاتی تھی جو لال پور سے گذرتی تھی——

لال پور جہاں زبیدہ رہتی تھیں۔ وہ مجھ سے بڑی تھیں۔ بہت بڑی تھیں۔ لیکن میں کبھی ان کے نام کے ساتھ "باجی" کی پیوندکاری نہ کر سکا۔ زبیدہ کو زبیدہ باجی کہنا ایسی ہی بدمذاقی ہوتی جیسے کوئی لیلےٰ کو لیلےٰ باجی کہنے لگے۔ وہ کچی سڑک جس پہ بھری ہوئی گاڑیوں نے اپنے پہیوں سے گڑھاریں ڈال دی تھیں اور دھوؤں کے بادل گاڑیوں کی طرح قطار باندھے رینگا کرتے تھے۔ بچپنے سے میرے خیال کے سامنے "نہرِ زبیدہ" کا کتابی حسن لا کر کھڑا کر دیتی تھی۔ اور میں پتلون کے پائنچے اٹھائے اور ناک پہ رومال رکھے بڑی دیر تک اس پہ چہل قدمی کرتا رہتا تھا۔ جب بھی بڑے بڑے بیلوں کا دوڑتا ہوا ادھا اور اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کی قطار نظر آتی تو میں چونک پڑتا اور اس پر کھنچے ہوئے پردے کی درازوں پر نگاہیں گاڑے اس وقت تک گھورتا رہتا جب تک وہ اوجھل نہ ہو جاتا۔ ہر سنیچر کی رات کو میں خیالوں کا جشن مناتا اور آنکھیں خوابوں کے گذرتے ہوئے جلوس کی جھما جھم دیکھتے دیکھتے پتھرا جاتیں۔ ہر اتوار کی صبح میرے دروازے پہ ایک چمکتی ہوئی سائیکل آ کھڑی ہو جاتی اور میں کپڑے پہنے وسیع احاطے میں ٹہلا کرتا لیکن مکان کے کسی گوشے سے مریض غیرت کا کھانستا ہوا احساس لنگڑاتا ہوا آتا اور میری ٹائی کی وہ گرہ کھول دیتا جسے میں بڑی مشکل سے باندھ پاتا تھا۔ اور کھونٹی پہ لٹکا دیتا۔ اور کوٹ پتلون کو بڑی احتیاط سے ہینگر میں لگا کر میرے جوتے کھولتا اور کوئی کتاب میرے ہاتھوں میں پکڑا کر چائے بنانے لگتا یا سگریٹ خریدنے کے لیے پیسے گننے لگتا۔

اس دن کچہری میں بڑی بھیڑ تھی کیونکہ اس کے بعد دسمبر کی چھٹیاں تھیں۔ میں بادامی کاغذ کے رجسٹروں سے جھک مار رہا تھا کہ چپراسی نے ایک لفافہ میرے سامنے رکھ دیا۔ لال پور اسٹیٹ کا مونوگرام دیکھ کر میں نے ہاتھ سے قلم رکھ دیا۔ لال پور کے رئیس اور زبیدہ کے والد نے مجھے طلب کیا تھا۔ میں نے لفافے کے پتے کو کئی بار پڑھا۔ خط کی تحریر تو مجھے فوراً یاد ہو گئی۔

بیلوں کے گھنگھرو ایک لے میں چھنک رہے تھے جیسے دیہاتی رقاصائیں لوک ناچ ناچ رہی ہوں۔ کچی سڑک کے کھانچوں سے میری یادوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور میں ایک بچے کی طرح ٹوٹے ہوئے ہوئے پھر سے جوڑنے لگتا۔ دفعتاً میری نگاہ ان پاسیوں پر پڑی جو تیر دھنی باندھے لمبی لمبی لاٹھیاں کاندھوں پر رکھے بیلوں کی طرح ہانپتے ہوئے میرے تانگے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے اور میں نے چیسٹر کے کالر کھڑے کر کے ٹانگوں سے کھسکتا ہوا کمبل درست کر کے ڈال لیا۔ "کنویں پہ ڈاکہ پڑ گیا ہو" ان میں سے ایک نے آواز دی جو نسبتاً وجیہہ اور معمر تھا۔ ہانکنے والے آدمی نے راسیں کھینچ کر لیکھ بدلی اور کنویں کی جگت سے۔ برابر دھارا روک دیا۔ وہ لوگ قریب آ کر سانسوں پر قابو پانے لگے "یہ کتنی دور رہ گیا ہے لال پور؟" میں نے پوچھا۔ میری طرف پیٹھ کئے وہ لوگ بیڑیاں سلگا رہے تھے۔ ایک نے کش لے کر جواب دیا "ای باگ کے رہے باچھو...... بس آئے گیو بھیا" میں بیلوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو ملٹری کے کمبلوں کی جھبولوں میں ڈوبے ہوئے پھنکار رہے تھے اور پانوں ٹیک رہے تھے "یہ جوڑ چودھری صاحب نے بنا لیا ہے؟" میں خاموشی سے اکتا گیا تھا "ناہیں...... یہ دہنا گھر کا بچھڑا ہے اور یہ باواں ملا وا لیو ہے۔ آپ جانو کہ ہولی کے میلے یہاں دو جوڑی بچار لگت رہیں۔ مل بھیا صاحب بچارن کیہاں ڈانٹ کے رہے بھگانے دیہیں" ہانکنے والا فخریہ نظروں سے بیلوں کو تھپتھپا رہا تھا۔ اور میرا خیال بھائی جان کا خط پڑھ رہا تھا "تمہاری تحصیل سے تھوڑی دور لال پور کا موضع ہے جہاں کے تعلقدار چودھری سطوت رسول تمہارے ماموں ہیں۔ ان کی دولت اور میری غریبی نے جو خلیج پیدا کر دی تھی وہ خاتمہ زمینداری نے ختم کر دی ہے۔ پھر وہ آدمی بھی ہو گئے ہیں۔ اگر وہ تم کو بلائیں تو ضرور چلے جانا۔" ابھی میں نہ جانے اور کیا سوچنے والا تھا کہ بیلوں کے گھنگھرو مدھم ہو گئے۔ پاسی بالکل میرے قریب آ گئے۔ سیاہ رنگ کا بوڑھا پھاٹک اپنا مغرور سر اٹھائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ داہنی جانب پیپل کے طویل درخت کے نیچے ایک ہاتھی گنوں سے کھیل رہا تھا۔ جس پر سیاہ رنگ کا کھڑا کسا تھا۔ تھوڑی دور پر دو ادہم کھڑے تھے جن کے پیروں سے حسین اور مضبوط بیل بندھے تھے۔ ان کی سینگیں سیاہی سے چمک رہی تھیں اور سفید جلد پر ہاتھ کے کالے کالے چھاپے بنے رہے تھے۔ آٹھ دس آدمی کھڑے بیٹھے تھے۔ دو آدمیوں کے کاندھوں پر کارتوسوں کی پیٹیاں جھول رہی تھیں۔ جن میں سے سرخ سرخ کارتوس دلہنوں کی طرح جھانک رہے تھے۔ میرا ادھر کرنا ہی تھا کہ ان میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ان میں سے کچھ نے مجھے جھک جھک کر سلام کئے۔ اور میرے دائمی جوابوں پر ان کی آنکھوں میں حیرت چمک اٹھی۔ میں اپنی اکلوتی ٹائی کی گرہ درست کرتا آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔ جس پر ٹنگے ہوئے پھولدار گملوں کی گھنی محراب میری ہمدردیوں پر طنز کر رہی تھی۔ پھاٹک سے دیوان خانے تک سرخ بجری کی روش کے دونوں جانب چونے سے رنگی ہوئی اینٹوں کے درمیان گلاب اور رات کی رانی کی ترشی ہوئی جھاڑیاں تھیں۔ دالان کے اونچے اونچے دروں میں پیتل کے بغدادی گملے چمک رہے تھے۔ فرش پر سبز رنگ کی دری بچھی تھی۔ ساگون کی شیر دہان کرسیاں پڑی تھیں جن کے بیچ میں بارہ سنگھے کی سنگھیوں کی چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ جس کی سطح سفید چینی کی تھی۔ اس پر پتھر کا ایک یونانی مجسمہ رکھا تھا جو اپنی برہنگی پر شرما رہا تھا۔ دیوار پر جنگلی جانوروں کے سروں کے درمیان ایک چھوٹا سا گھڑیال چمٹا ہوا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے اس کے دادا حشمت علی میرے نانا کے سپاہیوں میں تھے اور اب وہ سطوت رسول کی لڑکی کے لیے پیغام دیتا ہے...... میرے ناخن ایسے نہیں گر گئے ہیں۔"

اونچے اونچے دروازوں پر پڑی ہوئی چلمنوں سے گرجدار آواز آ رہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھنے لگا کہ اندر سے کتوں کے

نے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ایک آدمی نے چق اٹھا کر اندر آنے کا مودبانہ اشارہ کیا۔ ماموں فرش پر کھڑے تھے۔ لانبا خمیدہ قد جھاگ جیسا ململ کا
جاے دار کی آدھی آستین کی صدری۔ چُنا ہوا چوڑی دار پائجامہ زردوزی کا جوتا۔ شانوں پر کشمیری شال پڑی ہوئی۔ کھچڑی بالوں کے کٹے
ئے پٹے۔ عقاب جیسی تیز آنکھیں۔ کشادہ پیشانی۔ کسی قدر سانولے رنگ پر دودھ جیسی سفید مونچھیں۔ سر سے پاؤں تک امارت کی تصویر۔
اکر میرے سلام کا جواب دیا۔ اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر گھر کی طرف چلے۔ سفید السیشن سوں سوں کرتے ہوئے میرے اور ماموں کے
نے بائیں چل رہے تھے۔ میں انھیں کنکھیوں سے سنبھالے ہوئے تھا۔

"اس تحصیل میں تمھارا تقرر ہوئے کوئی دو ماہ ہو گئے؟"

"جی ہاں"

"اور آج تک تم نے خبر نہ لی؟"

"جی..... میں ابھی تک جم نہیں سکا ہوں..... پھر مجھے راستہ واستہ بھی نہیں معلوم تھا۔"

"بھئی تم اپنے تحصیلدار سے اگر میرا نام لے لیتے تو وہ تم کو خود چل کر بھیج جاتا۔"

ڈیوڑھی سے گذر کر طویل صحن کو پار کر کے ہم لوگ سہ درے میں آ گئے۔ جس کے دو دروں پر بھاری بھاری پردے پڑے ہوئے
۔ ایک مسہری پر قیمتی رگ پیروں پر ڈالے تکئے سے پشت لگائے۔ فیروزی شال میں لپٹی ہوئی موممانی نیم دراز تھیں۔ مسہری کے بائیں طرف
ٰ سی چوکی پر بڑا سا چاندی کا پاندان رکھا تھا۔ انھوں نے گلے لگا کر بہت سی دعائیں دیں اور آنکھوں میں آنسو لا کر اماں کی خیریت
۔ وہ اپنے بھاری بھرکم بدن کو سمیٹ کر مسہری سے اتر آئیں۔ وہ ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے پہنے تھیں۔ سفید گردن میں چوڑا سا
تھا۔ گورے چٹے چہرے پر ناک کی کیل اور بندوں کے ستارے تھے۔ انھوں نے اپنی شال سے ریشمی دوپٹے کا پلو نکال کر آواز دی۔

"نسیمن۔ ارے کہاں مر گئی۔ گرم پانی تو لا دے کمبخت۔ بچہ بیچارہ منہ ہاتھ دھوئے۔ اور سلیمن کہاں منہ پھونک رہی ہے پانی
، برسیں لگی ہیں..... تم بھیا یہ چارجامہ اتار ڈالو؟"

میرے پتلون کی طرف اشارہ کر کے وہ مسکرائیں۔ میں جیسے آتار کر کوٹ اتارنے لگا۔ ممانی نے جھک کر اپنے ہاتھ سے انگیٹھی میرے
، کر دی۔

پیریس کی عنابی بتی میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں اس لڑکی کی دودھیا پنڈلیاں گھور رہا تھا۔ جو اپنے کسیلے پائنچے اٹھائے پانی ڈال
ی۔ اس کے میلے میلے پیروں پر رکھے ہوئے چاندی کے موٹے موٹے کڑے اس کی ماماگیری کے ضامن تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو
ے گندمی چہرے پر چاندی کی بڑی سی ننھی طوق کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ چیختے ہوئے رنگوں کی لہریا اوڑھنی میں گدرائے ہوئے بدن کی
رملی رملی سی لڑکی تھی۔ بائیں طرف سے ایک مرمریں ہاتھ نے شفاف تولیہ بڑھا دیا۔ میں بدحواس ہو گیا۔ سفید ریشمی غرارے اور جمپر میں
ہوا قد لمبے دراز قد، سرمئی جارجٹ کا دوپٹہ پیشانی تک مڑھا ہوا جس سے نیلا سویٹر جھانک رہا تھا۔ سفید رنگ پر ہلکی ہلکی زردی
، ہوئی محرابی ابرو، رنجور آنکھیں جن کے گوشوں پر مہین مہین شکنیں کانپ رہی تھیں۔ گالوں پر ننھی ننھی سرمئی لکیریں طلوع ہوتی ہوئی۔
ت سے عاری ہونٹوں پر سینکڑوں نغموں کی لاشیں رکھی ہوئی۔ ناک میں ممانی کی کیل جیسی تابندہ مگر چھوٹی سی کیل ایک کان میں جھولتا
باسا آویزہ اور ان کی ساری شخصیت پر ہالہ کئے ہوئے ایک دلگیر جلال..... ایسا جلال جو پرستش پر اکساتا ہو۔ میری نظریں ان کے

چاندی کے پیروں پر رک گئیں جن کے مخملی جوتوں کا کام دھندلا ہو گیا تھا۔ اچانک میری نگاہیں چونکیں۔ ان کی غمگین آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔ اور ایک دلدوز نغمہ تیر گیا۔

"آپ نے مجھے سلام نہیں کیا"

میں گھبرا کر ان کے چاندی کے ہاتھوں کی سنہری چوڑیاں گننے لگا۔

"امی میں اختر سے کتنا بڑی ہوں۔" ان کے لہجے میں دل چیر دینے والی کسک تھی۔ ممانی چاندی کا پاندان سرکاتے ہوئے جھکیں اور ایک اوبچے سے سفید اگالدان میں پان تھوک کر بولیں "تم ماشاءاللہ اختر سے کوئی دس برس بڑی ہو گی۔ یہ لمبا ہو گیا ہے...... میرے منہ میں خاک کوئی بیسویں میں ہو گا۔"

"ارے زیبی کی ماں تم چائے نہیں بلوا رہی ہو اختر کو" ماموں اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے بولے "اور ہاں بھیا زیبی تم ذرا رنگ کا خیال رکھنا یہ اختر میاں کھتے کے رنگ کی پیتے ہوں گے" اور زیبی نے چائے دان کی ٹی کوزی اتار کر مجھے دیکھا اور ایک افسردہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ پھر انھوں نے ماموں کو دیکھا "ابّا یہ لکھنؤ میں رہے ہیں۔ لیکن نہ سلام نہ دعا" ماموں اور ممانی کے مصنوعی قہقہوں کے ساتھ ہی میں نے ان کو سلام کیا "اور اب آپ مجھے اپیا کہیں گے...... سمجھے آپ"

"جی" میں ان کی کلائیوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ وہ کیتلی میں چمچ گھماتے گھماتے رک گئیں۔

"آپ دودھ اور شکر ایک ایک چمچہ پیتے ہیں۔" ان کی آواز میں کتنا سوز تھا۔

"جی نہیں...... میں شکر پانچ چمچ پیا کرتا ہوں۔"

"جی...... میرے تو ہاتھ دکھ جائیں گے" انھوں نے شکر دان میری طرف بڑھا دیا۔ اور شیریں ناگواری سے مجھے دیکھتی رہیں۔ چائے کا ایک گھونٹ لے کر میں نے اپیا کو غور سے دیکھا۔ ان کے کان کی لوؤں سے کر کے اوپر تک سارے بدن سے جوانی اپنا رخت سفر باندھ چکی تھی۔ ان کی آنکھوں کی ویرانی اتنی دردناک تھی کہ کسی نگاہ کا ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ ان کی آواز کا کھوکھلا پن...... اپنے کو اپیا کہلوانے کے اصرار کے پیچھے بیٹھی ہوئی خلش سماعت کے ڈنک مار رہی تھی۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کا لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ نان خطائیاں اور انڈے کا حلوہ میری پلیٹ میں انڈیل کر بولیں۔

"اپیا...... اگر آپ نے مجھے "آپ" سے مخاطب کیا تو سلام کٹ جائے گا" اپیا کی نگاہوں میں ساری عمر کا کرب کھنچ آیا۔ مجھے اپنی بے جا اور ناکام ظرافت پر ندامت ہوئی۔ میں پھر چائے پینے لگا۔

"کھاؤ" ان کے لہجے میں ماں کی لوریوں کی مٹھاس تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ماموں آتے ہوئے نظر آئے۔ "پیچھے" رنگوں اور پیڑ اور ڑھے ہوئے وہی لڑکی ان کا پیچوان اٹھائے ہوئے تھی۔ جس کی نے ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو دیکھتے ہی ممانی بولیں "تم بھیا جلتے ہو کہ سونگھتے ہو"

"تمھارا پیٹ کوئی کہاں سے لا دے" ماموں نے تخت پر بیٹھتے ہی ممانی پر وار کیا۔ اور وہ جز بز ہو گئیں۔

"میں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہوں تو گزر ہے اس گھر میں...... زبان کے داروغہ بنے ہیں بے چارے۔"

"تمھارا بستر کہاں لگوایا جائے" ماموں مجھ سے مخاطب تھے۔

"میں نے اوپر والا کمرہ ٹھیک کرا دیا ہے۔" اپیا نے مجھے اپنی امان میں لے لیا۔ اور اٹھ پڑیں۔ اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے چلیں۔ میں ان کی چال کا شاہانہ پن دیکھتا رہا۔ پھر تنگ زینہ ان کے بدن کی خوشبو سے معطر ہو گیا۔ کمرے میں آئینہ دار مسہری پر ریشمی لحاف لگا ہوا تھا۔ تخت سے چادر اٹھا کر انھوں نے لگائی۔ تکیوں کو اٹھا کر دیکھا اور بولیں۔ "غلاف میں نے پرسوں بدلے تھے کہو تو بدل دوں؟" دور جیسے رقص کی دھن میں بانسری بج رہی ہو۔

"کیا کیجیے گا" پھر انھوں نے چادر کی شکنیں درست کیں۔

"لو اب تم لیٹو بہت تھک گئے ہو گے۔"

"نہیں کوئی پیدل تھوڑی آیا ہوں۔"

یہ ادھے موئے پیدل سے بھی بدتر ہیں۔ مجھے تو چکر آنے لگتے ہیں۔ جی مالش کرنے لگتا ہے۔ موٹر کیا نکالی گئی ہے جیسے ہاتھ پاؤں کٹ گئے ہیں۔"

نہیں ایسا..... میں ادھے کا عادی ہوں...... ہاں آپ کا کمرہ کونسا ہے" میں نے بڑے سے آئینے میں اپنا ہیٹ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"کپڑے بدل لو..... پھر کمرہ بھی دیکھ لینا" دروازے پر کھڑی ہوئی نسیمن کے ہاتھ سے اٹیچی لے کر انھوں نے تخت پر رکھ دی اور ریشمی پردوں میں غروب ہو گئیں۔

سورج ایک بدنصیب تمدن کی طرح ڈوب رہا تھا۔ مغربی آسمان میں لگی ہوئی آگ ابھرتے ہوئے کمرے کی سانولی چادر میں بجھ رہی تھی۔ میں سگریٹ پھینک کر اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ سوکین کا نیلا پردہ ہٹا کر اپیا کے کمرے میں آ گیا۔ بادام کی مسہری پر مخمل کا لحاف کام میں لپیٹے ہوئے تکیے۔ مسہری کے سرہانے سیاہ منقش بغدادی الماری میں، انگریزی اور اردو کے ناول، افسانوں اور شعر کے مجموعے، خاتون مشرق مولوی اور شمع کے رسالے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ اوپر ادھ بنے پلوراون کے گولے، ریشم کی لچھیاں کروشیا کی نیلیاں۔ گھر کے حساب کے رجسٹر تھے دوسری طرف کپڑوں کی اونچی سی الماری کھلی ہوئی۔ مدھم رنگوں کے غرارے، جمپر، پاجامے دوپٹے، سب ریشمی سب سادے، نیچے کئی جوڑے سلیم شاہی جوتے باتھ روم سلیپر اور سینڈل، دیواروں پر فریم کئے ہوئے حسین طغرے، اقبال اور غالب کے اشعار سنگھار میز کے بلند آئینے کی چھاؤں میں بالوں کے برش، کنگھے، صابن دانوں کی قطار، تیلوں کی شیشیاں، صندل کی چھوٹی سی چوکی پر ادنی جانماز، سفید دانوں کی نازک سی تسبیح، اسٹول پر پتھر کی صراحی چاندی کا گلاس۔ صوفے پر بڑے بڑے پھولوں کا کامدار غلاف ٹوٹ کی میز پر پتھر کے گلدان میں مرجھاتے ہوئے کالے گلابوں کا گلدستہ۔ منقش دیوارگیری پر دوہری بتیوں کا بڑا سا لیمپ جس پر ہرے رنگ کا پھولدار گلوب چڑھا ہوا۔ سارے کمرے پر ایک لطیف ویرانی برس رہی تھی۔ ہر چیز کے کلیجے میں ایک خوشگوار آگ دہک رہی تھی۔ ہر چیز مجھے گھور رہی تھی۔ جیسے جادو کے محل میں بچپن سے گرفتار شہزادیاں کسی اجنبی مرد کی آمد پر سکتے کے عالم میں تصویر بن جائیں۔ بیس برس کی بیوہ آرزو کمرے میں اپنے بال کھولے جوان آنکھوں کی دراز پلکوں پر آنسوؤں کے دیئے جلائے تقدیر کی لکیریں پڑھ رہی تھی۔ پردہ ہلا۔ اپیا آ گئیں۔ وہ سرمئی دوپٹے کے کامدار آنچل میں سولہ برس کی شوخ دوشیزہ نظر آ رہی تھیں۔ سرخ سرخ گالوں پر ہلکا ہلکا پوڈر..... بڑی بڑی آنکھوں میں دور دور تک کاجل، مہندی میں رچے

ہوئے خون جیسے ہاتھ سرخ سرخ کپڑوں میں شرمائی ہوئی میرے سامنے کھڑی تھیں۔

"کیا ہے اختر" وہ مجھے وحشیوں کی طرح گھورتے ہوئے دیکھ کر شرما گئیں۔ میں بیدار ہو گیا تھا۔ بہت بار ہو چکا تھا۔ ان کے سفید گالوں کی سانولی لکیروں نے مجھے پھر سے گرفتار کر لیا تھا۔ ان کا ابھیر زیر ولی کے سفید دوپٹہ میری گردن میں پھندہ بن چکا تھا۔

"کچھ نہیں اپیا"

پھر انھوں نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ اور کیپسٹن کا ٹن میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"تمھارا جی گھبرا رہا ہوگا۔ مگر کیا کروں یہاں تفریح کے لیے کچھ بھی تو نہیں۔ ابو ٹنکار جا رہے تھے۔ تمھاری آمد کے خیال سے رک گئے کل تم بھی جانا ذرا دل بہل جائے گا...... ہاں ریڈیو..... باہر سے منگوا لوں اگر تم سنو" وہ ایک سانس میں کہے جا رہی تھیں۔ میں چپ کھڑا تھا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی بتی تیز کر دی۔

"بیٹھ جاؤ...... اچھے بھی نہیں ہے وہ اگر ہوتا تو تم اس طرح اداس نہ ہوتے"

"اداسی کا کیا سوال اپیا" میں بالکل ہوش میں آ چکا تھا۔

"تم اس سے نہیں ملے..... تم سے وہ دو ایک سال چھوٹا ہوگا۔ بیچارہ تین برس بی اے میں فیل ہوا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ اب تجارت کی سوچ رہا ہے...... اسی سلسلے میں دلی گیا ہے" میں گونگوں کی طرح سن رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے یونہی چلی جا رہی تھیں جیسے اگر وہ رک گئیں تو ان کی ویران آنکھوں سے سارا صبر پھٹ پڑے گا۔ میری بھرپور نگاہوں سے گھبرا کر وہ کتابوں کی الماری کی طرف بڑھیں۔ کتابیں الٹتی پلٹتی رہیں۔ ایک بار مڑ کر انھوں نے دیکھا تو مجھے اپنی طرف دیکھتا پایا۔ وہ دیر تک بت بنی کھڑی رہیں۔ پھر جھک کر مسہری کے نیچے سے ماہر کا سوٹ کیس نکالا اور مسہری پر بیٹھ کر اسے کھولا۔ ایک ڈور ربن، ایک ڈگری اور ایک البم نکال کر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔

"دیکھو یہ میری دور بین ہے جس سے منزلیں پرچا کر گھنٹوں دور دور تک اسی کے سہارے گھومتی رہتی ہوں" میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈگری اٹھالی۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ بی۔ اے۔ فرسٹ ڈویژن۔ انگریزی۔ فلسفہ۔ اردو ۱۹۲۶ء۔ زبیدہ سلطوت رسول۔ میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ ایسا کہ سفید ہاتھوں میں البم تھا۔ وہ مجھے اشارے سے دے رہی تھیں۔ شاید اب الفاظ کا یارا نہ رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے ان کا ہاتھ ٹکرا گیا۔ سرد ہاتھ..... لرز اٹھا۔ ان کے ہونٹوں کی محرابیں کانپ اٹھیں۔ یہ ان کی اپنی تصویر تھی۔ سفید سوٹ پر سیاہ گون پہنے ہاتھ میں ڈگری لیے۔ جیسے ایرانیوں کی شہزادی سیاہ فرغل پہنے فلک بوس محل کے دریچے میں کھڑی کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ ماہ جم روشنائی میں ۱۹۴۶ء لکھا تھا۔ یہ دوسری تصویر تھی۔ وہ چوڑی دار پاجامے پر گھٹنوں سے نیچا جمپر پہنے سیدھی مانگ پر دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھیں۔ اس قدر مانوس جیسے اس لڑکی کو میں ہمیشہ سے جانتا ہوں۔ جیسے میں نے اس سے باتیں کی ہوں۔ لڑائیاں لڑی ہوں۔ منتیں کرائی ہوں۔ اس کے شانوں پر سر رکھ کر آنسو بہائے ہوں۔ اس کے ساتھ قہقہے لگائے ہوں۔ میں دیکھتا رہا۔ "دو پلٹئے" انھوں نے کہا اور اپنا ہاتھ البم پر رکھ دیا۔ سفید ہاتھ پر نیلی نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ ہاتھ کی تیسری انگلی میں نیلے رنگ کا پتھر قید تھا۔ جیسے وہ اپنے ماحول کی اپنے تمدن کی چہار دیواری میں قید ہوں۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے کانپتے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ان کی خواب دیکھتی ہوئی نیم باز آنکھیں چونک پڑیں۔ ان کا ریشمیں ہاتھ کسمسایا۔ وہ دیر تک مجھے عجیب عجیب نظروں سے گھورتی رہیں۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہو گئیں اور گھٹی گھٹی آواز میں چیخ پڑیں۔

"اختر" میر کے سارے دیوانوں کا درد ان کی آواز میں سمٹ آیا تھا۔ وہ بولتے ہوئے کانپ رہی تھیں۔ باندان رکھا تھا۔

"میں تم سے دس سال بڑی ہوں"

کمرے کا پردہ ہلتا رہا۔ وہ جا چکی تھیں۔ میرے سامنے بھائی جان کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ باہر ناچ ہو رہا تھا۔ ساری عورتیں یا ناچ رہی تھیں یا سو رہی تھیں۔ میں سبھوں کے بستر ٹٹولتا گھوم رہا تھا۔

"کیا ہے اختر"

ایک اجنبی اجنبی خوبصورت سی لڑکی میرا نام لے کر پکار رہی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کے نیم روشن پر اسرار خدوخال مجھے آج تک یاد ہیں۔ "مجھے نیند لگی ہے" میں جھوٹ بولتے ہوئے بولا۔

"آؤ ادھر لیٹ رہو" میں شرما کر کھڑا ہو گیا۔

"میں آپ کے پاس نہیں لیٹوں گا"

"کیوں..... اچھا آپ شرما رہے ہیں" ارے نزو..... آپ کو ملاحظہ فرماؤ آپ شرما رہے ہیں"

کئی فرمائشی قہقہوں کے درمیان میں اجنبی اجنبی خوبصورت سی لڑکی کے بستر میں گھس گیا۔ گرم گرم کلائی پر میرے گال رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ مجھے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسے چوم لوں۔ میں نے اُسے چوم لیا۔

"وہ چانٹا ماروں گی کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی..... شریر کہیں کا"

میں سہم کر سُن ہو گیا۔

"کیا ہے" کوئی لڑکی پوچھ رہی تھی۔

"آپ رومانس لڑا رہے ہیں"

"کیا۔ رومانس"

"جی ہاں۔ ہاتھ چوما جا رہا ہے..... نزو خدا کی قسم یہ لڑکا بڑا عاشق مزاج ہو گا"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نہیں لیٹتا آپ کے پاس"

"تو آپ ناخوش ہو گئے ہیں" نزو میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ پھر میرے ہاتھ پکڑ کر اُسی حسین لڑکی نے مجھے اپنے بستر میں گھسیٹ لیا۔

"میرا منہ چومے گا..... لے چوم"

ایک بار پھر قہقہے گونج گئے۔

شادی کے بعد جب وہ جانے کے لیے اپنے موٹر میں سوار ہو گئی تو میرے ہونٹوں پہ کئی آرزوئیں دبک اٹھیں۔ میرے گالوں پہ کئی آنسو ڈھلک آئے۔

"اب کی چھٹیوں میں تم لاہور آنا"

آنکھوں ں یہ کہہ کر اس اجنبی اور پیاری پیاری لڑکی نے میرے گال پر ایک چپت لگائی۔ اور مسکرا دی۔

سولہ برس کی شور البم میرے ہاتھوں میں ہنوز کانپ رہا تھا۔ میں اس کے مختلف پوز دیکھتا رہا اور ورق الٹتا رہا۔ ایک ورق پر میرا ہاتھ ٹھٹک

وہ نسبتاً زیادہ دبیز معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دو ورق ایک ساتھ جوڑ دیئے گئے تھے۔ میں نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر جی سے پانی انڈیلا اور اسے نم کر کے کھولنے لگا۔ غالب کا ایک شعر سنہری پنی سے کاٹ کر چپکا دیا گیا تھا۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

دونوں مصرعوں کے درمیان ایک تصویر تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اس کا سائڈ پوز بڑا دلکش تھا۔ وہ کوٹ پہ ٹائی لگائے ہوئے تھا۔ اس کی میں سیاہ گاگل میں روپوش تھیں۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ عاشقوں سا درد اس کے چہرے پہ برس رہا تھا۔ اس کے دن کی بے ترتیبی میں ایک باشعور ترتیب تھی۔ میں حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ حسین ہونے کے باوجود مجھ سے بڑی مشابہت رکھتا ا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ کہ چاپ محسوس ہوئی۔ میں نے البم کو بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ نسیمن دروازے پہ کھڑی تھی۔

"کھانا نکلتا ہے" یہ کہہ کر وہ مڑنے لگی۔

"یہاں آؤ" وہ اس انداز سے شرمائی ہوئی میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی گویا میں ابھی شہید ہو جاؤں گا۔

"جی"

"اپیا کہاں ہیں"

"باورچی خانے میں ہیں" وہ انگلیوں میں اپنا آنچل مروڑتی رہی اور فرش پر نگاہیں جمائے رہی۔

"تم چلو میں آ رہا ہوں" وہ عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

طعام خانے کے سب دروازے اور دریچے بند تھے۔ دوہری بتیوں کے دو لیمپ جل رہے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں پر اپیا، ماموں اور ممانی بیٹھی انتظار کر رہی تھیں۔ کرسیوں کے قریب چھوٹی چھوٹی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ ماموں کے پاس والی کرسی پر میں بیٹھ گیا۔ برتنوں کی الماری کے پاس رکھی ہوئی میز پہ نسیمن جگ اور گلاس رکھ رہی تھی۔ قیمتی چینی کے تمام ڈونگوں اور پلیٹوں پر GOD SAVE THE KING کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے تاج بنے ہوئے تھے۔ کھانا شروع ہو گیا۔ ماموں اپنی پلیٹ سے اچھی اچھی بوٹیاں نکال کر میری پلیٹ میں رکھ رہے تھے۔ ان کی یہ محبت مجھے کھل رہی تھی مگر میں اختراً نگل رہا تھا۔ اپیا بُرا سا منہ بنائے ماموں کی اس حرکت پر خاموش احتجاج کر رہی تھیں۔ ممانی سر پہ دوپٹہ اوڑھے پلیٹ پر نگاہیں جمائے انتہائی خاموشی سے کھانا کھا رہی تھیں۔ کبھی کبھی میرے سست ہاتھ کی شکایت کر دیتیں۔

"بھئی اختر میاں۔۔۔ صبح چار بجے اٹھنا ہے۔ سورج نکلتے نکلتے چڑیا اڑ جاتی ہے۔"

"بہت اچھا"

"الارم لگوا دوں گا۔ ویسے میری تو آنکھ کھل ہی جاتی ہے۔"

ہم لوگ ابھی چاولوں تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ اپیا اٹھ گئیں۔

"زینی کیا بات ہے؟" ماموں اور ممانی دونوں نے چونک کر سوال کیا۔

"کچھ طبیعت سست ہے" سب مطمئن ہو گئے۔ کمرے سے نکل کر وہ صحنچی میں چوکی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے آگے پاندان رکھا تھا۔

تسنیم چھالیا کاٹ رہی تھی۔ دروازے کے ایک کھلے ہوئے پٹ سے میں انھیں دیکھ رہا تھا۔ مدھم روشنی میں ان کی آنکھوں کی ویرانی اور رخساروں کی شکنیں دھندلا گئی تھیں۔ جیسے وہ ابھی ابھی گوٹ اتار کر آئی ہوں۔ میری آنکھوں میں البم کی پر اسرار تصویر گھوم گئی۔ اور میں اس کی قسمت پر رشک کرتا رہا۔ مٹھائی کے دور کے بعد ہم لوگ باہر آئے۔ صابن اور بیسن سے ہاتھ دھوئے گئے۔ پان کھلا کر مومانی نے باتیں چھیڑنے کا بہانہ ڈھونڈھا مگر میں تھکن کا سہارا لے کر اوپر آ گیا۔

کمرے میں ہرے گلوب کا لیمپ جل رہا تھا۔ میں اسٹرا اتار کر لحاف میں گھس گیا۔ اور سرہانے سے ایک کتاب اٹھا لی لیکن ہر صفحے پر اپیا کی تصویر تھی۔ ہر جملہ ان کی دلگیر آواز میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے کتاب رکھ دی۔ باہر سے ربڈ بونجنے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ دور کتوں اور گیدڑوں کا راگ ہو رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ اپیا کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ نماز کی چوکی پر دائی باندھے ایک حور کی طرح اپنے چاند سے ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں۔ ان کے لرزتے ہوئے ہونٹوں کے تقدس نے میری آنکھیں بند کر دیں۔ میں چلا آیا۔ البم کی وہ پراسرار تصویر میرے سامنے تھی۔ پھر میرا دل آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ آنکھوں کے بھاری بھاری پپوٹے جلنے لگے تھے۔ آسمان سے زرد لمحات کی بارش ہو رہی تھی اور میں شرابور بیٹھا تھا۔ کارنس پر رکھی ہوئی گھڑی نے میری نگاہ پکڑ لی۔ بارہ بج رہے تھے۔ میں پھر باہر نکل آیا۔ دیوانی رات چاند کی لاش کو اپنی ممتا کے کلیجے سے لگائے نغمے لگا رہی تھی۔ دبیز بیکر گڑھی کی بوڑھی برجیاں چاندنی میں نہائی کھڑی تھیں۔ میں زینے کی گیلری پار کر کے آگے نکل آیا۔ یہ دوسری منزل کا صحن تھا۔ اس سے گزر کر میں چھوٹی سی دیوار کے پاس آگیا جس میں چھوٹے چھوٹے رنگین شیشے لگے تھے۔ ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کے خالی فریم پر میں نے اپنا سر رکھ دیا۔ نیچے ماموں کا کمرہ تھا۔ جارج پنجم کی قد آدم تصویر کے قدموں میں پڑی ہوئی بڑی سی مسہری کے تکئے سے پشت لگائے وہ نیم دراز تھے۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ میں ہٹ گیا۔ پھر دروازے کی چیخ آئی۔ میں نے پھر آنکھیں رکھ دیں۔ گدرائے ہوئے بدن کی تسنیم گلے میں دوپٹہ لپیٹے کچھ لیے چلی آ رہی تھی۔ ماموں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں انڈے کے برابر ایک ناریل تھا۔ جس میں ایک نرکل سیدھا اور دوسرا آڑا لگا ہوا تھا۔ سیدھے نرکل پر تسنیم نے ایک چھوٹی سی لمبی سی چلم رکھ دی۔ چلم میں ایک لال انگارہ رکھا تھا۔ آڑے نرکل کی نے ماموں نے اپنے ہونٹوں میں لے لی۔ اور جلدی جلدی کئی کش لگائے۔ اور ہاتھ بڑھا دیا۔ تسنیم نے چلم انگیٹھی میں پلٹ دی۔ پھر ایک سفید ڈبیا سے کالی کالی ٹکیا نکال کر چلم پر رکھی۔ پھر ایک انگارہ چلم پر رکھ کر ناریل ماموں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ماموں نے پھر تین چار دم لگائے۔ اور ناریل تسنیم کو دے کر نڈھال سے بستر پر گر پڑے۔ تسنیم نے ناریل تخت کے نیچے رکھ کر کونے میں کھڑا ہوا نعمت خانہ کھولا۔ چینی کی ایک پلیٹ نکالی۔ ایک چمکتا ہوا بڑا سا چمچ لے کر ماموں کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ماموں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ کرسی کے تکئے سے تولیہ کھینچ لائی اور ماموں کے سینے اور گردن کو ڈھانک دیا۔ پلیٹ کے ترنم کے ساتھ بالائی ختم ہو گئی۔ ماموں نے اسی تولیہ سے اپنا منہ پونچھا۔ تسنیم پلیٹ رکھ کر مسہری کے پائنتی بیٹھ گئی اور جھوم جھوم کر ان کے پاؤں دابنے لگی۔ میں آہستہ آہستہ صحن کی بائیں جانب چلنے لگا۔ سامنے دوسرا زینہ تھا۔ میں پائیں باغ میں اتر آیا۔ داہنی طرف برآمدے میں پردے پڑے تھے۔ سرخ بجری کی روش باغ کے اندر چلی گئی تھی۔ جس کے دونوں طرف اونچے اونچے چنار کے درخت تھے۔ نیچے ترشی ہوئی پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ میں چلتا رہا۔ چھوٹی سی نہر کے کنارے پتھر کی تپائی پر اپیا ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے پیر کانپنے لگے۔ میں نے سگریٹ گل کر دی۔ اور پیڑ کے سائے کی قنات میں کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ریشمی پائنچے کشمیری سلیپر پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سیاہ رنگ کے گون میں

بڑی باوقار معلوم ہورہی تھیں۔ جیسے کوئی مغموم شاہزادی بیٹھی ہو۔ ایک لانبی چوٹی ان کے زانو پر رکھی تھی۔ انگوٹھی کا پتھر ایک جنگلی آنکھ کی طرح چمک رہا تھا۔ ان کے قدموں میں سفید السیشن سو رہے تھے۔ سارے باغ پر ایک غمناک سکوت طاری تھا۔ ہواؤں کی گھٹی گھٹی سسکیاں کبھی کبھی خاموشی کو جھنجھوڑ دیتیں۔ جیسے محرم کی مجلسوں میں کوئی جادو بیان انیسؔ کا مرثیہ پڑھتے پڑھتے رک گیا ہو اور لوگ رونا بھول کر بُت بنے بیٹھے ہوں۔ میں دیر تک اپنے آنسوؤں کو بہلائے کھڑا رہا۔ پھر چلا آیا۔ اپیا کے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ بغیر شکنوں کا بستر اپنا آغوش کھولے ان کے ہجر میں بیدار تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر لیٹ رہا۔ لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے جھوٹے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ دروازہ کھلا۔ لیمپ کے ساتھ اپیا کی آواز کا شعلہ چمک اٹھا۔

"اختر۔۔۔۔ اختر۔۔۔۔ اے اختر"

وہ آہستہ آہستہ پکارتی ہوئی میرے بہت قریب آگئیں۔ میں ان کی سانسوں کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ وہ میرے سرہانے مسہری کے کونے پر بیٹھ گئیں۔ ان کی ٹھنڈی ٹھنڈی ملائم ملائم انگلیاں میری پیشانی پر اور بالوں میں لرز رہی تھیں۔ جیسے سارے جہاں کا سکون میری قسمت میں سمٹ آیا ہو۔ ان کا ہاتھ لرزتا رہا۔ اور میں فردوس میں لیٹا رہا۔ وہ اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور میرا شانہ پکڑ کر جگانے لگیں۔ میں نیند سے اٹھنے کی نقل کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"چار بج رہا ہے۔ پانی رکھا ہے۔ منہ ہاتھ دھو لو" ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ میں اسٹر پہن کر غسلخانے چلا گیا۔ پھر میں کپڑے پہن رہا تھا کہ اپیا آگئیں۔ واپس لوٹنے لگیں۔ مگر میں نے پکار لیا۔

"تمھیں جھیل پر اسٹر اتارنا پڑے گا"

"ضرور"

"پھر اس پلور میں تو تم جم جاؤ گے" مجھے مسکرانے کا بہانہ مل گیا۔ اپیا گئیں اور ایک پلور اور ایک سویٹر لے کر واپس آئیں۔

"یہ پلور نیچے پہن لو اور یہ سویٹر اوپر" ان کے لہجے میں خود اعتمادی تحکم تھا۔ میں ان کے بدن کی شمیم میں بسے ہوئے سویٹر پہن کر اور قریب آگیا۔

ماموں خاکی رنگ کی سرج کا شکاری کوٹ اور برجس پہنے شال گردن اور کانوں میں لپیٹے فاختئی رنگ کی جناح کیپ لگائے دیوان خانے میں میرے منتظر تھے۔ میں اور ماموں الگ الگ ادھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھی خالی چل رہے تھے۔ ادھے کھیتوں میں پھندوا لیے گئے۔ ماموں کا ادھا آگے تھا۔ اس کے دونوں طرف آٹھ دس آدمی تھے۔ آگے کے آدمی ٹیریں ہنکاتے چل رہے تھے۔ میلی میلی روشنی میں جب ان کے پرے ڈیلوں کی طرح ادھے کے سامنے سے گزرتے تو دھائیں سے ایک فائر ہوتا۔ اور کئی کئی بٹیر لوٹ جاتے۔ ادھا ایک منٹ کے لیے بھی نہ روکا جاتا۔ میں ماموں کے کھچڑی پٹوں کو گھور رہا تھا جو اسی شغل میں اپنی سیاہی کھو چکے تھے۔ اب جھیل سامنے تھی۔ ہم لوگ الگ الگ ہاتھیوں پر سوار ہوئے۔ آدمیوں نے پوری جھیل کا ایک چکر لگایا اور شمال سے گھسنے کا مشورہ دیا۔ ہر طرف ایک ایک آدمی بندوق لے کر روانہ ہوا۔ سورج ابھی ابھرنے نہیں پایا تھا۔ لیکن مطلع روشن ہونے لگا تھا۔ میں کلبلاتی ہوئی چڑیاں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھی انتہائی ہوشیاری اور سکوت سے جھیل میں داخل ہوئے۔ ماموں میرے قریب ہی تھے کہ چڑیاں

نسیمن چھالیا کاٹ رہی تھی۔ دروازے کے ایک کھلے ہوئے پٹ سے میں انھیں دیکھ رہا تھا۔ مدھم روشنی میں ان کی آنکھوں کی ویرانی اور رخساروں کی شکنیں دھندلا گئی تھیں۔ جیسے وہ ابھی ابھی گون اتار کر آئی ہوں۔ میری آنکھوں میں البم کی پر اسرار تصویر گھوم گئی۔ اور میں اس کی قسمت پر رشک کرتا رہا۔ مٹھائی کے دور کے بعد ہم لوگ باہر آئے۔ صابن اور بیسن سے ہاتھ دھوئے گئے۔ پان کھلا کر مومانی نے باتیں چھیڑنے کا بہانہ ڈھونڈھا مگر میں تھکن کا سہارا لے کر اوپر آ گیا۔

کمرے میں ہرے گلوب کا لیمپ جل رہا تھا۔ میں اسٹر اتار کر لحاف میں گھس گیا۔ اور سرہانے سے ایک کتاب اٹھالی لیکن ہر صفحے پر اپیا کی تصویر تھی۔ ہر جملہ ان کی دلگیر آواز میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے کتاب رکھ دی۔ باہر سے ریڈیو بجنے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ دور کتوں اور گیدڑوں کا راگ ہو رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اپیا کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ نماز کی چوکی پر داؤنی باندھے ایک حور کی طرح اپنے چاند سے ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں۔ ان کے لرزتے ہوئے ہونٹوں کے تقدس نے میری آنکھیں بند کر دیں۔ میں چلا آیا۔ البم کی وہ پر اسرار تصویر میرے سامنے تھی۔ پھر میرا دل آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ آنکھوں کے بھاری بھاری پپوٹے جلنے لگے تھے۔ آسمان سے زرد لمحات کی بارش ہو رہی تھی اور میں تنہا اور بیٹھا تھا۔ کارنس پر رکھی ہوئی گھڑی نے میری نگاہ پکڑ لی۔ بارہ بج رہے تھے۔ میں پھر باہر نکل آیا۔ دیوانی رات چاند کی لاش کو اپنی ممتا کے کلیجے سے لگائے قہقہے لگا رہی تھی۔ دبیز پیلی گڑھی کی بوڑھی برجیاں چاندنی میں نہائی کھڑی تھیں۔ میں زینے کی گیلری پار کر کے آگے نکل آیا۔ یہ دوسری منزل کا صحن تھا۔ اس سے گزر کر میں چھوٹی سی دیوار کے پاس آ گیا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے رنگین شیشے لگے تھے۔ ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کے خالی فریم پر میں نے اپنا سر رکھ دیا۔ نیچے ماموں کا کمرہ تھا۔ جارج پنجم کی قدِ آدم تصویر کے قدموں میں پڑی ہوئی بڑی سی مسہری کے تکئے سے پشت لگائے وہ نیم دراز تھے۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ میں ہٹ گیا۔ پھر دروازے کی چیخ آئی۔ میں نے پھر آنکھیں رکھ دیں۔ گدرائے ہوئے بدن کی نسیمن گلے میں دوپٹہ لپیٹے کچھ لیے چلی آ رہی تھی۔ ماموں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں انڈے کے برابر ایک ناریل تھا۔ جس میں ایک نرکل سیدھا اور دوسرا آڑا لگا ہوا تھا۔ سیدھے نرکل پر نسیمن نے ایک چھوٹی سی لمبی سی چلم رکھ دی۔ چلم میں ایک لال انگارہ رکھا تھا۔ آڑے نرکل کی نَے ماموں نے اپنے ہونٹوں میں لے لی۔ اور جلدی جلدی کئی کش لگائے۔ اور ہاتھ بڑھا دیا۔ نسیمن نے چلم انگیٹھی میں الٹ دی۔ پھر ایک سفید ڈبیا سے کالی کالی ٹکیا نکال کر چلم پر رکھی۔ پھر ایک انگارہ چلم پر رکھ کر ناریل ماموں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ماموں نے پھر تین چار دم لگائے۔ اور ناریل نسیمن کو دے کر نڈھال سے بستر پر گر پڑے۔ نسیمن نے ناریل تخت کے نیچے رکھ کر کونے میں کھڑا ہوا نعمت خانہ کھولا۔ چینی کی ایک پلیٹ نکالی۔ ایک چمکتا ہوا بڑا سا چمچ لے کر ماموں کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ماموں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ کرسی کے تکئے سے تولیہ کھینچ لائی اور ماموں کے سینے اور گردن کو ڈھانک دیا۔ پلیٹ کے ترنم کے ساتھ بالائی ختم ہو گئی۔ ماموں نے اسی تولیہ سے اپنا منہ پونچھا۔ نسیمن پلیٹ رکھ کر مسہری کے پائنتی بیٹھ گئی اور جھوم جھوم کر ان کے پاؤں دابنے لگی۔ میں آہستہ آہستہ صحن کی بائیں جانب چلنے لگا۔ سامنے دوسرا زینہ تھا۔ میں پائیں باغ میں اتر آیا۔ داہنی طرف برآمدے میں پردے پڑے تھے۔ سرخ بجری کی روش باغ کے اندر چلی گئی تھی۔ جس کے دونوں طرف اونچے اونچے چنار کے درخت تھے۔ نیچے ترشی ہوئی پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ میں چلتا رہا۔ چھوٹی سی نہر کے کنارے پتھر کی تپائی پر اپیا ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے پیر کانپنے لگے۔ میں نے سگریٹ گل کر دی۔ اور پیڑ کے سامنے کی قنات میں کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ریشمی پائنچے کشمیری سلیپر پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سیاہ رنگ کے گون میں

بڑی باوقار معلوم ہو رہی تھیں۔ جیسے کوئی مغموم شاہزادی بیٹھی ہو۔ ایک لانبی چوٹی ان کے زانو پر رکھی تھی۔ انگوٹھی کا پتھر ایک جنگلی آنکھ کی طرح چمک رہا تھا۔ ان کے قدموں میں سفید السیشن سو رہے تھے۔ سارے باغ پر ایک غمناک سکوت طاری تھا۔ ہواؤں کی گھٹی گھٹی سسکیاں کبھی کبھی خاموشی کو جھنجھوڑ دیتیں۔ جیسے محرم کی مجلسوں میں کوئی جادو بیان انیسؔ کا مرثیہ پڑھتے پڑھتے رک گیا ہو اور لوگ رونا بھول کر بت بنے بیٹھے ہوں۔ میں دیر تک اپنے آنسوؤں کو بہلاتے کھڑا رہا۔ پھر چلا آیا۔ اپیا کے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ بغیر شکنوں کا بستر اپنا آغوش کھولے ان کے ہجر میں بیدار تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر لیٹ رہا۔ لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے جھوٹے خرّاٹے لینے شروع کر دیئے۔ دروازہ کھلا۔ لیمپ کے ساتھ اپیا کی آواز کا شعلہ چمک اٹھا۔

"اختر..... اختر..... اے اختر"

وہ آہستہ آہستہ پکارتی ہوئی میرے بہت قریب آگئیں۔ میں ان کی سانسوں کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ وہ میرے سرہانے مسہری کے کونے پر بیٹھ گئیں۔ ان کی ٹھنڈی ٹھنڈی ملائم ملائم انگلیاں میری پیشانی پر اور بالوں میں لرز رہی تھیں۔ جیسے سارے جہاں کا سکون میری قسمت میں سمٹ آیا ہو۔ ان کا ہاتھ لرزتا رہا۔ اور میں فردوس میں لیٹا رہا۔ وہ اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور میرا شانہ پکڑ کر جگانے لگیں۔ میں نیند سے اٹھنے کی نقل کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"چار بج رہا ہے۔ پانی رکھا ہے۔ منہ ہاتھ دھو لو" ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ میں السٹر پہن کر غسلخانے چلا گیا۔ پھر میں کپڑے پہن رہا تھا کہ اپیا آگئیں۔ واپس لوٹنے لگیں۔ مگر میں نے پکار لیا۔

"تمھیں جھیل پر السٹر اتارنا پڑے گا"

"ضرور"

"پھر اس پلوور میں تو تم جم جاؤ گے" مجھے مسکرانے کا بہانہ مل گیا۔ اپیا گئیں اور ایک پلوور اور ایک سویٹر لے کر واپس آئیں۔

"یہ پلوور نیچے پہن لو اور یہ سویٹر اوپر" ان کے لہجے میں خود اعتمادی کا حکم تھا۔ میں ان کے بدن کی شمیم میں بسے ہوئے سویٹر پہن کر اور قریب آگیا۔

ماموں خاکی رنگ کی سرج کا شکاری کوٹ اور برجس پہنے شال گردن اور کانوں میں لپیٹے فاختئی رنگ کی جناح کیپ لگائے دیوان خانے میں میرے منتظر تھے۔ میں اور ماموں الگ الگ ہاتھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھی خالی چل رہے تھے۔ ادھے کھیتوں میں پھندوا لیے گئے۔ ماموں کا ادھا آگے تھا۔ اس کے دونوں طرف آٹھ دس آدمی تھے۔ آگے کے آدمی بیریں ہشکاتے چل رہے تھے۔ میلی میلی روشنی میں جب ان کے پرے ڈیلوں کی طرح ادھے کے سامنے سے گزرتے تو دھائیں سے ایک فائر ہوتا۔ اور کئی کئی بٹیر لوٹ جاتے۔ ادھا ایک منٹ کے لیے بھی نہ روکا جاتا۔ میں ماموں کے کھچڑی پٹوں کو گھور رہا تھا جو اسی شغل میں اپنی سیاہی کھو چکے تھے۔ اب جھیل سامنے تھی۔ ہم لوگ الگ الگ ہاتھیوں پر سوار ہوئے۔ آدمیوں نے پوری جھیل کا ایک چکر لگایا اور شمال سے گھسنے کا مشورہ دیا۔ ہر طرف ایک ایک آدمی بندوق لے کر روانہ ہوا۔ سورج ابھی ابھرنے نہیں پایا تھا۔ لیکن مطلع روشن ہونے لگا تھا۔ میں کلبلاتی ہوئی چڑیاں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھی انتہائی ہوشیاری اور سکوت سے جھیل میں داخل ہوئے۔ ماموں میرے قریب ہی تھے کہ چڑیاں

کا ایک پرا ابھرا مار کر اٹھا اور ماموں کے سامنے سے گزرا۔ ایک فائر ہوا اور کئی گھڑیاں سی پانی میں گر پڑیں۔ پھر تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بے شمار چڑیوں کی آواز اور پرواز کے ساتھ ان گنت فائر ہوتے رہے اور آسمان سے چڑیاں برستی رہیں۔ بہت سے آدمی پھاند پڑے۔ اور ڈھونڈ کر ذبح کرنے لگے۔ جھیل کے کنارے باغ میں پتوں کا الاؤ لگا۔ ماموں نے ہاتھ سینکے۔ پاسیوں کو بیڑیاں تقسیم ہوئیں۔ چڑیوں کا بورا اڈے میں رکھ کر قافلہ روانہ ہوا۔ کندھوں پہ رکھی ہوئی لاٹھیوں پہ بھیگی دھوتیاں پھیلی تھیں اور آدمی پیڑوں کا سایہ بچا بچا کر دھوپ میں چل رہے تھے۔ گڑھی میں چڑیوں کے بورے کے پیچھے پیچھے ہم لوگ داخل ہوئے۔ اپیا صحن میں کرسی ڈالے بیٹھی ہوئی کچھ بن رہی تھیں۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے مجھے دیکھا پھر لپک کر میرے قریب آ گئیں۔

"تم نے ماریں"

میں جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ حالانکہ ان کی نگاہیں غصہ سے پاک تھیں۔ مومانی ایک طرف سے فرشی پائجامے کے پائنچے ہاتھ میں لئے نکلیں اور مصنوعی ناگواری سے بولیں۔

"توبہ ہے۔ اپنے انڈے بچے لیے بیٹھی ہوں گی بے چاری۔ ... کیا ظلم کرتے ہو تم لوگ ... یہ آدمی کی ذات"

ماموں نے ایک بار ان کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"نسیمن باورچی سے کہہ دو آج سے گوشت نہیں پکے گا۔ اور ہاں دو چار گیرئے رنگ کی دھوتیاں منگا کر اپنی بی بی کو گنگا نہانے بھیج دو۔"

اپیا ایک حسین سی ٹیل کے پروں کو سہلا رہی تھیں۔ نسیمن ماموں کے جوتے کی ڈوریاں کھول رہی تھی۔ میں اوپر چلا گیا۔ نہانے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اپیا آ گئیں۔ ایک بڑا سا رنگین پر نچاتی ہوئی۔ بچوں کی طرح مسرور۔

"تم ایک بار اور شکار پہ چلے جاؤ۔ تو۔ میں تم کو پروں کا تکیہ بنا دوں بڑے اچھے ہوتے ہیں نرم نرم ریشم ایسے۔"

"بڑی دلچسپی ہے آپ کو شکار سے"

"بڑی دلچسپی رکھنا نصیب کہاں ہے"

میں نے نزاکت کو بھانپتے ہوئے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

"آپ بندوق چلا لیتی ہیں"

"ہاں۔ چلانے میں کیا ہوا۔ مگر ملتی کہاں ہے۔ بہت ہوا تو گھر میں ماش کے دانے بھر دیئے گئے اور میں نے پٹاخے کی طرح چھڑا لیئے"

"آپ روز کپڑے بدلتی ہیں" میں نے ان کا سفید دوپٹہ چھو لیا۔

"کپڑے لڑکیاں بدلتی ہیں۔ میں رسم ادا کرتی ہوں"

وہ خوابوں کی دنیا سے واپس آ گئیں۔ ان کے خد و خال دھندلانے لگے۔ رخساروں کی سرخ شکنیں نمایاں ہو گئیں آنکھیں پھر رنجور ہونے لگیں۔ میں نے انھیں روکنا چاہا۔ لیکن الفاظ نہ ملے۔ وہ چلی گئیں۔

مومانی اپنے پاندان کے حضور میں تھیں سلیمن کسی توانا و تندرست آدمی کے سوٹ نیروانیاں اور گرم قمیصیں تاڑ پھیلا رہی تھی۔

باورچی خانے سے چپاتیاں پکنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک طرف کونے میں زنجیر میں جکڑے ہوئے کتے غرّا رہے تھے۔ ان کے لوہے کے تسلے خالی تھے۔ دوسری طرف ایک بوڑھی عورت اپنے سن جیسے بالوں سے لیکھیں پکڑ پکڑ کر مار رہی تھی۔ اس کے قریب کیدرے میں دو چھریاں دال چھڑ رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت مومانی کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ مومانی لفعف پلنگ پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھی تھیں۔ وہ گویا مجھ سے مخاطب ہو کر غمناک آواز میں بولیں۔

"معلوم نہیں یہ اچھے کب آئے گا۔ موئے ہوٹلوں کا کھانا کھا کھا کر کالا ہو گیا ہے۔"

"کتنے دن ہوئے گئے ہوئے" میں نے اخلاقاً پوچھ لیا۔

"ارے میاں کوئی تین برس ہوئے علیگڈھ سے آئے۔ وہ فیل تھوڑی ہوا تھا۔ وہاں بیٹا تو اب ہندو حکومت ہے نا اسی وجہ سے اسے زبردستی فیل کر دیا۔ مگر وہ دس دن بھی جم کر نہیں بیٹھا۔ اپنی بیکاری کا اسے بڑا غم ہے۔ مگر کیا کرے۔ نوکریاں تو جیسے عنقا ہو گئیں۔ اس ہندو حکومت میں کون پوچھتا ہے ہم لوگوں کو ورنہ اب تک ڈپٹی ہو گیا ہوتا میرا لال۔ اپنے انگریزوں کے وقت میں کتنے لڑکے اسی تمہاری گڑھی میں آئے اور ڈپٹی تحصیلدار ہو کر چلے گئے۔"

مجھے ان کی معصومیت پر ترس آ رہا تھا کہ باہر سے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ڈیوڑھی کی طرف چلا۔

"ارے بیٹھ یہ تماشہ تو یہاں روز ہی ہوا کرتا ہے۔"

مگر میں ان سنی کر کے ڈیوڑھی سے گزرتا ہوا دیوان خانے میں پشت کے دالان سے گھس گیا۔ وسیع کمرہ اگر دانوں سے معطر تھا۔ بیچ کا باہری دروازہ اپنی پشت پر چلمن لیے کھڑا تھا۔ ماموں ایک کرسی پر بڑے جلال سے بیٹھے تھے۔ چاندی کا پیچوان مہک رہا تھا۔ اس کی سیمیں نے کرسی کے ہتھے پر پڑی تھی۔ ان کے سامنے دوسری کرسی پر ایک صاحب سعادت مند بچوں کی طرح بیٹھے تھے وہ اتنے تکلف سے اپنا مُنہ کو بھرا منہ چلا رہے تھے کہ رونے کی تشبیہ میرے ذہن میں آ کر جم گئی۔ ان کے پاؤں میں دبیدہ سلیپر تھا۔ ٹخنوں سے اونچا کثیف سا گھٹنا۔ وہ بہت عمدہ سرج کی بہت پرانی شیروانی پہنے تھے۔ ہاتھ کی انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں۔ جن کے شوخ رنگوں کے نگ آنکھوں پر بار تھے۔ شیروانی کی آستینوں اور کالر سے چیچڑے نکل آئے تھے۔ ان کی چاند اور گدی پر فٹ صاف حامدانی کا پلڑا چڑھا ہوا تھا۔ گندمی چہرے پر پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی بے شمار شکنیں ان کے بے ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں پر بھینا دی فریموں کی عینک تھی جس کی ایک کمانی غائب تھی اور تاگہ بندھا ہوا تھا۔ جو ان کی مڑی ہوئی ناک کے بیچوں بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ برآمدے کے نیچے دس بارہ آدمی گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔

"کرشلے"

"سرکار" ایک معمر آدمی ہاتھ جوڑے سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔

"ذرا بھا بیر کے لونڈے کو بلاؤ" وہ بجلی کی طرح مڑ گیا۔

"ممبر صاحب" اور ممبر صاحب کرسی سے ذرا سا اٹھ گئے ان کے چہرے پر فدویت برسنے لگی۔

"آپ ان لوگوں کو سمجھا دیجئے ورنہ سالوں کے گھر کھدوا کر تمباکو بوا دوں گا۔" ایک بوڑھا ملازم کمر جھکائے اپنے رومی کے ابرو ہلا ہلا کر پیچوان کی چلم پھونک رہا تھا۔ چاندی کا چمبر فرش پر پڑا تھا۔ برآمدے میں مکمل سناٹا تھا۔ میں کمرے کے قالین پر ننگے پاؤں چل

رہا تھا۔ لانبے لانبے صوفوں پر شیروں اور چیتوں کی کھالیں پڑی تھیں۔ وسط میں کالے پتھر کی سطح کی منقش میز تھی جس پر بڑا سا چاندی کا خاصدان رکھا تھا۔ دیوار کے نیچے بادام کے کوچ پڑے تھے جن کے تکیوں پر مور ناچ رہے تھے۔ دیوار پر انگریز گورنروں کی بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں — آتشدان کے دونوں طرف زرد رنگ کی دو الماریاں کھڑی تھیں۔ جن کے دروازوں پر آئینے جڑے تھے۔ ایک الماری کا قفل کھلا ہوا تھا۔ میں نے بے خیالی میں کھول دیا۔ اوپری خانے میں چھوٹا سا ریوالور رکھا تھا۔ جس کے دونوں طرف کارتوسوں کے ڈبے چنے تھے۔ مارکو پولو کا ڈبہ اٹھا کر میں نے آہستہ سے کھولا۔ کوئی آدھ پاؤ افیون کا گولہ کاغذ میں لپٹا رکھا تھا۔ میں گھبرا کر کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔ حافظ میرؔ اور غالبؔ کے دیوان۔ انیسؔ کے مرثیے، اقبالؔ کے مجموعے، حفیظؔ کا شاہنامہ، قرآن شریف کی تفسیریں، بخاری شریف کی جلدیں، نیچے بہت سی فارسی اور اردو کی قلمی کرم خوردہ کتابیں سلیقے سے چنی ہوئی تھیں۔ میں نے الماری بند کر دی۔ چھت گیری سے فانوسوں کا حلقہ جھول رہا تھا۔ میں اس کے نقش و نگار دیکھتا رہا۔ باہر سے بہت سے سلاموں کی آواز آئی۔ میں چلمن کے قریب کھڑا ہو گیا۔ پانچ چھ میلے میلے شلوکوں، کرتوں اور دھوتیوں کے درمیان کھدر کا کرتا پہنے سفید دھوتی باندھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی مونچھوں اور چہرے کے خطوط سے کم سنی ٹپک رہی تھی۔ صورت شکل کا برا ہونے کے باوجود وہ پڑھا لکھا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ٹوپی سے اس کی مانگ نظر آ رہی تھی۔ رکہ بچ کے جوتوں پر کھریا لپی ہوئی تھی۔

جابر کہاں ہے، ماموں نے حقے کا کش لے کر پوچھا۔

"کھیت گئے ہیں" اس کی زبان صاف تھی۔

"تو آپ آئے ہیں وکالت کرنے" ماموں کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"وکالت کاہے کی صاحب۔ آپ نے بلایا تھا میں آیا ہوں" وہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔

"ملیا تیری سگی بہن ہے؟" ماموں نے اُسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

"جی ہاں"

"اور تو اُسے فارخطی دلوا رہا ہے"

"جی ہاں"

"اے جی ہاں کے بچے شرم نہیں آتی..... کیا پیشہ کرائے گا جوان بہن سے..... فارسی چھانٹ رہا ہے سالا کھڑا ہوا"

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ساکت کھڑا تھا۔

"مجبور ہو گیا ہے۔ لونڈا ہے۔ لو اکھڑ ہے۔ انہیں بات کرنا نا ہیں آوت ہے" اس کے ساتھ کے آدمی معذرت کر رہے تھے۔

"مائی باپ دین جلئے سرکار" ایک بوڑھے آدمی نے سکوت توڑا۔

"معافی کاہے کی۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہر ساتی دادا کوڑھی ہیں۔ میری بہن فارخطی چاہتی ہے۔"

"اے فارخطی کوئی تماشہ ہے۔ کہ تو نے سکے کی زبان ہلا دی اور فارخطی ہو گئی۔"

"جی میں ڈاکٹری معائنہ کرا دوں گا۔ پھر مجھے ردی کپڑے کا دعویٰ نہیں کرنا ہے۔ میری بہن "قانوناً" ایسا کر سکتی ہے۔ میں پنچایت کر چکا ہوں۔ پنچ رضا مند ہیں۔ مجھے ایک کھانا دینا پڑے گا۔"

"ابے قانون اور پنچایت کے بچے منہ سنبھال کر بات کر۔ میں گنگو تیلی نہیں ہوں۔ سمجھا تو۔ مارے جوتوں کے بھیجا گرا دوں گا۔ سالے نے دو حرف پڑھ کیا لیے ہیں کہ قانون گھمانے لگا۔"

"قانون کی کوئی بات ہی نہیں ہے — میں آپ کو معاملہ سمجھا رہا تھا — میں نے کونسی چوری کی ہے کہ آپ جوتے لگائیں گے۔"

"تو تُو کا سارا ٹر ٹر لگائے ہے۔ او ئی مالک ہیں۔ تو تُو ایک بات کہ پر اگم کھائے جا" پھر کئی آدمی بول پڑے۔

"تو میں گالی کب دے رہا ہوں۔"

"کیا.... گالی...... تو مجھے گالی بھی دے گا.... تیری ماں کا سالے....."

لاتوں اور گھونسوں سے وہ پٹنے لگا تھا۔ پھر ماموں نے جوتا اتار لیا تھا۔ نیچے کھڑے ہوئے پاسیوں نے لاٹھیاں سنبھال لی تھیں۔ اس کے ساتھ کے آدمی تھر تھر تھر کانپ رہے تھے۔

"چھوڑ دیجئے حضور آپ کے چوٹ آ جائے گی" میر صاحب نے سفارش کی۔

ماموں جو اب مارتے مارتے تھک گئے تھے۔ کرسی پر گر سے پڑے۔ بوڑھے خدمتگار نے ان کا ناگرہ ان کے پیروں کو جھاڑ کر پہنا دیا۔ وہ اپنی گاندھی ٹوپی زمین سے اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

"دور ہو جاؤ تم لوگ" ماموں گرجے اور کھڑے ہوئے تمام آدمی منہ جھلاتے پھاٹک کی طرف چل دیئے۔

میر صاحب جو ہاتھ باندھے کھڑے تھے ذرا اور قریب کھسک آئے۔ اور ہکلاتے ہوئے منمنائے۔

"حضور یہ کہیں کوئی فساد...... یعنی میرا مطلب ہے ہندو مسلم کا سوال"

"کیا بکتے ہو.... وہ دن لد گئے جب ہندو مسلم کے چکر میں ان چار پاسیوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ گولی مار دوں گا ایک ایک کے۔"

"حضور.... وہ پرشادی نے کہلوایا تھا کہ چاہے دو ہزار اور خرچ ہو جائیں لیکن مایا میرے گھر آ جائے۔"

"تو آپ اس سے کہیے کہ ایک ہزار جمع کر جائیے.... باقی بعد میں دیکھا جائے گا"

"وہ تو حضور روپیہ باندھے گھومتا ہے"

"تو آپ اس سے بات کر لیجئے۔"

ایک لحیم شحیم کالا آدمی سیاہ چھینٹ کا شلوکا پہنے اور رنگی دھوتی باندھے اور چمرودھا جوتا دبا کر چرچُر کرتا چلا آ رہا تھا۔ جیسے ہاتھی جھوم رہا ہو۔ اس کی بغل میں تیل پلائی لمبی سی لاٹھی تھی۔ جس کے نچلے حصے پر کوئی آدھ سیر لوہا چڑھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ چوڑا اور خوفناک تھا۔ آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے۔ بٹی ہوئی سیاہ مونچھیں کھڑی تھیں۔ اس کے سر پر لال انگوچھا بندھا تھا۔ ایک فرشی سلام کر کے وہ ماموں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"چھدو"

"سرکار"

"کیا میں لال پور چھوڑ کر چلا جاؤں"

کاہے سرکار.... ہم بجن کے ہوت آپ بو کیسے سوچ لیو" اس کے لہجے میں غرور تھا۔

"اس چمار کے لونڈے نے دماغ خراب کر دیا ہے"

"ہم جان نائیں پائیں سرکار"

"وہ پرشادی بیاہ ہے نا ؟ تو سالوں نے اڑا دیا ہے کہ وہ کوڑھی ہو گیا ہے۔ بھلا بتاؤ کہ وہ غریب گھونٹ بھر پانی کو ترستا ہے اور وہ ملیا اپنے گھر میں چمکی بیٹھی ہے۔ میں نے اس لونڈے سے بدائی کی بات چھیڑی تو وہ اُلٹا میرے منہ کو آ گیا۔ کیا زمانہ لگ گیا ہے۔"

"آپ جون دن حکم دے دیو ملیا پرسادی کے رسے گھر ماں دھری ہے۔"

"میں خود سوچ رہا ہوں اس کی بے بسی مجھ سے نہ دیکھی جائے گی۔ ہاں تم آئے کیسے ؟"

آئیں کا سرکار... اوئی جون کارتوس میں آپ جیتے رہو۔ اوئی دھوکا دے گئیں۔ کل رات بہماں رام لال پانڈے کی جھگڑی پہ چلائیں تو وا سارہ لوٹ پوٹ کے ٹھاڑی ہوئے گئی۔

"خوب" ماموں محظوظ ہوئے۔

"اماں، میر صاحب اس کو الماری سے دس کارتوس نکال دیجئے۔"

میر صاحب اپنا سوڈہ بند کر کے اُنگلیاں چاٹتے کمرے میں آنے لگے تو میں دروازے سے نکل گیا۔

"یہ لو... اگر شبرتی سالس لے لے تو میرا ذمہ۔"

میر صاحب نے کارتوس اس کے ہاتھوں میں رکھ دیئے۔ اس نے ان کو اپنی البٹی میں کھونس لیے۔ اس کے دانت بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔

"سرکار پرسوں رات بھر دوڑ آئی رہے۔"

"میں نے ہی تو تم کو اطلاع کرائی تھی۔"

"او تو ہم جانت ہے..... مل آپ تنی درد گا کا سمجھائیے دیو..... روج روج نہ دک کیا کریں۔"

"تم بیوقوف ہو..... کاغذ کا پیٹ بھر جائے گا یا نہیں۔ بس یہ ہے کہ دوش سے پہلے خبر ہو جاتی ہے وہ جانتا ہے کہ تم میرے آدمی ہو..... ورنہ اب تک تو۔"

"ہاں اور کا صاحب..... آپ کیرا اکبال ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جھک کر فرشی سلام کیا اور چلا گیا۔ میں بھی دیوان خانے سے نکل آیا۔ مومانی پاندان کھولے چھالیاں کتر رہی تھیں۔

"کوئی خیال ہی نہیں۔ باہر بیٹھے باتیں جھیل رہے ہیں۔ اتنا وخت آ گیا ہے۔ لڑکا بیچارہ بھوکا ہو گا۔ آپ ہیں کہ اٹھنے ہی نہیں بیوی کیا موئی نونڈی ہے۔ کھانا لیے دو دو بجے دن تک بیٹھی رہے۔ تم بھیا کھانا کھا لو۔ ان کو جھونک چولہے بھاڑ میں وہ تو مٹی کر کے کھانے کے عادی ہیں۔"

"کیا بات ہے زیبی کی ماں کس سے روٹھ گئی ہو۔" ماموں نے صحن میں پہنچتے ہی ارشاد کیا۔ اپنا ہاتھ دھوتی جا رہی تھیں اور مسکرائے جا رہی تھیں۔

"تقدیر کے نسخے کو رو رہی ہوں۔"

"اچھا مشغلہ ہے۔" ایک عورت پانی ڈال رہی تھی اور وہ ہاتھ دھو رہے تھے۔

"ارے تیمن تلک سنگھ سے کہو کہ تے باہر نے جائے۔"

میلی میلی کرتی پہنے اور خوب صاف دھوتی باندھے ایک لانبی سی عورت ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکالے دروازے میں کھڑی تھی۔

"یہ کون ہے؟" ماموں خاصدان کھولتے ہوئے تیمن سے پوچھ رہے تھے۔

"گھر کیری دھوبن ہے۔"

"کیا ہے؟" ماموں اسی سے مخاطب تھے۔ وہ پیروں کے بچھوے دبائے آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔

"ہم کا آپ کے نیر بھیجن ہیں"

"ہاں... کیا بات ہے"

"کرکمین ان کا پکرے بیٹھے ہیں۔ گاری دے رہے ہیں۔ اور بیل بدھیا کھولے لیے جائے رہے ہیں۔ روپیہ ابھیں تیار نائیں ہے۔"

"کتنا لگان ہے۔"

"ساٹھ سے رسے باڑھے ہے۔"

"باہر سے برج لال کو بلاؤ۔"

"ہاں مالک"

"فرق امین کو ساٹھ روپیہ دلا دو۔ اور کہہ دو کہ لال پور میں اگر کسی کو گالی دا آلی دیں گے تو اچھا نہیں ہوگا۔"

گھونگھٹ اس کے تبسم سے گلابی ہو گیا۔

ہم لوگ جائے پی رہے تھے کہ بادامی کاغذ کا ایک پرچہ تیمن نے ماموں کے آگے رکھ دیا۔

"یہ تلک سنگھ بھیجن ہیں" ماموں پرچہ پڑھنے لگے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ پیالی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آج رات کو بیرا کے پل پر دو ہزار روپیہ پہنچ جائے ورنہ ڈاکہ پڑ جائے گا — دلاور خاں۔"

میں پرچہ اپنا کو دے کر باہر چلا گیا۔

"بھگوتی مہاراج کہاں ہیں۔"

"پھاٹک میں بیٹھے ہیں۔"

"بلاؤ"

ایک تنو مند بوڑھا آدمی جوانوں کی طرح سینہ نکالے چلا آ رہا تھا۔ اس کی چاند آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ ماتھے پر بہت سا چندن لگا تھا۔ بڑی بڑی سفید مونچھیں آدھے آدھے گالوں تک چھائی ہوئی تھیں۔

"بندگی ہے مالک۔"

"بیٹھو مہاراج" تلک سنگھ نے مونڈھا بڑھا دیا۔

"یہ دلاور خاں کون ہے مہاراج" اس نے چونک کر ماموں کو دیکھا پھر تلک سنگھ کو گھورا۔

"کل کی مہروا آج ڈاکو ہوئے گئی ہے۔ یہ اکبر پور کا رہنے والا ہے۔ جیل سے بھاگ نکلا ہے۔ اب جوار بھر کے ٹھاکر لوگوں سے روپیہ تحصیل رہا ہے۔ جہاں نا ہیں ملا وہاں ڈاکہ پڑ گوا۔ پولیس والے اُس سے بولت ڈرات ہیں۔"

"ہوں.... خانصاحب نے مجھے بھی پرچہ بھیجا ہے۔"

"آپ کا مالک" اس کی بوڑھی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"پیرا کے پل پر روپیہ مانگا ہے.... کیا کہتے ہو.... دے دوں۔"

"لال پور سے نہ کبھی روپیہ گوا ہے نہ آج جیہے"

میں اُکتا کر چلا آیا۔

ابھی چاند کم سن تھا اور رجانی کنواری۔ میں ماموں سے باتیں کر کے واپس آرہا تھا۔ اپیا کے کمرے کے دروازے کھلے تھے۔ میں نہ جانے کیا سوچ کر اندر چلا گیا۔ وہ آسمانی شال اوڑھے چوکی پر بیٹھی تھیں۔ البم ان کے سامنے کھلا رکھا تھا۔ وہ پراسرار تصویر مجھے یاد آ گئی اور رہی دھمک سے ہو گیا۔ وہ میرے وجود کو نظرانداز کئے اُسی طرح سوگواری سے قالین گھورتی رہیں۔ میں ان کے پاس ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میز پر کالے گلابوں کے مرجھائے ہوئے گلدستے کو گھورتا رہا۔ میں نے سوچا معلوم نہیں اب ان کی خوشبو کس حال میں ہو۔ میں نے سونگھنے کے لیے اپنی گردن بڑھائی۔ ایک تیز سانس لے کر میں چونک پڑا۔ میری سوالیہ نظریں اپیا کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ دیر کے بعد وہ اسی طرح نظریں جھکائے ولگیر آواز میں بولیں۔

"مرجھائے ہوئے گلاب سچ مچ کے گلاب نہیں ہیں۔ البم کی تصویر بھی خیالی ہے۔ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ ایک خوبصورت جھوٹ۔ اور یہ خوبصورت جھوٹ ہی میرا ماضی ہے.... میری زندگی ہے۔"

انھوں نے اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ان کے بالوں میں سونے کا ایک مرصع چاند جگمگا رہا تھا۔ میں اُسے گھورتا رہا۔ کیا یہ مانگ، یونہی سونی رہے گی۔ یہ زریں چاند سنہری خاک بن کر اس اداس اور سنسان رہگذر پہ کبھی نہ بکھر سکے گا۔ ان کے لانبے لانبے آویزے ان کے ہاتھوں کے قریب لرز رہے تھے جیسے منتیں کر رہے ہوں کہ اس طرح مغموم نہ ہو۔

"میں صبح کو جا رہا ہوں اپیا" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اپیا نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ نکال لیا۔ بڑی بڑی غمگین آنکھیں پوری کھول دیں۔ جو اچھی طرح سرخ تھیں۔ ان کے بوجھل پپوٹوں سے اذیت ٹپک رہی تھی۔ ہونٹوں کے گوشے تھرتھرا رہے تھے۔

"اتنی جلدی کاہے کی ہے.... میں جانتی ہوں کہ تم رہنے نہیں آئے ہو.... تمھاری دلبستگی کا یہاں کوئی سامان نہیں ہے لیکن تم لال پور شاید پہلی بار آئے ہو..... پہلی بار آنے والے اتنی عجلت نہیں کرتے۔"

ان کے لہجے میں ٹوٹے خنجر کی خلش تھی۔



قتیل شفائی

"تم نے ابو سے پوچھ لیا ہے؟"

"آج موقعہ نہیں ملا۔ کل صبح ہی کہہ دوں گا۔"

"پہلے ان سے اجازت لے لو پھر چلے بھی جانا۔"

میں اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا۔ انھوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ میں کمرے میں چوکی پر بیٹھ گیا۔ اور سوچتا رہا کہ اپیا جب لکھنو میں ملی ہیں اور جب مل کر رخصت ہوئی ہیں۔ اس وقت میرے دل پہ کیا عالم گذر گیا تھا۔ کتنی راتیں آنکھوں میں کٹی تھیں۔ کتنے دن سوچ میں گذرے تھے۔ میں نے لال پور آ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ اپنے حق میں بھی اور اپیا کے حق میں بھی۔ میں نے لیٹنا چاہا لیکن نیند کہاں تھی وہ تو کہیں بیٹھی اپنے پیروں کے کانٹے چن رہی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ صحن میں ٹہلتے ہوئے کتوں نے میرا استقبال کیا۔ میں بائیں باغ کے زینے کی طرف مڑ گیا۔ سیڑھیوں پر مجھے احساس ہوا کہ میں ان کی حراست میں ہوں۔ میں نے سیٹیاں بجائیں۔ اشارے سے خوشامدیں کیں۔ وہ کچھ ملائم ہو کر دُم ہلانے لگے۔ نہر کے کنارے وہ بنچ خالی تھی جس پر کل اپیا بیٹھی تھیں۔ میں آگے بڑھ گیا۔ امرودوں کے چمن میں کھڑا اس پار کی مدھم روشنی دیکھ رہا تھا کہ قہقہے بلند ہوئے۔ وہ روشنی کی سمت سے آ رہے تھے۔ پھر کسی نے چھدّو کا نام لیا۔ میں آہستہ آہستہ اسی طرف چلنے لگا۔ برفانی ہواؤں کے تھپیڑوں سے کلیجہ کانپ رہا تھا۔ میں نے مفلر درست کیا۔ جیسٹر کے کالر اٹھائے۔ میں خشک پتوں پر احتیاط سے چلتا ہوا روشنی کے قریب آ گیا۔ پختہ اینٹوں کی جالی دار دیوار پر پھوس کا چھپر پڑا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ دو تین آدمیوں کی سرگوشیاں اب آوازیں بن چکی تھیں۔ میں نے اس طرح جھونپڑے کو دیکھا جیسے چور نقب زنی سے قبل دیوار کو ٹٹولتا ہے۔ ایک طرف سایہ تھا۔ لالٹین کی روشنی بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ میں جھانکنے لگا۔ آدھے جھونپڑے میں تختوں پر پیال بچھا تھا۔ بلّم، لاٹھیاں کانتے اور بہت سے تیر دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ ایک آدمی جس کا رُخ میری طرف تھا چھوٹی سی چلم کے دم لگا رہا تھا۔ اس کے داہنی طرف بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی رکھی تھی۔ وہ قد آور اور تندرست تھا۔ اس کی بھوری بھوری مونچھیں بڑی پُرغرور تھیں۔ اس کا رنگ صاف اور چہرہ تنا ہوا تھا۔ وہ چلم دوسرے آدمی کو دیتے ہوئے بولا۔

"آج چھدّو میاں سے کہن ہیں..... ٹکھیو کا حکم ہوت ہے.... مل ہے یار بڑی جور دار مہروا۔"

دوسرا جو زمین میں لکیریں کھینچ رہا تھا۔ فلسفیانہ انداز میں بولا۔

"یار پنچایت ہو چکی ہے... اور بھائی اد کا ایسے پاس ہے۔ کہوں سب لوٹے بگڑ گئے تو کرکری دھری ہے۔"

"کا یار اڑاوت ہو.... گولی کے رے سامنے کوئی رکا ہے۔" پہلے نے کہا۔ تیسرا جو چلم الٹ رہا تھا بولا۔

"یار دوئی مہینے ہوئے گئے.... میاں ایک چھدام نائیں دیہن"

"چھدام کہوں ہوئے تو ملے۔ تین سَو بگہہ ماس رام لال پانڈے چرائے رہیں۔ تنخواہ کون منہ سے مانگی جائے۔" تھوڑی دیر سناٹا رہا۔

"کل رات گئے تک بٹیا صاحب نہر کے پاس بیٹھی رہیں۔"

"بٹیا صاحب" سب چونک پڑے۔

"ہاں یار... ہم اٹھے..... تو کریا کوٹ چمکا... ہم لپکے چلے تو دیکھا کہ بٹیا صاحب۔ ہم بیٹھے رہیں... کلہے سے کہ رات بہت چڑھ گئی ہے۔ کتے ان کے پاس رہیں۔ تھوڑی دیر ماں اوئی آئے گئے۔ مہمان... کا نام ہے اختر بھیا۔ وہو اپنے

کھڑے رہے۔ پھر ان کے جانے کے بعد.... بڑی دیر بعد بٹیا صاحب گئیں۔

"یار پنڈت آج سویرے جب میاں شکار گئے رہیں ایک پولیس والا گڑھی کے لیے چکر لگاوت رہے۔"

"پولیس والا"

"ہاں ہو.... ہم اوکا پھپھولئے لیا۔ کل او نا ڑگوا"

وہ توانا اور خوبصورت آدمی متردد ہوگیا۔ اس کی چمکدار آنکھیں سوچنے لگیں۔

"پنڈت.... تمہارا کتنے دن سے وارنٹ ہے"

"تین برس"

یکایک سے بہت سی آوازیں آنے لگیں۔ میں تیزی سے زینے کی طرف لپکا۔ ڈیوڑھی پہ کوئی چلا رہا تھا۔ میں زینے سے کوٹھے پر گیا اور پھر نیچے اتر آیا۔

"کون...... اختر"

"جی"

"تم ابھی جاگ رہے ہو"

"جی ہاں..... ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔"

"ایک چیتا پکڑا گیا ہے.... چلوگے دیکھنے" نسیمن ان کو رائفل دے رہی تھی۔

"جی ہاں چلیے"

پندرہ بیس آدمی مشعلیں لیے ماموں کے پیچھے چل رہے تھے۔ چلتے رہے۔

"سرکار ای سامنے والی پھلواری ماں ہے۔" میں سامنے کی پھلواڑی کو آنکھیں گاڑے دیکھ رہا تھا۔

"آپ مالک تنی ای مکان ماں رک جاؤ.... ہم لوگ ہاتھ سینک لئی۔"

ایک آدمی نے لپک کر سڑک کے کنارے کے مکان کا پھاٹک کھول دیا۔ صحن میں قدم رکھتے ہی ماموں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے چھپر کی تھمڑیا سے ایک دبلا پتلا لمبا سا آدمی رسیوں میں جکڑا کھڑا تھا۔ اس کے بدن پہ ایک چیتھڑا بندھا تھا۔ اور جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ اس کے بیٹے کا پتا مشکل تھا۔

"یہ کون ہے بھگوتی" ماموں کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"یہ سرکار دولاور خاں ہیں۔ ہاتھی کے منہ سے گنے لینے آئے تھے۔"

"اسے کھول دو مہاراج" ماموں ٹارچ کی روشنی میں اس کے سینے کے زخم پہ ریوالور کی نال سے نشان بنا رہے تھے۔

"سرکار.... یہ" مہاراج نے تامل کیا۔

"اگر یہ واقعی بدمعاش ہوگا تو زندگی بھر ہمارے جوار کا رخ نہ کرے گا"

"آپ مالک ہو" آدمی اس کی رسیاں کھول رہے تھے۔

میری آنکھ کھل گئی۔ موٹر کی گڑگڑاہٹ بالکل واضح تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے۔ میں سگریٹ سلگا کر باہر نکل آیا۔ اپا کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔ زینے پر میں ٹھٹھک گیا۔

"سونا" مومانی کی بھنچی ہوئی آواز گونج گئی۔

"ہاں امی کئی جگہ میں نے دکھلایا۔ سب نے یہی کہا کہ اس میں سونا زیادہ نکل جائے گا۔ میں کیا کرتا۔"

"خدا غارت کرے ان ٹھگوں کو جہیز کے زیور میں سونا بتاتے ہیں اور وہ بھی نہائی ..... خدا کا شکر ہے کہ بیتل نہیں بنا دیا۔ اچھا وہ جڑاؤ۔"

"وہ بکے ہی نہیں —— اتنے بہت سے زیور —— اور دس ہزار لگ رہے تھے۔"

"اچھا سب کتنے میں بکے ہیں؟"

"اٹھارہ ہزار نو سو۔"

"خیر"

"مگر صاحبزادے یہ کون سی عقلمندی ہے کہ آپ ۴ بجے رات کو کرائے کی موٹر لے کر چلے آ رہے ہیں۔ اکیلے آنا ہی حماقت ہے۔ نا کہ اتنے روپے کے ساتھ۔"

"کسی کو کیا معلوم امی . . کہ اس بستر بند میں اتنا زیور اور اٹھارہ ہزار روپیہ ہے۔"

"اٹھارہ ہزار نہیں .... اٹھارہ ہزار نو سو۔"

"جی ہاں ... اٹھارہ ہزار نو سو" اس کے لہجے میں تندی تھی۔

"لیکن پھر بھی تم کو احتیاط برتنا چاہئے تھی۔ زمانے کی جو حالت ہے وہ تم سے چھپی نہیں ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ارے بیٹا زیبی۔"

"جی"

"وہ اختر میاں تو نہیں اٹھے۔"

"جی نہیں .... وہ سو رہے ہیں۔"

"بیٹا صاحب پانی کھولتا ہے۔"

"انڈیل لاؤ" پھر تاش میں پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔

"یہ اختر کون ہیں۔"

"اختر نہیں .... اختر بھائی .... تم سے بڑا ہے۔" مومانی تعارف کرانے والی تھیں شاید کہ ماموں بولے۔

"زیبی کی ماں میرے سرہانے سے کنجی منگوا کر یہ سامان اسی وقت تہ خانے میں رکھوا دو۔"

"ہاں ابھی اٹھتی ہوں۔"

صبح میری آنکھ کھلی تو چشمہ لگا ہوا تھا۔ میں بوکھلا گیا۔ کہ ہنسی کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ اپا کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک

نیلا کا غذ تھا۔ وہ پڑھتی جاتیں اور ہنستی جاتیں۔ کمرے کی دیواروں پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کریم کلر کا اسٹر پہنے تھیں جوڑے میں سفید پھول لگے تھے۔

"آداب عرض"

"جیتے رہو"

"کیا پڑھ رہی ہیں آپ"

"ایک صاحب ہیں جو امتحان کے بعد والی محنت کر کرا کے کسی طرح بی۔ اے سے ڈھلک آئے ہیں۔ اب وہ مصر ہیں کہ میں شاعر ہوں تو اس وقت انھیں کے کلام بلاغت نظام کے حضور میں ہیں"

"کوئی شعر پڑھیئے ذرا"

"عرض کرتے ہیں ـــــ یعنی ارشاد کرتے ہیں" ؎

میں کاکل و زنجیر کی صحبت میں رہا ہوں
ہر بھی خس و خاشاک ہے وہ بھی خس و خاشاک

"واہ واہ ایپا کیا شعر کہہ دیا ہے ظالم نہیں.... جواب نہیں ہے قسم خدا کی ایپا"

میں پیٹنے ور داد دینے والوں کی تعریف کر رہا تھا۔ ایپا مجھے بہکا دینے والی تبسم نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ ان کے چہرے کے جلال سے دلبری پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ایپا ایک بات بتلائیے"

"جی ـــ ارشاد"

"میں شعر نہیں بات کہہ رہا ہوں"

"کچھ منہ سے پھوٹیے تو"

"اگر کوئی کسی کی جیبوں کی تلاشی لے تو اس کی کیا سزا ہے"

"قبل اس کے کہ آپ کو جواب دیا جائے آپ اس کی سزا تجویز کیجیے جو لڑکیوں کے البم پھاڑ پھاڑ کر تصویریں دیکھتے ہیں"

میں نے سر سے لحاف اوڑھ لیا۔

"اے اٹھو دیکھو اچھے آیا ہے ـــ تم سے ملنے کا بہت مشتاق ہے"

"اچھا" میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"کب آئے ہیں..... کہاں ہیں"

"ایکٹنگ اچھی کرتے ہو۔ بمبئی چلے جاؤ کہیں نہ کہیں کھپ جاؤ گے" ایپا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

میں چپ ہو گیا۔

"تو آپ سینما بھی دیکھ لیتی ہیں۔ اور ظرافت سے بھی تعارف ہے آپ کا"

"اب اٹھ پڑو ـــ چائے لگی ہوئی ہے۔"
اس کا رنگ صاف اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اس کی فوراً بنی ہوئی داڑھی سے سبزی جھلک رہی تھی۔ اس کے سفید اور مضبوط ہاتھ میں
نے کی چین کی گھڑی تھی جسے وہ ڈریسنگ گاؤن کی آستین سے باہر نکالے ہوئے تھا۔ اور بار بار اپنی انگوٹھیوں کو دیکھتا تھا مجھے چائے کی
ت گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ پُرمعنی انداز میں ہنسا۔
"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں آپ اختر بھائی؟"
"FORGET ME NOT" "مومانی بھونچکوں کی طرح ہم لوگوں کو دیکھے جا رہی تھیں اور ہم لوگ پیالیاں اور طشتریاں
بھڑبڑھ کر ہنس رہے تھے۔ ماموں نے صرف ایک مسکراہٹ سے ہم لوگوں کا ساتھ دیا۔
"یہ بھیا تم کو ابھی سے کیا سوجھی ہے جانے کی؟"
"چھٹی ختم ہو گئی ہے مومانی" ماموں نے مجھے دیکھا اور چائے کی پیالی رکھ دی۔
"تحصیل یہاں سے چار میل ہے۔ سواریاں موجود ہیں۔ تم بجائے تحصیل میں رہنے کے یہیں رہو.... روز چلے جایا کرو اور چلے
آیا کرو۔ نائب تحصیلدار کے لیے تحصیل میں رہنا ضروری نہیں ہے اور اگر ہوگا بھی تو تمہارے لیے نہیں ہوگا۔ میں لوگوں سے کہہ سن دوں گا۔
اور آج نوانوار ہے میاں؟" میں خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ اور دل ہی دل میں کل جانے کا پروگرام بناتا رہا۔ چق اٹھا کر ایک دس بارہ
سال کا لڑکا آیا اور شرما شرما کر کہنے لگا۔
"بھیا صاحب تلاؤ ماں مارچیڑیا پڑی ہیں۔ جنگھے دیکھو مار بھربھراہٹ ہے۔"
"ہاں تم دیکھے رہو" اچھے اس کی نقل کر رہا تھا۔
"ہم انھیں دیکھے آئے رہے ہیں"
"اچھا ہو.... تم چلو.... ہم آئے رہے ہیں" میں بھی اچھے کے ساتھ ہنس پڑا۔
"نسیمن" وہ تقریباً چیخ پڑا۔

"جی"
"ملک سنگھ سے کہو کتے لے جائے۔ میں تالاب تک جاؤں گے.... چار آدمی چلیں گے۔"

"جی اچھا" وہ مڑ گئی۔
گاؤں کے کتے بھونک بھونک کر بھاگ رہے تھے۔ سفید السیشن آدمیوں کو گھسیٹتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ پھاٹک کے سامنے
کا میدان ختم ہو چکا تھا۔ آبادی شروع ہو گئی تھی۔ داہنی طرف مسجد تھی جس کی بغل میں گلی تھی۔ گلی میں ایک صاحب کھڑے ہوئے بڑی بے نیازی سے
استنجا کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے تین عورتیں میلے میلے کپڑے پہنے لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے گھڑے اٹھائے کھڑی تھیں۔ سامنے ایک مکان کے
چبوترے پر لڑکے ہری لال ٹوپیاں پہنے گولیاں کھیل رہے تھے۔ اچھے کو آتا دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ گندگی اور غلاظت سے
بچتے ہوئے چل رہے تھے۔ کنوئیں کی جگت پر شطرنج بچھی تھی۔ دو آدمی کھیل رہے تھے۔ باقی دیکھ رہے تھے۔ قرآن پاک کی قسمیں کھا رہے تھے
اور گالیاں بک رہے تھے۔ پرچون کی دکان پر ایک صاحب "ریاست" اخبار پڑھ رہے تھے۔ دوسرے صاحب فرما رہے تھے۔ اماں یار عجیب

آدمی جو سنیما میں دکھایا جاتا ہے کہ یہ پل بن گیا وہ کارخانہ کھڑا ہو گیا۔ یہ سب غلط ہے۔ جیسے سنیما میں جھوٹی محبت اور تماشے دکھائے جاتے ہیں ایسے ہی یہ سب کھلواڑ ہے۔ بھلا یہ حکومت اتنے بڑے بڑے کارخانے کھول دے گی۔ کمال کرتے ہو یار۔

"اچھے یہاں ہندوؤں کی آبادی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس اب ہندوؤں کی آبادی شروع ہوتی ہے۔"

اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ گوبر سے لیپے ہوئے صاف ستھرے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کنویں پہ لوگ نہا رہے تھے۔ چھپروں پہ کپڑے پھیلے تھے۔ دروازوں پر چھوٹی چھوٹی گائیں بھینسیں بندھی تھیں۔ ساری دکانیں اسی علاقے میں تھیں۔ یہ لال پور کا گنج تھا۔ سڑک کے دونوں طرف گھنی آبادی تھی۔ ایک چبوترے پر چٹائی بچھی تھی۔ ایک پنڈت جی بہت سے لڑکوں کو ہندی پڑھا رہے تھے۔ لال اور ہری ٹوپیاں سجی ہوئی پاٹ کر رہی تھیں۔ جو عورت نظر آتی چاندی کے چھوٹے موٹے زیوروں میں گندھی ہوئی۔ کہیں کہیں سونے کے دبلے پتلے زیور بھی نظر آتے۔ یہاں اچھے کو سلاموں کے علاوہ نمستے بھی مل رہے تھے۔ اکثر جوان آدمی نظر انداز کر جاتے۔ بوڑھے کھڑے ہو ہو کر سلام کرتے۔ عورتیں گھونگھٹ کھینچ کر اس کے وجود کا اعتراف کرتیں۔ تالاب نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک چوٹ کی طرح حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ پانی میں نرمی اگی ہوئی تھی۔ کنارے پر دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ ایک کمسن سی سلونی سلونی دھوبن گھاس پہ کپڑے پھیلا رہی تھی۔ تلک سنگھ تین آدمیوں کے ساتھ بندوقیں لیے کتوں کو سنبھالے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اچھے میرے بالکل قریب آ گیا اور سرگوشی کی۔

"آپ کے متعلق کیا خیال ہے؟" وہ اسی نمکین سی دھوبن کو گھور رہا تھا۔

"ایک چار نمبر کا کافی ہوگا" اس نے فلک شگاف قہقہہ بلند کیا۔ اور دھوبن نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ دھوبی سلام حضور سلام کے نعرے لگا رہے تھے۔ اچھے تالاب کی دائتی پہ بیٹھ کر دوربین سے چڑیاں پہچان رہا تھا۔ جو ہم لوگوں سے بہت دور تھیں۔

"تلک سنگھ..... دو تین بھینسیں منگواؤ..... یہ ایسے نہیں مار کھائیں گی"

پھر بھینسیں تالاب میں احتیاط سے ہانک دی گئیں۔ اچھے ان کی آڑ میں دور تک چلا گیا۔ اور بیٹھی ہوئی چڑیوں پر فائر کیا۔ پھر اڑان پر بھی کامیاب فائر کئے۔ آدمی پھاند پڑے تھے اور چڑیاں نکال رہے تھے۔ ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ اچھے بہت خوش تھا۔ تلک سنگھ چڑیاں بھجوا چکا تھا۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ سگریٹ پیتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ ایک آدمی قریب سے چلاتا ہوا بھاگتا نکل گیا۔

"گنگا پرساد مارے گئے..... پولیس والے مارن ہیں۔"

تلک سنگھ اسے پکارتا ہی رہا وہ نکل گیا۔ اچھے اپنے گاگل اتارتا ہوا چیخ پڑا۔

"دیکھو دیکھو یہ کیا قصہ ہے۔" ایک آدمی بھیگی دھوتی درست کرتا آگے کو بھاگ گیا۔ میں نے اچھے کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"یہ گنگا پرشاد کون ہے؟"

"للو کا خاص آدمی ہے۔ ایک نئے منشی جی چوکی پہ آئے ہیں۔ یہ گل انھیں کا کھلایا معلوم ہوتا ہے؟" اس کی آواز بہت دور سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔

"عدالت پنچایت کا پریسیڈنٹ کون ہے؟"

"للو کے منشی ممبر صاحب" اس کا لہجہ بدستور فکرمند تھا۔ گویا وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اب ہم لوگ تیز قدموں سے چل رہے



احمد ندیم قاسمی

تھے۔ مسجد کے پاس بھیڑ لگی تھی۔ بہت سے آدمی زور زور سے بول رہے تھے۔ اچّے کو دیکھتے ہی خاموش ہو گئے۔ دو کانسٹیبل کھڑے بیڑی پی رہے تھے۔ وہ خاکی قمیص پر دھوتی باندھے ہوئے تھے۔ اَچّے انھیں سے مخاطب ہوا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟"

"لال پور کے پریسیڈنٹ مارے گئے ہیں" ایک کانسٹیبل نے جو صورتاً فسادی معلوم ہو رہا تھا تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

"جس دن لال پور کے پریسیڈنٹ مارے جائیں گے اس دن لال پور میں گولی چل جائے گی کوئی لاشیں ڈھونے والا بھی نہ ملے گا۔"

اچّے غصے سے کانپنے لگا تھا۔ مجمع ادھر ادھر کھسکنے لگا تھا۔ دونوں سپاہی ایک گلی میں مڑ گئے۔ ماموں دالان میں ٹہل رہے تھے۔ چھدّو پاس ہی اور پائیں باغ والا پنڈت اور دوسرے بہت سے آدمی نیچے کھڑے تھے۔ میر صاحب بٹوہ کھولے تمباکو پھانک رہے تھے۔ میں دیوان خانے میں بیٹھ کر خاصدان کے نقش و نگار دیکھنے لگا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا چھدّو" ماموں کی آواز پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

"بات یہ ہے سرکار کہ رام لال پانڈے اور رہا بیر ہیں ایکے گروہ کے۔ رہا بیر کے لونڈے کے آپ دو ٹھو تھپڑ مار دیے ہو ـــ اُدھر چڑھا ہوا ہے۔ پھر جوگی کے منشی ہیں نودھر۔ تو ای سب لوگ ایک ہوئے گئے ہیں۔ گنگا پرساد ہے آپ کی ناک کا بال۔ تو گنگا پرساد ای بیے مارا گوا ہے کہ دوسرے آدمین کے کان ہوئے جائیں اور ای لوگ آپ کی مود پر نکلت ڈرائے لاگیں۔"

ماموں اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ انھوں نے پیچوان کی نے اٹھالی۔ خدمتگار نے نیچے کا گٹا دابایا اور چلم پھونکنا شروع کی۔

"چھدّو!"

"ہاں مالک"

"رام لال کے نام وارنٹ بھی تو ہے؟"

"کا سرکار آج کا ہے! مہینے ہوئے گئے۔ پُل ادکا کون پکڑے! گروہ اتنا بھاری۔ پھر کپتان تک پہنچ۔ دروگا اوکا سلام کرت ہیں"

"کیا ہے" ماموں ایک نو وارد سے پوچھ رہے تھے۔

"اب سرکار سنا نائیں جات ہے"

"بات کیا ہے" ماموں جھنجھلا گئے۔

"کا کہی سرکار۔۔۔ ماں بہن کی گالی دے رہے ہیں"

"کیکا؟" تلک سنگھ، چھدّو اور پنڈت سب ایک ساتھ چیخ پڑے۔

"کیکا کہی۔۔۔ ملکن کہماں دے رہے ہیں" ایک بھیانک سناٹا چھا گیا۔ پھر چھدّو اپنی لاٹھی اٹھا کر گھوم پڑا اور پھاٹک کی طرف چلا۔ پھر سب آدمی ایک دوسرے کو للکار کر اس کے پیچھے ہو لیے۔

"چھدّو" ماموں گرجے۔ جو جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا۔

"ہاں سرکار"

"تم علاقے چلے جاؤ۔ پانچ سو آدمیوں کا انتظام کر کے میرے حکم کا انتظار کرو۔۔۔۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔" ان کے لہجے کی گھن گرج واپس آ گئی تھی۔

"نانک سنگھ"

"سرکار"

"ہاتھی کھلواؤ۔۔۔۔ میں ابھی علاقے جاؤں گا۔"

اپیا گود میں ایک کالے کالے موٹے موٹے لڑکے کو لیے بیٹھی تھیں۔ جس کی آنکھوں میں ڈھیروں کاجل لگا تھا۔ ماتھے پہ کالی انگلی بنی تھی۔ اپیا اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بھی کھلکھلا رہا تھا۔ اجلے صحن میں آرام کرسی پر بیٹھا بندوقیں صاف کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک بھوری جیکٹ اور شکاری پتلون پہنے تھا۔ اس کی آواز کی کرختگی اور چہرے کی سختی ابھی تک زندہ تھی۔ مولانی پاندان کھولے ماموں کی ڈبیا میں پان رکھ رہی تھیں۔ میں اپیا کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ اُسے بھینچ بھینچ کر پیار کر رہی تھیں۔ جب میں انھیں دیکھ کر مسکراتا تو ان کے کان کی لویں خون ہو جاتیں۔

"کس کا لڑکا ہے" میں ذرا ہنسنا بولنا چاہتا تھا۔

"ایک عورت کا"

"عورت تو خیر آپ بھی ہیں۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہیں۔ میں خلا میں نظریں گاڑے موضوع ڈھونڈھتا رہا۔ کیا باتیں کروں آخر۔

"کیا سوچ رہے ہو۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا نہ سوچنا چاہیے۔"

دیوان خانے کے چبوترے سے لگا ہاتھی کھڑا تھا۔ ادھا پھاٹک کے قریب تھا۔ نانک سنگھ رائفل لیے ہاتھی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہونے لگے اور بھویں مشکل سے دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے کان سے بیڑی نکال کر سلگائی کہ ماموں آ گئے۔ فیلبان نے ہمو ترے کے برابر ہاتھی بٹھا دیا۔ ماموں سوار ہو گئے۔ ہاتھی کے پیچھے ادھا چل دیا۔ میں دالان میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

مغرب کی نماز کے بعد ہی کھانا لگ گیا۔ مولانی اور اپیا نماز پڑھنے والے انداز میں انتہائی سکون سے کھانا کھا رہی تھیں۔ ماموں اور اجے کے چہروں پر پھیکی سنجیدگی برس رہی تھی۔ [illegible] مرغ کی ٹانگ کاٹتے ہوئے ماموں نے اجے سے کہا۔

[illegible] کہیں نکل نہ جائے۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سگریٹ کیس کھولا۔ اس نے میری طرف بڑھایا۔

[illegible] بولا رہا تھا۔

"اچھے ..... اگر وہ تفریحاً جا رہے ہوتے تو میں ہرگز نہ جاتا۔"

"جی ... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"گڑھی میں میرا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا ... تم یہاں رہو ... ممکن ہے ان کو میری ضرورت پڑے ..... اس کی ضرورت نہیں ہوگی ... لیکن پھر بھی۔"

اگر کی بتیوں اور خمیرہ تمباکو کی مہک سے دیوان خانہ مہک رہا تھا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں ماموں ایک پر اسرار سائے کی طرح دراز تھے۔ تلک سنگھ کمبل اوڑھے ان کے پیروں کے پاس اکڑوں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ توقف سے ماموں اٹھے۔ برآمدے سے ہوتے ہوئے بائیں باغ کو پار کر کے ایک چھوٹے سے دروازے سے ہم لوگ باہر نکل آئے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میرا وجود ماموں کے لیے بار ہے۔ لیکن اب واپس ہونا اس سے بھی برا ہوتا۔ ہم لوگ اونچا نیچا میدان پار کر کے ندی کی دانتی پر آ گئے۔ سامنے چار پانچ آدمی بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔ جیسے مٹی کے ڈھیر پر جگنو چمک رہے ہوں۔ وہ لوگ کھڑے ہو گئے۔ لانبی لانبی بے ڈھنگی کشتیاں گھسیٹ کر کنارے لائی گئیں۔ ندی سے نکل کر ہم لوگ باغ میں آ گئے۔ ٹارچ کی روشنیوں نے ماموں کو سلام کیا۔ دونوں ہاتھی کھینچے کھڑے تھے۔ ہاتھی بٹھلائے گئے۔ کارواں چل پڑا۔ ہاتھی کھیتوں کی مینڈوں پر سنبھل سنبھل کر مگر تیز چل رہے تھے۔ پیچھے کوئی تیرہ آدمی سائیوں کی طرح اڑتے چلے آ رہے تھے۔ ماموں کا ہاتھی بہت آگے نکل گیا تھا۔ گویا چھوٹا سا پہاڑ چل رہا ہو۔ ایک باغ میں ہاتھی رُک گیا۔ داروغہ جی چوکیدار کے صافے پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے ایک مسلح گارڈ تھا۔ وہ ماموں سے بات کر رہے تھے۔ کہ ایک سائیکل باغ میں داخل ہوئی۔ ساتھ ہی تلک سنگھ بول اٹھا۔

"سرکار چھدو آئے ہیں"

"چھدو کیا خبر ہے؟"

"سرکار رام لال پانڈے کے بھتیجے کا مونڈن ہے آج۔ ناچ جوروں پر ہو رہا ہے۔ مجمع میں آدھی پہنچ گئے ہیں۔ جانے بندوقیں دھری ہیں۔ مُل درگاجی وردی اتار دیں کا ہے سے کہ اودی لوگ کچھ سنکے بیٹھے ہیں؟"

ماموں چھدو اور داروغہ جی سے بڑی دیر تک باتیں کیا کیے۔ پھر ہاتھی بٹھلائے گئے۔ آدمی کئی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ داروغہ جی ایک کمبل اوڑھ کر ماموں کے ہاتھی کے پیچھے ہو لیے۔

ایک شامیانے میں کئی گیسیں جل رہی تھیں۔ جن کی تیز روشنی میں ایک "بتریا" بہت سا پوڈر تھوپے بھاری بھاری کپڑے پہنے کولھے مٹکا رہی تھی اور "سیاں کا آوا سندیسہ" کے بول دہرا رہی تھی۔ شامیانے کے اندر اور دور تک باہر سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں لاٹھیاں اور نعلیں چمک رہی تھیں۔ بھوسے گوبر اور بہت سے آدمیوں کی بدبو کے بھبکے اُڑ رہے تھے۔ ماموں بہت سکون سے روپے برسا رہے تھے۔ چھدو اور تلک سنگھ ان کے گاؤ کے پیچھے رائفل لیے بیٹھے تھے۔ ان کے داہنے ہاتھ پر رام لال پانڈے بہت ادب سے دوزانو بیٹھا تھا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیر کا سن رسیدہ آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خاطر نہ کر سکا ہو۔ تھوڑی دیر بعد ایک دس سال کا لڑکا کُرتا پہنے دھوتی باندھے بہت سا تیل چپڑے سکڑتا ہوا آیا اور جھک کر ماموں کے پاؤں چھو لیے۔

"یہ آپ کا بھتیجا ہے سرکار" رام لال پانڈے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"جیتے رہو" ماموں نے ایک دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں مسکرا دیں۔

"تم علاقے چلے جاؤ۔ پانچ سو آدمیوں کا انتظام کر کے میرے حکم کا انتظار کرو۔... نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔" ان کے لہجے کی گھن گرج واپس آ گئی تھی۔

"تلک سنگھ"

"سرکار"

"ہاتھی کھلواؤ۔... میں ابھی علاقے جاؤں گا۔"

اپیا گود میں ایک کالے کالے موٹے موٹے لڑکے کو لیے بیٹھی تھیں۔ جس کی آنکھوں میں ڈھیروں کاجل لگا تھا۔ ماتھے پر کالی انگلی بنی تھی۔ اپیا اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بھی کھلکھلا رہا تھا۔ اچے صحن میں آرام کرسی پر بیٹھا بندوقیں صاف کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک بھوری جیکٹ اور شکاری پتلون پہنے تھا۔ اس کی آواز کی کرختگی اور چہرے کی سختی ابھی تک زندہ تھی۔ ممانی پاندان کھولے ماموں کی ڈبیا میں پان رکھ رہی تھیں۔ میں اپیا کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ اُسے بھینچ بھینچ کر پیار کر رہی تھیں۔ جب میں انھیں دیکھ کر مسکراتا تو ان کے کان کی لویں خون ہو جاتیں۔

"کس کا لڑکا ہے" میں ذرا ہنسنا بولنا چاہتا تھا۔

"ایک عورت کا"

"عورت تو خیر آپ بھی ہیں۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہیں۔ میں خلا میں نظریں گاڑے موضوع ڈھونڈھتا رہا۔ کیا باتیں کروں آخر۔

"کیا سوچ رہے ہو۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا نہ سوچنا چاہیئے۔"

دیوان خانے کے چبوترے سے لگا ہاتھی کھڑا تھا۔ ادھا پھاٹک کے قریب تھا۔ تلک سنگھ رائفل لیے ہاتھی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہونے لگے اور بھویں مشکل سے دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے کان سے بیڑی نکال کر سلگائی کہ ماموں آ گئے۔ فیلبان نے چبوترے کے برابر ہاتھی بٹھا دیا۔ ماموں سوار ہو گئے۔ ہاتھی کے پیچھے ادھا چل دیا۔ میں دالان میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

مغرب کی نماز کے بعد ہی کھانا لگ گیا۔ ممانی اور اپیا نماز پڑھنے والے انداز میں انتہائی سکون سے کھانا کھا رہی تھیں۔ ماموں اور اچے کے چہروں پر بھی متفکر سنجیدگی برس رہی تھی۔ ہاتھی دانت کی چھری سے مرغ کی ٹانگ کاٹتے ہوئے ماموں نے اچے سے کہا۔

"تم گڑھی پر رہنا میں ذرا دیر میں آؤں گا... کہیں نکل نہ جانا۔"

"میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

میرا جملہ ختم کر کے ماموں نے لقمہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ اور نگاہوں نے کچھ سوچا جب نظر اٹھائی تو اچے انھیں گھور رہا تھا۔

"اچھا" ماموں پھر کھانا کھانے لگے۔

میں پتلون پہن رہا تھا کہ اچے آ گیا۔ سگریٹ کیس کھول کر اس نے میری طرف بڑھایا۔

"اختر بھائی آپ ابّو کے ساتھ نہ جائیے... وہ لفر بچاً نہیں جا رہے ہیں" وہ کچھ نادم سا سر جھکائے بول رہا تھا۔

"اچھے .... اگر وہ تفریحاً جا رہے ہوتے تو میں ہرگز نہ جاتا۔"

"جی ... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"گڑھی میں میرا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا ... تم یہاں رہو ... ممکن ہے ان کو میری ضرورت پڑے .... اس کی ضرورت نہیں ہو گی ... لیکن پھر بھی۔"

اگر کی بتیوں اور خمیرہ تمباکو کی مہک سے دیوان خانہ مہک رہا تھا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں ماموں ایک پراسرار سائے کی طرح دراز تھے۔ تلک سنگھ کمبل اوڑھے ان کے پیروں کے پاس اکڑوں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ توقف سے ماموں اٹھے۔ برآمدے سے ہوتے ہوئے بائیں باغ کو پار کر کے ایک چھوٹے سے دروازے سے ہم لوگ باہر نکل آئے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میرا وجود ماموں کے لیے بار ہے۔ لیکن اب واپس ہونا اس سے بھی برا ہوتا۔ ہم لوگ اونچا نیچا میدان پار کر کے ندی کی دانتی پر آ گئے۔ سامنے چار پانچ آدمی بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔ جیسے مٹی کے ڈھیر پر جگنو چمک رہے ہوں۔ وہ لوگ کھڑے ہو گئے۔ لانبی لانبی بے ڈھنگی کشتیاں گھسیٹ کر کنارے لائی گئیں۔ ندی سے نکل کر ہم لوگ باغ میں آ گئے۔ ٹارچ کی روشنیوں نے ماموں کو سلام کیا۔ دو نوں ہاتھی کھینچے کھڑے تھے۔ ہاتھی بٹھلائے گئے۔ کارواں چل پڑا۔ ہاتھی کھیتوں کی مینڈوں پر سنبھل سنبھل کر مگر تیز چل رہے تھے۔ پیچھے کوئی آدمی سایوں کی طرح اڑتے چلے آ رہے تھے۔ ماموں کا ہاتھی بہت آگے نکل گیا تھا۔ گویا چھوٹا سا پہاڑ چل رہا ہو۔ ایک باغ میں ہاتھی رک گیا۔ داروغہ جی چوکیدار کے صافے پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے ایک مسلح گارڈ تھا۔ وہ ماموں سے بات کر رہے تھے۔ کہ ایک سائیکل باغ میں داخل ہوئی۔ ساتھ ہی تلک سنگھ بول اٹھا۔

"سرکار چھدو آئے ہیں"

"چھدو کیا خبر ہے؟"

"سرکار، رام لال پانڑے کے بھتیجے کا مونڈن ہے آج۔ ناچ جرروں پر ہو رہا ہے۔ مجمع میں آدمی پہنچ گئے ہیں۔ چار بندوقیں دھری ہیں۔ گل درگا جی وردی اتار دیں کا ہے سے کہ اور لوگ کچھ سنکے بیٹھے ہیں۔"

ماموں چھدو اور داروغہ جی سے بڑی دیر تک باتیں کیا کیے۔ پھر ہاتھی بٹھلائے گئے۔ آدمی کئی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ داروغہ جی ایک کمبل اوڑھ کر ماموں کے ہاتھی کے پیچھے ہو لیے۔

ایک شامیانے میں کئی گیسیں جل رہی تھیں۔ جن کی تیز روشنی میں ایک "پتریا" بہت سا پوڈر تھوپے بھاری بھاری کپڑے پہنے کولھے مٹکا رہی تھی اور "سیاں کا آوا سندیسہ" کے بول دہرا رہی تھی۔ شامیانے کے اندر اور دور تک باہر سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں لالٹینیں اور مشعلیں چمک رہی تھیں۔ بھوسے گوبر اور بہت سے آدمیوں کی بدبو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ ماموں بہت سکون سے روپے برسا رہے تھے۔ چھدو اور تلک سنگھ ان کے گاؤ کے پیچھے رائفل لیے بیٹھے تھے۔ ان کے داہنے ہاتھ پر رام لال پانڑے بہت ادب سے دوزانو بیٹھا تھا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیر کا سن رسیدہ آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خاطر نہ کر سکا ہو۔ تھوڑی دیر بعد ایک آٹھ دس سال کا لڑکا کرتا پہنے دھوتی باندھے بہت سا تیل چپڑے سکڑتا ہوا آیا اور جھک کر ماموں کے پاؤں چھو لیے۔

"یہ آپ کا بھتیجا ہے سرکار" رام لال پانڑے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"جیتے رہو" ماموں نے ایک دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں مسکرا دیں۔

سامنے بیٹھے ہوئے ایک کالے کالے آدمی نے بڑے زور سے دیا سلائی جلائی۔ چھدو اور تلک سنگھ نے معنی خیز نگاہوں سے ماموں کو دیکھا۔ انھوں نے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبالی۔ دوسری رام لال پانڑے کے منہ کی طرف بڑھا دی۔ قبل اس کے کہ وہ دیا سلائی نکالے ماموں نے دیا سلائی جلا کر اُسے پیش کی۔ اُس نے شعلے پر دونوں ہاتھوں سے ہالہ بنا کر گردن جھکائی۔ پھر اس کی گردن نہ اٹھ سکی۔ چھدو اُچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ تلک سنگھ نے رائفل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ فضا میں کئی فائر گونج گئے۔ موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

"اگر کسی نے جنبش کی تو گولی مار دی جائے گی" داروغہ کمبل پر جھبہ لگائے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس کے سپاہی رائفلیں چھتیائے ہوئے تھے۔ رام لال پانڑے آٹھ دس آدمیوں کے ساتھ رسیوں میں باندھ دیا گیا اور کئی سو آدمیوں کا حلقہ اسے ہاتھیوں کے پیچھے لے چلا۔

لال پور کے ڈانڈے میں قدم رکھتے ہی ایک چوکیدار نے چلا کر کہا۔

"سرکار غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا" داروغہ جی نے پوچھا۔

"منشی جی کو گشت میں کسی نے گولی مار دی۔"

لوگ اپنے اپنے کوٹھوں پر کھڑے تھے۔ ایک کہرام مچی تھی۔ کتنے بھونک رہے تھے۔ چوکی پر بھیڑ لگی تھی۔ چارپائی پر جوان منشی کی لاش پڑی تھی۔ زمین خون سے تر تھی۔

گڑھی کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اجے اسٹر پہنے کندھے پر ریوالور ڈالے ٹہل رہا تھا۔ بائیں باغ والا پنڈت برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ماموں کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ستون سے لگی ہوئی بندوق اٹھائی اور البٹی سے ایک دعا ہوا کارتوس نکال کر ماموں کو پکڑا دیا۔ ماموں اس کے بازو پر تھپکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ میز پر ہرے گلوب کا لیمپ جل رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ اپیا آگئیں۔

"تمھیں لال پور میں نیند نہیں آتی کہ ہمیشہ دیر سے سوتے ہو۔"

"مجھے چاند ستاروں سے بہت محبت ہے۔ اگر سارا جہان سو جائے تو یہ بے چاری رات کیسے دیکھ کریجئے۔ آپ ٹھیک سے بیٹھ جایئے۔ مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنا ہیں" وہ چاندی کے پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئیں۔ میں نے ان کی طرف لحاف کھسکا دیا۔ وہ سبز روشنی میں جوان ہو گئی تھیں۔

"اپیا"

ان کی سوئی ہوئی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ جن میں ایک کنوارا خواب انگڑائیاں لے رہا تھا۔

"زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی۔ کہ چند کھوئی یادوں کے ہاتھ بیچ دی جائے۔ آپ کب تک یونہی بائیں باغ کے گوشوں میں رویا کیجئے گا۔ پرچھائیوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے آپ نڈھال ہو گئی ہیں اگر آپ گر پڑیں تو خواب زاروں کا کوئی باسی آپ کو اٹھانے نہ آئے گا۔"

انھوں نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"تم کب جا رہے ہو" ناکام محبت کی کہانیوں کا سارا درد ان کی آواز میں تڑپ رہا تھا۔

"یہ رات جو آدھی گذر چکی ہے میرے حافظے میں ہمیشہ بیدار رہے گی۔ ایک دن کالے گلاب کی طرح مرجھا جائے لیکن مرے گی نہیں۔ امی ہر سال لکھنؤ جا جا کر پائجاموں پر کارچوب کڑھواتی رہیں گی۔ ابو ہر سال چاندی کے برتن خریدا کریں گے۔ لیکن پھوپیوں میں لدی موٹر لال پور کے بدنصیب پھاٹک پر کبھی نہ رکے گی۔ سہ منزلے کی سنسان شبنمیں ہر شام مجھے اپنے سینے سے لگائے یونہی روتی رہے گی۔ میرے کمرے میں ہمیشہ ایک مسہری رہے گی۔ ہمیشہ ایک۔"

"اگر کوئی کانٹوں سے لہو لہان آبلہ پا آپ کے آہنی پھاٹک پر دستک دے تو کیا اس کی باہیں کھل سکیں گی۔ کیا آپ کے کمرے میں کوئی فرش پر نہیں سو سکتا؟"

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم مجھ سے دس برس چھوٹے ہو۔"

میں سب کچھ بھول چکا ہوں اپیا..... اگر آپ کھینچ کھینچ کر میرے سارے ماضی کو گھسیٹ لائیں تو میں اُسے پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔"

میں نے اُن کو روکنا چاہا۔ لیکن آواز ہونٹوں میں دب کر رہ گئی۔ دروازے کی ہلتی ہوئی زنجیر اُن کے فراق میں رو رہی تھی۔

اپیا اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ میری گردن پر رکھے مجھے جگا رہی تھیں۔ سارے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

"سب لوگ جاگ چکے ہیں... ہم نہا چکی ہیں" وہ میرے سلام کا جواب دے کر بولیں۔

صحن میں مرغ ذبح کئے جا رہے تھے۔ ..... تول رہی تھی۔ مومانی تخت پر بیٹھی احکام صادر کر رہی تھیں۔ ایک عورت بہت سا پیاز لیے بیٹھی کتر رہی تھی۔ ڈیوڑھی میں ایک کالا کالا موٹا سا آدمی دودھ کا مٹکا لیے کھڑا تھا۔ اپیا مجھے پان دے کر باورچی خانے چلی گئیں۔ باہر لان میں پھولوں کے تختوں کے چوکور قالینوں کے درمیان کرسیاں پڑی تھیں۔ ماموں اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بیٹھے تھے۔ کئی تھانے دار جھکے جھکے لگائے ٹہل پھر رہے تھے۔ بہت سے آدمی رسیوں میں بندھے پھاٹک کی دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ تلک سنگھ دوڑ دوڑ کر گارد کے سپاہیوں کو سگریٹ پلا رہا تھا۔ میرے لیے آدھا کھنچا کھڑا تھا۔ میں پلٹ آیا۔ زینے کے پاس آرام کرسی پر اچھے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک امریکن رسالہ تھا۔ شیمن گہرے کپاسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ مجھے زینے میں دیکھ کر اپیا نے دسترخوان سے اپنے ہاتھ پونچھے اور اوپر آگئیں۔ ان کے ہاتھ ہلدی سے زرد تھے۔

"اپیا آپ کھانا پکا لیتی ہیں" میں نے ان کے دونوں ہاتھ چوم کر چھوڑ دیئے۔

"تم اٹیچی کیا کرو گے لے جا کر..... شام کو آ رہے ہو۔"

"ایسا تو نہیں ہے..... لیکن آتا رہوں گا"

مومانی سے رخصت ہو کر جب میں باہر آیا تو میرے ادھے کے پاس ماموں اور اچھے کھڑے تھے۔

"سپاہی..... بھیا سے اٹیچی لے کر اندر پہنچا دو" ایک آدمی نے میرے ہاتھ سے اٹیچی لے لی اور اچھے مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"تم اپنی جان ایک مکان لے کر تحصیل میں رہو..... یہ ..... اور یہاں درجنوں کمرے خالی پڑے رہیں..... رہا کھانا تو تم مہینے پر مجھ سے حساب کر لینا۔"

"نہیں نہیں یہ میرا مطلب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے ... تحصیل کا راستہ آدھ گھنٹے کا ہے۔ اتنی سواریاں موجود ہیں۔ رہ گئی اجازت تو تمھاری ماں کو ابھی لکھتا ہوں۔"

تحصیل میں اسٹیشن کے پاس ہی میرا وہ مکان تھا جس میں مجھ سے پہلے بھی نائب تحصیلدار رہا کرتے تھے۔ وسیع و عریض احاطے کا چھوٹا سا مکان۔ اس میں میرا مختصر سا سامان تھا۔ میں نے کافی غور کے بعد یہ طے کیا کہ میں فی الحال لال پور ہی میں رہوں لیکن اس مکان پر بھی قبضہ کئے رہوں اور کرایہ دیتا رہوں۔ یہ بات کچھ حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی کہ میں لال پور میں رہوں اور روزانہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھوں لیکن اس کے ساتھ میں کوئی ایسی بداخلاقی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے ماموں متاثر ہوں اور ایبا کی دوسری سنگین ہو جائے۔ کام ختم کر کے میں نے نگاہ اٹھائی تو تین بج رہے تھے۔ ایبا سے بچھڑے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہوئے تھے لیکن دل کو وہ بیقراری تھی۔ جیسے چند سال گذر چکے ہوں۔ میں دفتر کی گھڑی پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہا۔ چار بجتے بجتے ایک صدی گذر گئی۔

ہومانی کی استقبالیہ مسکراہٹ کو پیچھے چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آگیا۔ ہم لوگ چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ اور راتے کا انتظار کرتے رہے ...... رات چڑھتے چڑھتے شال میں لپٹی ہوئی ایبا آئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے شمیم انگیٹھی اٹھائے ہوئے تھی۔ میں نے ہاتھ سے کتاب رکھ دی۔ اسے ابھی تک نہیں آیا تھا۔ لیکن ایبا کے چہرے پر کوئی تردد نہ تھا۔ ایبا نے مسہری کے قریب کرسی گھسیٹ لی۔ لیکن میں نے ان کو مسہری پر بٹھا لیا۔

"کچھ بولو۔ یہ کیا ماتمی صورت بنائے لیٹے ہو" وہ اپنی گود میں رکھی ہوئی چوٹیاں کھول رہی تھیں۔ اور سیاہ ریشم کی لچھیاں سلجھا رہی تھیں۔ میں دیکھتا رہا۔ پھر وہ کھڑی ہو گئیں۔ جیسے کسی خیال نے ان کو ڈس لیا ہو۔ شال مسہری پر رہ گئی تھی۔ ان کے بال آدھی آدھی رات کی طرح ان کے دونوں شانوں پر پڑے تھے۔

"آپ اس طرح بال نہ کھولا کیجئے" میں ان کی چوٹی گوندھنے لگا۔ الٹی سیدھی گرہیں لگ رہی تھیں۔ وہ بُت بنی کھڑی تھیں۔

"ایبا" انھوں نے اپنے ابرو ذرا سے ہلا دیئے۔

"آپ ساری عمر کھڑی رہئے۔ میں ساری عمر آپ کے بال سنوارتا رہوں۔" ان کے سفید سفید ہاتھوں نے میرے ہاتھ پکڑ لیے آنکھوں کی اداسیاں لوٹ آئیں۔ رخساروں کی سرمئی شکنیں نمایاں ہو گئیں۔ میرے ہاتھ چھوڑ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہتھیلیوں میں چہرہ رکھ کر فرش کا قالین گھورنے لگیں۔ میں ان کی پشت پر کھڑا ہو کر پھر بال سنوارنے لگا۔

"تم کیا چاہتے ہو اختر" وہ بغیر نظریں اٹھائے پوچھ رہی تھیں۔ میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ میں نے جھک کے ان کے دوش پہ منہ رکھ دیا۔ جو آدھی رات میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہیں۔ پھر بجلی کی طرح اٹھیں۔ اور اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں بڑی دیر تک صحن میں ٹہلتا رہا۔ پھر پائیں باغ میں اتر گیا۔ امرودوں کا کنج پار کر کے جھونپڑے کی طرف چلا ہی تھا۔ کہ کتوں نے حراست میں لے لیا۔ میں ان کی خوشامد میں کرتا ہوا آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا ———

——— کہ جھونپڑے سے بھنچی بھنچی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے آگے بڑھ کر جھانکا۔ یہاں پر ایک عورت اوندھی پڑی تھی اور سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کے سر کے پاس اسے کھڑا تھا۔ اگر کسی کو معلوم ہوا کہ تم یہاں لائی گئی ہو تو یاد رکھو کہ پرشادی کے گھر کی دیواریں بہت نیچی ہیں۔ تمھارا عاشق منشی جہنم پہنچ چکا ہے۔ اور سارا لال پور تم پر جان چھڑکتا ہے ..... سمجھیں تم؟"

آج بھی اسے غائب تھا۔ اپیا نیچے تھیں۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ بغیر کسی ارادے کے ماموں کے کمرے کے روشندان میں منہ رکھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ماموں مسہری کے تکیے سے پشت لگائے نیم دراز تھے۔ مومانی ان کی پائنتی بیٹھی تھیں۔ ہرے کی رضائی کی فیروزی زمین میں سنہری بوٹیاں جگمگا رہی تھیں۔ انگیٹھی کا کوئلہ چٹخ چٹخ کر پھلجڑیاں چھوڑ رہا تھا۔

"اگر میں نے جائداد پر قرض لے لیا ہوتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مگر جو بات تم عورتوں کے مشورے سے کی گئی۔ اس میں ناک کٹی۔"

"بے تو اپنی کرتوت بگڑے تو عورتوں کے سر جائے۔ اچھا تماشہ ہے۔ میں کوئی علم غیب پڑھی تھی۔ کس کے فرشتوں کو خبر تھی کہ ایک دن پورا تعلقہ نکل جائے گا۔ میں نے سوچا کہ جائداد کیوں زیر بار ہو۔"

"اچھا دماغ نہ کھاؤ.... کوئی عقل کی بات تو کرنے سے رہیں جھک جھک شروع کر دی۔ میں کہتا ہوں کہ پندرہ دن کے اندر بیالیس ہزار کہاں سے لاؤں جو سفید سر کو سیاہی سے بچاؤں۔"

"میں کیا بتاؤں.... اٹھائیس ہزار زیوروں والا رکھا ہے.... ہزار دو ہزار اور ہو گا.... اچھا یہ باغات اگر نکال دیئے جائیں"

"تو کیا زیبی کو ساری عمر بٹھائے رکھو گی"

"او تو جہاں اتنے دن ٹلے ہیں تھوڑے دن اور میری بچی بیٹھی رہے گی۔ شاید اللہ اور اس کا رسولؐ کوئی صورت ہی نکال دے۔"

"اچھا.... جاؤ.... صبح منشی کو بلا کر میروں اور باغات کے متعلق بات کروں گا۔"

مومانی ایک ہاتھ میں پائنچے اٹھائے دوسرے سے رضائی کا پلو درست کرتی چلی گئیں۔ میں اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔ اپیا کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ شال کرسی پر پڑی تھی۔ وہ کھڑکی میں سر رکھے کھڑی تھیں۔ کھلے ہوئے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ میں نے ان کے ریشمی شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"لال پور کے زخم کریدتے کریدتے تھیں مجھ سے گھن تو نہیں آنے لگے گی۔" میرا جی چاہا کہ اپنی آنکھوں کے سارے آنسو ان کے دامن میں انڈیل دوں۔"

"اپیا یہ کیسا قرض ہے جس کے متعلق ماموں مومانی سے باتیں کر رہے تھے۔" میں نے بات کرنے کے لیے بات کی۔

"قرض کے بھی نام ہوتے ہیں.... بس قرض ہے۔" میں نے ان کی آشفتگی محسوس کر لی۔ میں نے ان کے شانے پکڑ کر اپنی طرف گھما لیا۔ لال آنکھوں سے برس ہا برس کی نیندوں کا خون ٹپک رہا تھا۔

"اپیا آپ سو جائیے۔ چلئے میں آپ کو کمرے تک پہنچا دوں" وہ مجھ سے لگی لگی چل رہی تھیں۔ مکمل اندھیرا اور سناٹا تھا۔ ان کے کمرے کے لیمپ کی بتی تیز کر کے میں نے مسہری پر لٹا دیا۔ تکیے کے دونوں طرف انگریزی کے المناک ناول پڑے تھے۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ میں باہر نکل آیا۔ دروازے کی تو زنجیر لگنے کی آواز سن کر میں چلا آیا۔ سرہانے سگریٹ کی ڈبیا تو تھی۔ لیکن دیا سلائی غائب تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اپیا کی میز پر دیا سلائی رکھی تھی۔ لیکن ان کو زحمت دینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں صحن میں ٹہلتا رہا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا ڈیوڑھی کی چھت پر آ گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھول رہا ہو۔ میں نے سوچا اچھے آ گیا۔ اس کے پر اسرار تشکار کا خیال آتے ہی میں اندرونی زینے کی طرف چلا آیا۔ چپکے چپکے سیڑھیاں اترنے لگا۔ آخری سیڑھی پر آتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ وہ اچھے نہیں تھا۔ کوئی تنومند بھائی کرتے پر مرزئی پہنے چاروں طرف دیکھتا ہوا دالان میں چلا گیا۔ کمرے کے روشندان لال لال روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس نے دروازے پر چٹکی دی۔

اور دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ میں تصویر کی طرح زینے میں نصب تھا۔ شوخ نسیمؔ میرے خیالوں کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن یہ کمرہ تو ممانی کا ہے۔ شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ہوئے دالان اور اس کے پیچھے لق و دق کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کی کئی جھریاں روشن تھیں۔ میں نے تیزی سے صحن پار کیا اور ایک کھڑکی کی دراز کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ممانی مسہری پر لیٹی تھیں۔ جس کے منقش تکئے کے قلب میں بیضاوی آئینہ جڑا تھا۔ مسہری سے لگی چوکی پر چاندی کا پاندان رکھا تھا۔ چوکی کے قالین پر بیٹھا ہوا وہ آدمی تولیہ سے اپنے پاؤں صاف کر رہا تھا۔ ایک انگڑائی لے کر اس نے اپنی مرزئی اتار دی اور بڑے پھوہڑ پن سے ممانی کا لحاف الٹ دیا۔ ممانی کی آنکھوں میں شمعیں جل رہی تھیں۔ اور لو سے اندھیرا ہم آغوش ہو گیا تھا۔

صبح میں غسل خانے میں کھڑا برش کر رہا تھا۔ روشندان سے گڑھی کے داہنے بازو کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں میرے سامنے تھیں۔ نسیمؔ کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔ دراز قد اور سنہرے رنگ کی تندرست عورت۔ وہ معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ شاید حسن بانو یہی تھی۔ اچھے اس کی آمد کے متعلق سلیمن سے کئی بار پوچھ چکا تھا۔ کھانے کے کمرے میں جاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ نسیمؔ حسن بانو سے میری طرف انگلی اٹھا اٹھا کر سرگوشیاں کر رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں بے ساختہ پن اور غرور تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ نسیمؔ نے نظر جھکا لی لیکن وہ اسی بے باکی سے دیکھتی رہی۔ ممانی کا چہرہ ویسا ہی مقدس اور نیکیوں کا گہوارہ تھا۔ بڑا سا طوق ان کی شال میں جگمگا رہا تھا۔ اپیا پھولی پھولی بیٹھی تھیں۔ اچھے ان کو چھیڑے جا رہا تھا۔ ممانی کی نگاہیں آج مجھے مخمور معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ماموں کے پٹوں میں سفید بال ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا۔ آج ان کے بالوں کی ہر کھچڑی لٹ مجھے سفید نظر آ رہی تھی۔ چائے کے برتن اٹھنے لگے۔

"بی بی راجو بڑی دیر سے کھڑا ہے۔"

"ہوں .... اچھا" وہ خواب دیکھتے دیکھتے چونک پڑیں۔ اپنا فرشی پائجامہ سنبھالتی اٹھ گئیں۔ ماموں اور اپیا پہلے ہی جا چکے تھے۔ حسن بانو اچھے کی کرسی کے قریب کھڑی پلیٹیں اٹھا اٹھا کر کشتی میں رکھ رہی تھی۔ اچھے نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"دیکھئے اختر بھائی مکھن کی بنی ہے۔" حسن بانو نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا اور ہاتھ جھٹک دیا۔ اچھے نے اٹھ کر اس کے گالوں میں بکوٹے بھر لیے۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

"یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے آج" میں نے ناگواری سے کہا۔

"یہ ناشتہ ہے ان کا اختر بھائی ورنہ اب تک نکل گئی ہوتیں۔ ایک نمبر کی آوارہ ہیں سالی۔" اچھے سگریٹ لینے اوپر چلا گیا۔ صحنچی میں اپیا پان بنا رہی تھیں۔ چمکیلی دھوپ میں وہ کندن کے مجسمے کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ میں انھیں کے پاس بیٹھ گیا۔ ڈیوڑھی میں راجو کھڑا تھا۔ اس کی رانوں کی مچھلیاں نظر آ رہی تھیں۔ ممانی اسے سمجھا سمجھا کر روپے دے رہی تھیں۔

"پان"

اپیا کا ہاتھ پان لیے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا دیا۔

"تم سب کچھ اتنے غور سے دیکھتے ہو کہ میں ڈر جاتی ہوں"

"کیوں ڈر جاتی ہیں آپ" وہ لبوں تک آئی ہوئی بات پی گئیں۔ پان کی پیک ان کی مرمریں گردن میں یاقوتی لکیر بناتی نیلے گریبان میں ڈوب گئی۔ مگر نگاہوں سے تشویش برستی رہی۔

وہ اتوار کی صبح تھی۔ میں دیر سے اٹھ کر نیچے آیا تو دالان کی دیوار کے آئینے میں اچھے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کر رہا تھا۔ میں بھی ادھر ہی ہو لیا۔ باورچی خانے کی دہلیز پر حسن بانو بیٹھی منہ دھو رہی تھی۔ اس کی پنڈلیوں کے سنہرے سنہرے روئیں چمک رہے تھے۔ نسیمن کتوں کے پیالے میں دودھ انڈیل رہی تھی۔

"جلدی سے چائے پی لیجئے اختر بھائی۔"

"کیوں ... خیریت"

"چلئے آپ کو ٹہلا لاؤں"

"جی آپ ٹہل آئیے۔ میں کمرے میں بہت اطمینان سے ٹہل لیتا ہوں۔"

"یعنی واقعی آپ سنجیدہ ہیں"

"بالکل" وہ شانوں پر امریکن جیکٹ ڈالتا کتوں کے لیے سیٹی بجاتا نکل گیا۔ اپیا بڑی نفاست سے پٹرول سے مخملیں جوتوں کے دھبے صاف کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی جوتے فرش پر ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے ان کے دونوں نرم نرم ہاتھ پکڑ لیے اور دیر تک فضا میں لہراتا رہا۔ ان کا چہرہ دہکنے لگا لیکن خدوخال سے سنجیدگی نے اپنا مصلےٰ نہ بڑھایا۔

"ممانی کے کیا حال ہیں" میں نے یونہی پوچھ لیا۔ مگر اپیا بالکل سفید ہو گئیں ان کی آنکھوں میں گہری سوچ کا کاجل پھیل گیا۔ انھوں نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

"میں خود تم سے بتلانے والی تھی" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہیں۔

"امی میری امی نہیں ہیں"

"جی"

"ہاں اچھے کے پیدا ہوتے ہی میری امی مر گئی تھیں۔ اچھے کو دودھ پلانے کے لیے ایک میراثن نوکر رکھی گئی تھی جس کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن بھی رہتی تھی۔ تھوڑے دن بعد وہ چھوٹی بہن ہم لوگوں کی امی ہو گئی۔ لال پیر اس کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ میری امی کا سارا زیور اور روپیہ جو میری خالہ اور امی ہیں تول تول کر بٹا تھا اس کے خاندان میں ہضم ہو گیا۔ ابو کے پاس صرف چاندی کا کئی لاکھ روپیہ تھا جو تہ خانوں سے غائب ہو گیا۔ مہینوں پولیس پڑی رہی۔ جب سراغ لگنے لگا تو امی نے ایسے ایسے فیل کئے کہ ابو کو تفتیش اٹھا لینا پڑی۔ آنسو ٹوٹ کر ان کے گالوں پر چمک اٹھے تھے۔

اب کیا رہ گیا ہے اس گڑھی میں۔ ہاتھی گھوڑوں کے زیور تک ان کے سگوں کے کلیجے میں گھس گئے۔ خدا کی قسم اختر زمینداری فیل ہونے سے قبل ہر سال اس کے زیور بنتے تھے۔ اور دوسرے سال غائب ہو جاتے تھے۔ ابو نشے میں بدمست پڑے رہتے اور یہ دونوں ہاتھوں سے گڑھی لٹاتی رہتی۔ اچھے کی عیاشیاں اسی کے کرتوتوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ جوان ہونے سے پہلے جوان کر دیا گیا۔ پندرہ سولہ سال کا لڑکا جوان جوان عورتوں کے ساتھ سلایا جائے گا تو کیا حشر ہو گا۔ میری زندگی برباد کر دی اس عورت نے۔ مجھے حیرت ہے کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں۔ مجھے دق کیوں نہ ہو گئی۔ اچھے کے اب آنکھیں ہو گئی ہیں۔ وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ وہ بہت کچھ سوچتا ہے لیکن کچھ کر نہیں پاتا۔ تم یقین مانو اختر کہ میں نے کتنی ہی بار ابو کا ریوالور چرا کر رکھ لیا کہ سوتے وقت ایک کارتوس خالی کر لوں گی لیکن ہمیشہ یہ سوچ کر رہ گئی کہ میری موت پر

یہ ایسے ایسے افسانے گھڑے گی کہ سننے والوں سے سنا نہ جائے گا۔ ابو کے منہ پر اور سیاہی لگے گی۔ تم آج ان کے کمرے میں بیٹھ جاؤ۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرو۔ بیچ میں دو ایک جملے ان کی جوانی کے متعلق بھی کہہ دو۔ تمہیں دبوچ لیں گی۔ خدا کی قسم تمہیں دبوچ لیں گی۔" ان کا چہرہ آگ ہو گیا تھا۔ وہ جذبات میں بہتی چلی جا رہی تھیں کہ صحن میں قدموں کی چاپ سن کر وہ چونکیں۔ اپنا آنچل اور بال درست کرنے لگیں۔ دروازے کے قریب آکر حسن بانو ٹھٹک گئی۔ وہ رعنائی اتار آئی تھی۔ جمپر پلو راس کے بھرپور اور تنومند جسم پر شمیش کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ گلے میں دوپٹہ چاندی کی ہنسلی بنا ہوا تھا۔

"آجاؤ"

"بیٹا صاحب کے نئی پرانا جمپر ہو تو" وہ شرمائی ہوئی سی کھڑی تھی اور انگوٹھے سے قالین پر نقش بنا رہی تھی۔

"یہ صندوق نکالو" اپیا نے مسہری کے نیچے اشارہ کیا۔ اس نے صندوق نکال کر بیچ کی کا قالین الٹا اور رکھ دیا۔ اپیا اسے کھول کر دیکھتی رہیں۔

"دیکھو ادھر مسہری کے نیچے کوئی جمپر پڑا ہے" حسن بانو نے ایک بار مجھے دیکھا اور مسہری کے نیچے گھس گئی۔ جب باہر نکلی اور کھڑی ہو کر جمپر اپیا کے ہاتھ میں پکڑایا تو اس کے پائجامے کے نیفے سے ایک سگریٹ گر پڑی۔ اپیا صندوق پر جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتا پایا تو پریشان ہو گئی۔ میں نے ہوشیاری سے رازداری برتتے ہوئے اُسے آنکھ کا اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹوں کی گلابی کمانیں ذرا کھنچ گئیں۔ اس نے اپیا کو کنکھیوں سے دیکھا اور سگریٹ اٹھا لی سویٹر کے گریبان میں رکھ لی۔ مجھے اس کے رخساروں پر اچتے کے بکوٹوں کے نشان نظر آنے لگے۔

ماموں میر صاحب کے ساتھ باغات دیکھنے گئے تھے۔ اپیا اپنے کمرے میں کپڑوں کے بکس کھولے بیٹھی تھیں۔ مومانی صحن میں نواڑی پلنگڑی پر بیٹھی تھیں۔ نسیمن ان کے تھکری کر رہی تھی۔ گلابی ململ کے جمپر میں ان کا بدن پھنسا ہوا تھا۔ میں کنوؤں کے پاس بیٹھا ہوا اُن کی ریشمی جلد پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کہ باہر سے تند و تیز آوازیں آنے لگیں۔

"حسن بانو دیکھو یہ کیا اودھم مچا ہوا ہے"

"بی بی راجو، ملک سنگھ لڑ رہے ہیں"

"بلاؤ" ان کی آواز میں اچانک شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ انھوں نے اشارے سے نسیمن کو الگ ہٹا دیا وہ تھکری سے کر پیچھے کھڑی ہو گئی۔ ملک سنگھ نے ڈیوڑھی پر آکر آواز دی کہ سرکار کا حکم ہے؛

"حکم کے بچے تو نے راجو کو کیوں مارا"

"سرکار ہم تو ابھر دودھ لیا تو ٹھاکر ہم کا مار بھگائے دیہیں" راجو نے فریاد کی۔

"سرکار مالک کا حکم ہے کہ جتنا دودھ بچے حلوائی کو تول دیا جائے۔ ای سر فرد روزدودھ چرائے لیت رہیں آج ہم پکڑن تو ای لاٹھی اٹھائے لیہن تو سرکار دوئی ٹھپر جڑ در مارن"

"تو نے حرامزادے مارا کیوں۔ تو کون ہوتا ہے مارنے والا۔ ہمارا ہی نمک کھائے اور ہمیں سے نمک حرامی"

"سرکار نمک حرامی کیسی" اس کی آواز میں حیرت تھی۔

"دور ہو جا حرامزادے میری نگاہوں کے سامنے سے۔ زبان چلاتا ہے۔" وہ پلنگ سے زمین پہ آ گئی تھیں۔
"حسن بانو..... اس کا حساب صاف کر دے اور کہہ دے کہ ابھی اسی وقت گھر بھی چھوڑ دے۔"

راجو بڑے سکون سے یہ احکام سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ ہی خمانیت تھی، نہ ہی اطمینان تھا۔ جو میں نے ممانی کے کمرے میں پایا تھا جب وہ قالین لگی چوکی پہ تولیے سے پاؤں صاف کر رہا تھا۔

ماموں کا انتظار کر کے چائے لگا دی گئی۔ ممانی، اپیا اور ہم سب کے سب سوگوار بیٹھے تھے۔ اپیا میری پیالی میں شکر ڈال رہی تھیں کہ نسیمن اندر آئی۔ بندوق، اور کارتوسوں کی پیٹی لادے ہوئے اور لوٹ دہانے ہوئے۔

"ٹھاکر چلے گئے۔ روپیہ واپس کر دیا۔ کہا ہے اپنی بندوق سنبھال لیں"

"وہ چلا گیا حرامزادہ"

"ہاں" اس کی آواز میں ٹوٹتے تاروں کا درد تھا۔ اس کے بھورے بھورے تیکھے خدوخال جیسے اجڑ گئے تھے۔

اپیا نے اُسے دیکھا اور دوسری طرف منہ گھما لیا۔ سارا ناشتہ واپس چلا گیا۔ ہم لوگ خالی چائے پی کر اٹھ بیٹھے۔ صحن میں کتے ہنگامہ برپا کر رہے تھے۔

"یہ کمینے اتنا شور کیوں مچائے ہیں"

"شام ہو گئی ہے کھولے نہیں گئے ہیں" اپیا کے علاوہ کون بولتا۔

"نسیمن کھول دے حرامزادوں کو" لیکن کتوں کے تیور بگڑے ہوئے تھے وہ سہم کر کھڑی ہو گئی۔

"بندھا رہنے دے حرامزادوں کو"

دوسرا حکم ابھی فضا میں گونج رہا تھا کہ دروازے پہ ابتے نظر آیا۔ پتلون کی جیب سے ریوالور نکال کر اس نے حسن بانو کو پکڑا دیا۔ وہ اسے دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے زینے میں غروب ہو گئی۔ ابتے گھر کے منہ لٹکتے ماحول کا آنکھیں پھاڑے تجزیہ کر رہا تھا۔ کتے بھونکے جا رہے تھے۔

"یہ کیا قصہ ہے" اُس نے جیکٹ کی زپ کھولتے ہوئے اپیا سے پوچھا۔

"کھلنا چاہتے ہیں" اپیا نے الفاظ اُگل دیئے۔

"تو کھول دیئے جائیں..... نسیمن بلاؤ تلک سنگھ کو"

"تلک سنگھ گیا جہنم میں۔ اس کا کوئی نام لیتا ہے تو میرے آگ لگ جاتی ہے"

"کیا۔ بات کیا ہے" وہ فکرمند سا ممانی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس حرامزادے نے آج راجو کو اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ میں نے پوچھا تو زبان لڑانے لگا۔ میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا نمک حرام کو"

"تلک سنگھ کو نکال دیا آپ نے"

"ہاں ہاں..... نکال دیا..... رجسٹری کراؤ گے"

"آپ نے بہت برا کیا امی.... آپ نے بہت برا کیا"

"تو تم بھی اپنا بوریا بستر سنبھال لو.... یا میرے جھونٹے پکڑ کر گڑھی کے باہر نکال دو" وہ سچ مچ رونے لگیں۔

"خون پلا پلا کے پالا.... ناز نخرے سہے۔ اب بھیا جوان ہوئے ہیں تو نام نہ رکھیں گے اور کیا کریں گے۔ اپنے پیٹ کا ہوتا تو صورت پر نظر نہ ڈالتی۔" آنسوؤں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ اپیا نے بڑی محبت سے اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ اچھے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں صحن میں ٹہلتا رہا۔ پھر مومانی مغرب کی نماز کی تیاری کرنے لگیں۔

اچھے جوتے اور پتلون پہنے مسہری پر اوندھا پڑا تھا۔ حسن بانو اس کے پاس بیٹھی سر سہلا رہی تھی۔ میں دروازے میں کھڑا رہا کہ وہ ہوشیار ہو سے مگر اس کی گم سم نگاہیں بیدار نہ ہوئیں۔ میں اندر چلا گیا۔ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اچھے اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں کے لال ڈورے نمایاں اور دبیز ہو گئے تھے۔ اس نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں دبالی اور دوسری میری طرف بڑھا دی۔ حسن بانو نے دیا سلائی جلا کر اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھائی۔ "ان کو بھی جلاؤ" وہ اپنے لہجے پر شوخی کی قلعی کر رہا تھا۔ ایک سگریٹ نکال کر اس نے بڑے پیار سے حسن بانو کے ہونٹوں میں پھنسا دی۔ لیکن وہ مٹھی میں دبائے کھڑی رہی۔

"اختر بھائی آج حسن بانو ناچے گی.... ناچے گی نا؟"

"کیسے ناچیں.... میاں گھر پر ہیں اور بی بی اتنی خفا ہیں"

"میں سب انتظام کر لوں گا.... ایں.... تم نیچے جاؤ اور کسی سپاہی سے کہو کہ میر صاحب کے یہاں سے ریڈیو کی بیٹری لے آئے"

"اے رب العالمین اپنے حبیب کے صدقے میں مجھے موت دیدے یا اس چڑیل سے میرا پیچھا چھڑا!"

ماموں ہاتھ اٹھائے قبلے کی طرف منہ کئے دعا مانگ رہے تھے۔

"وہ پاسی چمار تو تھا نہیں جو دھاڑ لوں میراثنوں کی گالیاں سن لیتا۔ میں پوندوں جوڑتا ہوں یہ مٹکوں ڈھلکاتی ہے.... زینی کی ماں بھیک مانگے نہ ملے گی جو بھیک مل جائے۔ میرا گھر تو تم نے برباد ہی کیا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کا حبیب چاہے گا تو قبر میں کیڑے پڑیں گے۔"

گڑھی پر جان لیوا سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی کتے بھونک کر زندگی کا ثبوت دے دیتے۔ اپیا صحنچی کی دہلیز پر سہمی کھڑی تھیں۔

لالٹین کی روشنی میں وہ حسب دستور حسین اور کمسن ہو گئی تھیں۔ مومانی تخت پر بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں۔

کھانے کی رسم ادا کر کے ہم لوگ اوپر آ گئے۔ اپیا کھڑکی پر سر رکھے کھڑی تھیں۔ وقت کے خنجر کی اپنی دھار پر زندگی برہنہ پا رواں دواں تھی۔ ہر لمحہ موت سے رقابت کا دم بھرتا گزر رہا تھا.... اور اچھے غائب تھا۔

اپیا کے کمرے میں ریڈیو تیز آواز میں بج رہا تھا۔ وہ تکیوں میں منہ چھپائے بستر پر پڑی تھیں۔ ماموں اندر سے بستر منگوا کر باہر سونے کا انتظام کر رہے تھے۔ مومانی اٹواٹی کھٹواٹی لیے کمرہ اندر سے بند کئے پڑی تھیں۔ نسیمن اور حسن بانو اچھے کے کمرے کا فرنیچر نکال کر باہر رکھ رہی تھیں۔ میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ اپیا نے ذرا سی گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور گردن پھر ڈال دی۔

"صاحبزادے ابھی نہیں آئے؟"

"اچھے؟.... ابھی نہیں۔"

کوئی بارہ بجے میرے سردی لگی میں اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا۔ اپیا کی آنکھ لگ چکی تھی۔ میں نے لیمپ کی بتی مدھم کی

ے دروازہ بھیڑ کر نکل آیا۔ اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوا جیسے بائیں باغ کے زینے پہ کئی آدمی چڑھ رہے ہیں۔

آگے آگے اچھے تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی ایک عورت کو لادے ہوئے چلا آرہا تھا۔ اچھے میرے تاریک کمرے اچلا گیا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد اٹھا۔ تو گھنگھروؤں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اپیا رضائی میں لپٹی کھڑی تھیں۔

"ذرا اس بدمعاش کے کرتوت دیکھو.... حسن بانو تو اس کی داشتہ تھی ہی۔ میں سمجھی تھی کہ ناچ دیکھنا چاہتا تو بجائے رنڈیوں پر جانے کے گھر ہی میں دیکھ لے۔ لیکن آج تو اس کے دیدے کا پانی مر گیا ہے۔" وہ کانپتی ہوئی میرا ہاتھ پکڑ کر اچھے کے ڑکی پر لے گئیں۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ انگیٹھیوں میں کوئلہ دہک رہا تھا۔ حسن بانو سرخ ساری اور جمپر پہنے دودھیا ٹخنوں ٹے گھنگھرو باندھے ناچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل اور گالوں اور باہوں پر گلابی پاؤڈر چمک رہا تھا۔ وہ بیچ بیچ ناچ چے گاؤ تکیے پر کہنی ٹیکے ایک خبیث عیاش کی طرح نیم دراز تھا۔ اس کے سامنے شراب کی بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ اس کی نیلی سے نشہ ٹپک رہا تھا۔ اس کے بائیں طرف ایک عورت بیٹھی تھی جس کے بالوں میں مینڈھیاں گوندھی تھیں۔ اس کی چوڑی چوڑی بدن ور بھرا تھا۔ وہ لال کرتی پر کالا لہنگا پہنے تھی۔ ہاتھوں میں لاکھ کی چوڑیاں اور باہوں میں چاندی کی لڑیاں تھیں۔ اور پاؤں کے گھوٹوں میں چھلّے۔ اچھے نے جب شراب کا گلاس اس کے منہ سے لگایا تو دانتوں کی مسّی چمک اٹھی۔ شراب بہہ کر اس کی گردن وہ برے برے منہ بناتی رہی۔ اچھے اُسے زبردستی پلاتا رہا۔ اس کی سفید سفید کلائیاں پکڑ کر اچھے نے اپنی گود میں گھسیٹ لیا۔ نے منہ گھما لیا۔ اپیا کے ساتھ ساتھ میں بھی ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ انتہائی برہم تھیں۔

"میں گھر کو چکلہ نہیں بننے دوں گی.... اچھے نے بدمعاش اور آوارہ میراثن کا دودھ پیا ہے نا یہ وہی دودھ ہے جو بے حیائی اسہے۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور حسن بانو ٹھٹھرتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ اپیا اپنے ہاتھوں میں سر رکھے بیٹھی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں دروازے کی زنجیر بند کر کے سو رہا۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ بندوق کے فائر ہو رہے تھے۔ کتے بھونک رہے تھے۔ اور دور سے اچھے کے چیخنے کی آواز میں نے لپک کر زنجیر کھولی۔ لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ اپیا چیخ رہی تھیں۔ صحن سے بہت سے آدمی دوڑتے گذر رہے تھے۔ کے زینے میں قدموں کی دھمک گم ہو گئی۔ نیچے سے ان گنت عورتوں اور مردوں کی چیخیں آرہی تھیں۔ دیر کے بعد کسی سپاہی واز کا جواب دیا۔ اور دروازہ کھولا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا۔ لیمپ اور لالٹین جل رہی تھیں۔ بہت سے آدمی اِدھر اُدھر ے تھے۔ دالان کے تخت پر موہانی کی لاش پڑی تھی۔ ان کے پاس ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ اندر کمرے میں مسہری پر اچھے پڑا تھا۔ ڑیں کھائے تھے۔ اپیا اس کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ سینے پر گولی کا نشان سرخ غار کی طرح منہ کھولے تھا۔ میں سے زرد انگلیاں اپنے ہاتھوں میں لیے اپیا بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ ڈیوڑھی پر میر صاحب پوری لال پور کی آدھی آبادی لیے کھڑے تھے۔

ابھی اندھیرا تھا۔ برجیس پر کمبل اوڑھے اور صافے پر جبہ لگائے لال پور کے انچارج آگئے۔ پردہ کرایا گیا وہ ہانپتے ہوئے اندر اچھے کے پائنتی کھڑے ہو گئے۔ کمبل کے کونے سے آنکھیں پونچھتے رہے۔ چچی پر ماموں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ انھیں استفہامیہ

نگاہوں سے دیکھتے تھے لیکن بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میر صاحب نے گردن اٹھا کر ایک بار صحن میں دیکھا اور ایک سپاہی سے کہا کہ ٹھاکر صاحب بڑرا داں آرہے ہیں ان کو اندر لے آؤ۔ چوڑی دار پائجامے پر سیاہ شیروانی پہنے اور کنٹھی صافہ باندھے ایک بھاری بھرکم آدمی دالان کی صفوں کو چیرتا کمرے کی دہلیز پر آکر دہاڑا۔

"چودھری"

ماموں لڑکھڑا کر کھڑے ہوئے اپنی بوڑھی باہیں پھیلا دیں اور اتنی دردناک چیخ ماری کہ در و دیوار لرز گئے "ہم تو اُجڑ گئے ٹھاکر" کانوں کے کلیجے پھٹ گئے۔ جہاں تک ان کی چیخ کی آواز گئی۔ لوگوں نے آنسو بچھا دیئے۔ دونوں ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈالے روتے رہے۔ چلاتے رہے۔ ہچکیاں تھم گئیں۔ آنسو نہ تھمے۔

دھوپ نکلتے نکلتے پولیس کی موٹروں کے ہارن گونجنے لگے۔ وسیع و عریض احاطہ ان گنت آدمیوں لال لال صافوں اور بھاری بھاری جوتوں سے بھر گیا۔ ٹھاکر صاحب بڑرا داں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ڈاکہ پڑنے کی روداد سناتے رہے اور آنکھیں پونچھتے رہے۔ بارہ کہاروں کی پالکی آئی اور ڈیوڑھی پہ لگا دی گئی۔ بڑرا داں کی ٹھکرائن اندر چلی گئیں۔ ان کی اور اپیا کی چیخیں باہر آتی رہیں۔ میں اٹھ کر دیوان خانے میں چلا گیا جو ایک مقبرے کی طرح سنسان تھا۔

دوپہر چڑھتے چڑھتے موٹریں روانہ ہو گئیں۔ پیپل کے پیڑ کے نیچے ٹھاکر صاحب کی کرسی کے پیروں میں تاک سنگھ بیٹھا تھا اور رہ رہ کر کتھا سنا رہا تھا۔ میر صاحب حیران و پریشان سے ان کے پاس گئے اور کان میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ٹھاکر کرسی سے اٹھے۔ اور اس کمرے کی طرف چلے جس میں بیٹھے ہوئے لال پور کے حلقے کے انچارج تفتیش کر رہے تھے۔ ان کے کان میں ایک ڈر جگمگا رہا تھا اور کھڑی ہوئی مونچھوں سے ہیبت ٹپک رہی تھی۔ داروغہ جی نے کاغذات پر سے نگاہ اٹھائی اور ٹھاکر کو آتا دیکھ کر سپاہیوں کو اشارہ کیا وہ باہر نکل گئے۔

"ٹھاکر صاحب میں صبح سے چھان بین کر رہا ہوں۔ اس ڈاکے میں رام لال پانڈے کے گروہ کا ہاتھ ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ بھیا صاحب کا درجنوں سے تعلق تھا یا نہیں تھا یہ الگ بات ہے لیکن بھیا صاحب کے اشارے پر درجنوں عورتیں گڑھی میں لائی گئیں۔ کل سر شام ہی راج پور کے سیدی بنیئے کی بیوی اٹھالی گئی اور سرکاری ادھے پر لاد کر گڑھی لائی گئی۔ سیدی سرکش آدمی ہے۔ آپ جانتے ہیں اس نے رام لال پانڈے سے سازباز کی۔ گڑھی کے دو ایک سپاہی بھی اس نے توڑ لیے۔ اور گھس پڑے۔ بھیا صاحب کے کمرے سے جب وہ عورت نکالی گئی۔ تو انھوں نے گولی چلا دی۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے بھی گولی چلائی۔ نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔"

"داروغہ جی میرا نام ہے کنور بکرم راج سنگھ۔ بڑرا داں کے چراغوں میں میرا تیل جلتا ہے۔ بڑرا داں کی آبادی تین ہزار سے زیادہ ہے۔ آبادی کا ہر تیسرا مرد ہسٹری شیٹر تھا یا ہے یا ہونے والا ہے۔ جوار کے مٹنے کا کتنا ہی بیڑا آدمی میری بندوقوں کا نشانہ بن چکا ہے۔ اس کا علم آپ کو ہے۔ چودھری صاحب لال پور سے میری کئی بار فوجداری اور درجنوں بار لڑائی ہو چکی ہے۔ مگر یہ ہمارے نجی معاملات ہیں۔ مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ اس مقدمے کی نوعیت ہو گی ڈکیتی۔ ملزم پکڑے جائیں گے۔ اور سزایاب ہوں گے۔ میری مراد مقدمے کے انجام سے ہے ورنہ سزا دینے کے لیے ابھی میں زندہ ہوں۔ اگر اس مقدمے میں آپ نے کوئی پولیس والی چال چلی تو میرے آگے نہ ناتھ ہے نہ پیچھے پگہا۔ ایک عورت ہے جس کے لیے تین ہزار بیگھے سیر، درجنوں باغ اور ہزاروں روپیہ بینک میں ہے۔ اگر آپ تفتیش

کے پیرے میں بھی لیٹے ہوں گے تو مونڈ کرواڈالوں گا۔ ویسے آپ اپنا حقِ خدمت چاہتے ہوں تو دوسری بات ہے یہ رکھ لیجئے۔"

نوٹوں کی ایک گڈی میز پہ گر پڑی۔ اور داروغہ جی کے چہرے پر چراغ جل اُٹھے۔

آج میر صاحب کے منہ میں پان نہیں تھا۔ وہ مجھے اجنبی اجنبی نظر آ رہے تھے۔ ماموں کی مسہری کے قریب کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ غم ان کے سراپے پر برس رہا تھا۔

"میر صاحب میں نے سوچا تھا کہ جب اچھے کی شادی کروں گا تو لال پور اور اس کے جوار میں چولھے نہ جلیں گے۔ لیکن خدا کا شکر ہے وہ جو کچھ دکھائے دیکھنا پڑے گا۔ کل اچھے کا سوئم ہے۔ ساری بکھاریوں سے غلہ نکلوا لیجئے۔ سارے کھٹاروں سے بکرے منگوا لیجئے۔ بھنگیوں سے کہئے کہ لال پور اور قریب کے گاؤں میں ڈگی پیٹ دیں کہ کل دونوں وقت کا کھانا گڑھی میں ہو گا۔ ہندو اور مسلمان سب کا۔"
حقے کی نے ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ رومال سے آنسو پونچھتے رہے۔

"خدا معلوم مجھے اچھے کے اور فاتحے نصیب ہوں کہ نہ ہوں۔ اس لیے آپ لال پور کے حافظوں کو بلا لیجئے۔ سب کو تین تین سو روپیہ ساٹھ ساٹھ گز کپڑا اور ساٹھ ساٹھ من غلہ دلوا دیجئے کہ وہ سال بھر قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہیں اور اس کی روح کو ثواب بخشتے رہیں۔ اچھے کے تمام کپڑے اور اس کے استعمال کی چیزیں غریبوں میں بٹوا دیجئے۔" ان کی آنسو بھری آواز کراہ کر ختم ہو گئی۔

آج سوئم تھا۔ گڑھی کی شاید آخری رونق کے لیے ہنگامہ دیگوں کی چھاؤں میں بجا رہا تھا۔ میلے کچیلے آدمی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ جیسے سچ مچ اچھے کی شادی ہو رہی ہے۔ ماموں لان میں آرام کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ انگیٹھی اور حقہ لگا تھا۔ ان کے پائجامے کے گھٹنے نیلے ہو گئے تھے۔ جامے وار کی صدری سے جھانکتے ہوئے کرتے کے گلے پہ پان کے دھبے تھے۔ اور مونچھیاں تک بنی نہیں۔ ٹھاکر صاحب برادران سے لے کر نوکر چنگو تک کوئی ان کے پاس موجود نہ تھا۔ سب اپنی اپنی رنجور مصروفیت کا شکار تھے۔ وہ اس طرح خالی خالی نگاہوں سے خلا میں گھور رہے تھے جیسے لال پور کا علاقہ اچھے کو مل گیا ہو اور وہ ایک گذارے دار کی طرح گڑھی کی تقریب دیکھ رہے ہوں۔

اپیا اچھے کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ سینٹھل کی روئی کے گاؤ تکئے میں اچھے کی کہنی کا نشان ابھی تک باقی تھا۔ اس کے قریب وہ مراد آبادی سماندان رکھا تھا جس میں اچھے کی پی ہوئی آخری سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے بھرے تھے۔ اپیا کے سامنے میز پر اچھے کی گھڑی، قلم، سگریٹ کیس، تمباکو اور سگریٹوں کے ڈبے، پائپ، قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں، قمیصوں اور شیروانیوں کے طلائی بٹن، البم اور ڈائریاں سارا سامان رکھا تھا۔ اور وہ بھی اچھے کی کسی قیمتی یادگار کی طرح بت بنی کرسی پر بیٹھی تھیں۔

"حسن بانو آتو سے کہہ دو کہ یہ سامان میں نہ دوں گی۔ اس کی قیمت کا اندازہ کر لیا جائے اور میرا کوئی زیور بیچ کر روپیہ تقسیم کر دیا جائے۔"

میں دروازے سے لگی میز کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں باہر کے زینے سے اتر آیا۔ پلاؤ اور زردے کی خوشبو کے آوارہ مزاج مرغولے ٹہل رہے تھے۔ پھاٹک کے اندر اور باہر دور تک لال پور کی عیدگاہ کے فرش اور گڑھی کی جاجموں اور چاندنیوں پر ان گنت آدمی کھانا کھا رہے تھے۔

ماموں اپنی مسہری پہ لحاف اوڑھے بیٹھے تھے۔ ان کا پیچوان ایک کونے میں رکھا تھا۔ میر صاحب شیروانی پر کمبل اوڑھے سامنے کرسی پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کا منہ پان سے خالی تھا۔

"حضور میں نے کئی بار کوشش کی کہ گوش گذار کر دوں لیکن سوئم کے سلسلے میں مصروف بھی رہا اور ہمت بھی نہ ہوئی۔"

"کیا بات ہے" ماموں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"تحصیل سے چپراسی خبر لایا ہے کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر تمام روپیہ بے باق نہ ہو گیا تو خدانخواستہ"

"قرقی آجائے گی میر صاحب ... یہی نا"

"کس منہ سے عرض کروں" میر صاحب نے ایک کمانی کا چشمہ اتار کر شیروانی کے دامن سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"میر صاحب اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے.... بس یہ زینتی میرے پاؤں کی زنجیر بنی ہے ورنہ میں منہ کالا کر لیتا۔"

وہ سوچتے رہے اور کمرے کا سناٹا گمبھیر ہوتا گیا۔

"میں کل آپ کو کوئی جواب دوں گا" ان کے لہجے میں ریاست کا غرور لوٹ آیا تھا۔

"تلک سنگھ... یہ باہر کون لوگ ہیں"

"گجراج سے آدمی آئے ہیں"

"بلاؤ"

چق اٹھا کر پانچ آدمی شلوکوں اور دھوتیوں میں سکڑتے ہوئے اندر آگئے۔ سب ادھیڑ یا بوڑھے تھے۔ سبھوں نے آدھے جھک کر سلام کیا۔ اور ادب سے بیٹھ گئے۔

"کیسے آئے تم لوگ" سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک مسہری کی طرف کھسک کر بولا۔

"سرکار کل رات آپ کیرا چھوٹا کا ام گجر گوا"

"ارے ہچ ہچ... کیا بیمار تھا"

"کچھ نائیں مالک.... اوکے سنگ کوئی "بیونائے" بیٹے وہن" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کیا چاہئے۔"

"سرکار چِتا کے لیے لکڑی نائیں ہیں"

"برج لال"

"سرکار"

"کسی باغ سے اس کو ایک سوکھا پیڑ دے دو۔"

وہ پرنم آنکھوں سے سجدے کرتے اور کانپتے ہاتھوں سے سلام کرتے چلے گئے۔

بائیں باغ کی پراسرار جھونپڑی بالکل تاریک تھی۔ دیوان خانے کے برآمدے میں بہت سے آدمی لیٹے بیٹھے تھے۔ بیڑیاں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میر صاحب آگے آگے لالٹین لیے چل رہے تھے ان کے پیچھے پیچھے عورتوں کی ایک قطار دلائیاں اوڑھے چلی آ رہی تھی۔ اپیا کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ اچھے کے کمرے کی کرسی پر وہ اسی طرح بیٹھی تھیں۔ دیوارگیری پر رکھا ہوا لیمپ جل رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ پر انھوں نے نگاہ اٹھائی۔ جس میں سوچتے سوچتے زخم پڑ گئے تھے۔ ان کے گالوں کی سرمئی شکنیں سیاہ ہو گئی تھیں۔ ان کے خدوخال

پہ مردنی برسنے لگی تھی لیکن دلبری اور پُرجلال ہو گئی تھی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اور ان کے کمرے کی دہلیز پہ رکھے ہوئے گرم پانی کے پاس بٹھا دیا۔ اور صابن دان کھول کر بڑھایا۔ وہ گم سم بیٹھی رہیں۔ پھر بڑی دیر کی منتوں کے بعد منہ دھویا۔ تپتی چوکی پہ کھانا لیے بیٹی تھی۔ بڑے اصرار کے بعد انھوں نے کھانا شروع کیا۔ چند نوالے کھا کر اٹھ بیٹھیں۔ میں گفتگو کا ایک دفتر لیے بیٹھا رہا لیکن زبان نے یاوری نہ کی۔

صبح ہی سے ماموں کے کمرے سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کی چلتے باہر ہی چلی گئی تھی۔ اپیا میرے ساتھ چائے پی رہی تھیں۔ انھوں نے اپنا دوپٹہ دادی کی طرح اوڑھ رکھا تھا۔ معلوم نہیں کیسے ان کا کان کھل گیا۔ لمبا لمبا آویزہ غائب تھا۔ اپیا نے چونک کر اپنا دوپٹہ درست کر لیا۔ ان کے خدوخال مسکراہٹ کی خوشامد کر رہے تھے لیکن وہ ایک ضدی معشوقہ کی طرح روٹھی ہوئی تھی۔ اپیا کی بے بسی پہ مجھے خود شرم آ رہی تھی۔ دکھ ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر چلا۔ وہ نگاہوں سے کہتی رہیں مگر منہ سے نہ روک سکیں۔

ابتے کی تعزیت کرنے والوں کا طویل سلسلہ جاری رہا۔ اندر پردہ ہو گیا تھا۔ کئی دن تک میں ان کی آواز نہ سن سکا۔ ان کی صورت نہ دیکھ سکا۔ میں تحصیل سے واپس آیا۔ چائے پی رہا تھا کہ ماموں کے چلانے کی آواز آئی۔ میں چائے ختم کر کے پہنچا۔ تو وہ مسہری پر خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ خمیرہ تمباکو کی ہلکی ہلکی خوشبو سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ منشی جی ایک لال کاپی لیے ایک کرسی پہ بیٹھے تھے۔ ایک دوسرا آدمی زمین پہ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ منشی جی بول رہے تھے۔ تخمی اور قلمی باغوں کے درختوں کی تعداد۔ متفرقات کا حساب۔ ہاتھی بیل گائے بھینسوں کا حساب ہو رہا تھا۔

"منشی جی اگر تخمی باغ مناسب قیمت پہ بک جائیں تو کافی روپیہ مل سکتا ہے۔" وہ جیسے گڑگڑا رہے تھے۔

"حضور دقت یہ ہے کہ تخمی باغ اتنے پرانے ہیں کہ ان میں سو درخت بھی گت کے نہیں۔ سب جلے ہوئے سوکھے ہوئے کھڑے ہیں۔ قلمی باغ لکڑی کے نقطۂ نظر سے کوئی قیمت ہی نہیں رکھتے۔"

"پھر بھی آخر کتنے کے ہوں گے؟"

"سرکار.... اگر پانچ ہزار مل جائیں تو بھی غنیمت ہے۔"

"پانچ ہزار" ماموں بے قرار ہو گئے۔

"جانوروں کی حالت یہ ہے کہ دو بھینسوں اور چار جوڑ بیلوں کے علاوہ سارے جانور ہڈی چمڑہ ہیں۔ گایوں کو کوئی پوچھنا ہی نہیں۔ بیسیوں ماری ماری گھومتی ہیں۔"

"سب نیلام کر دیجئے.... جو مل جائے.... اس کا شکر ہے اور آپ نے بندوقوں کے لیے کچھ کیا۔"

"جی ہاں دو آدمی مل سکے ہیں"

"کون ہیں" ماموں نے حقے کا ایک کش لے کر پوچھا۔

"ایک تو گردیپن پاسی کا لڑکا ہے.... دوسرا چھٹی لودھ"

"کیا..... ان کو لائسنس مل گئے ہیں؟"

"جی ہاں..... مدت کے میں نے ایک بار گوشگذار تو کیا تھا"

حسن بانو دروازے پر آ کر ٹھٹھک گئی۔ پھر دوپٹہ درست کر کے پنے تلے قدم رکھتی ماموں کی مسہری کی پٹی کے پاس کھڑی ہو گئی اور جھکے

سے ایک مخملیں غلاف کا صندوقچہ ان کے تکیے کے پاس رکھ دیا۔

"کیا ہے"

"بیٹا صاحب نے بھیجا ہے" ماموں نے کانپتے ہاتھوں سے صندوقچہ کھولا۔ اپیا کے کاندھوں تک جھولتے آویزے، جگمگاتا ہوا چاند۔ جڑاؤ چوڑیاں اور نکلس پازیب اور انگوٹھیاں نکال نکال کر دیکھیں اور لرزتے ہاتھوں سے صندوقچی بند کر دی۔ ان کی آنکھوں سے پانی کی دو لکیریں گالوں کو بھگوتی ہوئی گریبان میں ڈوب گئیں۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا جہاں ایک آدمی بندوق کی نال صاف کر رہا تھا۔ اس کے آگے لپٹے ہوئے چاندی کے تاروں کا ایک گچھا رکھا تھا۔

اپیا اپنی مسہری پر بیٹھی ہوتی تھیں۔ نسیمن چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ہار ان کی گردن اور کلائیوں میں پہنا چکی تھی۔ دو سرخ لانبے لانبے پھول جھمکوں کی طرح ان کے کانوں میں پہنا رہی تھی۔ میں بڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر چلا آیا۔

مکنا پور کے میلے میں دونوں ہاتھی بکنے گئے تھے۔ ایک بکا اور ایک واپس آ گیا۔ پھاٹک پر اس کا نیلام ہو رہا تھا۔ بوٹے لودھ منشی جی سے بات کر رہا تھا۔

"یہ سارا بودنا ہاتھی کا کری" کسی نے پوچھا۔

"پارسال سہالک میاں اپنے لڑکے کبری لگن کھاتر ہاتھی مانگن رہیں میاں گاری دے کے بھگائے دیہن رہیں اب او گھر پر باندھ رہا ہے" کسی نے جواب دیا

پھر بوڑھے نیلبان نے بھرائی ہوئی آواز میں ہاتھی کو ڈانٹا وہ بیٹھ گیا۔ ایک کالا کالا آدمی کمبل اوڑھے گھٹنوں تک دھوتی باندھے اجلے گاتے پر میلے میلے پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھی کھڑا ہو کر ایک طرف کو چل دیا۔ جیسے آسمان سے برستی ہوئی نعمت کی طرح کھلیانوں کو دھوتا ہوا جھونپڑوں کی طرف بہہ رہا تھا۔ زندگی سونے کے گھنگھرو پہنے چھم چھم کرتی گڑھی کے پھاٹک سے نکلی اور ایک چھپر میں گھس گئی۔

اب خوبصورت بیلوں کا ایک جوڑ حلقے میں کھڑا تھا۔ ان کے مٹیالے سینگوں کی چمکتی سیاہی انجانے لوگوں نے دھو دی تھی۔ ان کی سفید جلد پر ہاتھوں کے سیاہ سیاہ ٹھپے کھو گئے تھے۔ پھاٹک میں کرسی ڈالے میر صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے سوکھے ہاتھوں میں اچھے کی محبوب بندوق تھی جس کے ہاتھی دانت کے کندے پر انگریزی میں "چودھری عزت رسول آف لال پور" کھدا ہوا تھا۔ ایک ادھیڑ آدمی کھدر کا کرتا پہنے اور دھوتی باندھے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔

"ہم منشی جی اس کے ہزار روپے دے سکتے ہیں" چار چار سو کی تو آئی ہیں"

"گر بڑے ... کچھ مہاراج"

"مگر دانت تو وہ بھی ہیں۔ اور یہ پرکھوں کی بندوق ہے ..... اس کا بھروسہ کیا"

روش پر دو آدمی باتیں کرتے جا رہے تھے۔

"یہ میاں آخر سب بیچے کیوں ڈالتے ہیں"

"بیل بدھیا بیچ کر ٹریکٹر لینے والے ہیں۔ ہاتھی گھوڑے کیا کریں گے رکھ کر۔ جو ٹریکٹر چلائے گا وہی موٹر بھی ہانک لیا کرے گا"

اور ماموں کسی کو حکم دے رہے تھے۔

"منشی جی سے کہو اگر پھلواڑیاں اور باغات کوئی خریدے تو معہ زمین کے بیچ دیں۔"

میں اپیا کو بائیں باغ کی نہر پر چھوڑ کر امرودوں کے کنج میں نکل آیا۔ کہ بجری پر ایک پہاڑ سا رینگتا نظر آیا۔ میں واپس ہوا تو اپیا بھی میرے ساتھ اُٹھ آئیں۔

"میں سمجھا تھا آپ سو گئے ہوں گے۔" ٹھاکر اپنا اسٹر اتار رہے تھے۔ ماموں کے قریب اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

"نیند کہاں ٹھاکر.... بڑراواں میں سب خیریت ہے" باہر ہاتھی چنگھاڑ رہا تھا۔

"لال پور میں نیلام کیسا ہو رہا ہے۔"

"لال پور کی گڑھی کا سامان نیلام ہو رہا ہے۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں لیکن یہ سب ہے کیا؟ میں شہر سے آیا تو ٹھکرائن نے چھوٹتے ہی یہ خبر سنائی پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بھگوان کی سوگند پروسی تھالی چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہاتھی سویرے کا کسا ہے۔"

"۱۸۵۷ء سے پہلے نواب سلطنت رسول دس لاکھ کے جاگیردار تھے۔ انگریز آئے تو لال پور دے کر نشان و نوبت چھین لیا۔ تمھاری حکومت نے لال پور بھی ہضم کر لیا۔"

"میری حکومت.... کیا کہتے ہو چودھری.... جیا دو دھیر ہو گیا ہے..."

"پاکستان میں میرے سالے.... زبی کے ماموں فوج میں لفٹننٹ کرنل ہیں۔ انھیں کے یہاں اتر جاؤں گا۔ زبی بھی وہیں کہیں کھپ جائے گی۔" اپیا نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔

"کیا بالکل طے کر لیا ہے"

"اور کیا طے کر دوں.... بیالیس ہزار کا قرض ادا کر کے گڑھی کی دیواریں مجھے کھا جائیں گی۔ میرے پاس ہے ہی کیا.... ایک لچے تھا جس سے کمر سیدھی تھی وہ بھی چلی بسا۔ ٹھاکر.... زبی کا زیور ننک سنار کے گھر چلا گیا ہے۔ آج میری بچی پھول پہنے ہوتے ہے جس کی مائیں سونا پہنتی تھیں۔ میں جس گاؤں میں راجاؤں کی طرح بوڑھا ہوا اسی گاؤں کے لونڈوں کی آنکھیں دیکھوں...." وہ اٹھ کر بیٹھ گئے ——

"رام لال پانڈے جس میں لال پور کا دھوبی انگھنے کی مجال نہ تھی وہ میری گڑھی میں گھس کر میری بیوی اور میرے بچے کو گولی مار کر چلا جائے" ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اپیا نے اپنی کلائی منہ میں رکھ لی۔

"کون ہے" ٹھاکر کی آواز سکوت توڑ گئی۔

"سرکار"

"سپاہی کو بھیجو" وہ رومال سے آنکھیں خشک کرنے لگے۔ سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس کی کمر پر پستول پڑا ہوا تھا۔ پیروں میں اونی پٹیاں بندھی تھیں۔ اس نے ماموں کو جھک کر سلام کیا اور ایک صندوقچی ٹھاکر کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔

ماموں زیور اور نوٹوں کی گڈی اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

"چودھری تم سے کیا چھپا ہے..... جیسے تیسے دادا کا بھرم رکھے ہوئے ہوں ٹھکرائن نے یہ کچھ تم کو بھیجی ہیں۔"

"ان سے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ میں یہ کہاں لوٹانے کے لیے لے جاؤں... جو کچھ میرے پاس ہے اسی کے صحیح سلامت

پہنچنے کی اُمید نہیں ہے"۔ دونوں کی سسکیاں کمرے میں سرسراتی رہیں جیسے کہیں دور ناگنیں لڑ رہی ہوں۔

بڑی رات تک ایبا آنسوؤں کی مالائیں گوندھ گوندھ کر میری چارہ گری کی گردن میں پہناتی رہیں۔

"ایبا یہ وقت اس قسم کی گفتگو کے لیے نہیں ہے یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم لوگوں کو ساری زندگی میں کسی قسم کی گفتگو کے لیے وقت نہ مل سکے گا" انھوں نے اپنی وہ نظر اٹھائی جس پر آنسوؤں نے باڑھ رکھ دی تھی۔

"میں نے بھائی جان کو تفصیلی خط لکھ دیا ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔ وہ میرا خیال ہے کل پرسوں تک آجائیں گے۔ اگر آپ کی مرضی شامل ہو تو وہ ماموں سے آپ کو ہندوستان ہی میں روکنے کی درخواست کریں "۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں اور آنسو ان کے نیم پژمرہ رخساروں کو سینچتے رہے۔ پھر وہ میری گود میں ڈھلک آئیں۔ پھر ہم لوگ بڑی دیر تک ہزاروں محبت کرنے والوں کی طرح ہزاروں برس سے دہرائے جانے والے الفاظ ایک دوسرے کی سماعت کے دامن میں انڈیلتے رہے۔

مجھے یقین تھا کہ شام کی گاڑی سے بھائی جان آجائیں گے۔ میں کچہری سے سیدھا اسٹیشن آیا۔ گاڑی لیٹ تھی۔ انتظار کرتا رہا۔ کوئی آٹھ بجے گاڑی آئی۔ بھائی جان نہیں آئے تھے۔ اندھیارے راستوں میں بیل آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ دیوان خانے کے اونچے اونچے دروازوں کے رنگین شیشوں پر لیمپ کی شوخ روشنی نے قلعی کر دی تھی۔ ان بند دروازوں کے پیچھے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں ماموں کا سنسان کمرہ دیکھتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں پڑی ہوئی جھلنگا چارپائیوں پر بوڑھی بوڑھی عورتیں میلی کچیلی رضائیوں اور گدڑیوں میں لپٹی ہوئی کھانس رہی تھیں یا تھوک رہی تھیں۔ ایبا کا کمرہ بھی خالی تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر پڑ رہا۔ حسن بالو دروازے پر آکر ٹھٹھک گئی۔

"چائے بنوا دیں"

"نہیں.... ایبا کہاں ہیں"

"نیچے... سامان کی کوٹھری میں کھانا ہوئے چکا ہے آپ کے لیے نکلوا دیں"

میں تنہا کھانا کھا کر ایبا کا انتظار کرتا رہا۔ معلوم نہیں کب سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سخت بارش ہو رہی تھی۔ دالان کے ٹین پر پرنالے جھانجھیں بجا رہے تھے۔ میں جو کپڑے آفس پہن کر گیا تھا وہی پہنے سو رہا تھا۔ ان کو بدلنے اور دروازہ بند کرنے اٹھا تو ایبا کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور روشنی کی چادر آدھے دالان اور صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ پھر روشنی کی اس چادر پر سے ایک سایہ گذر گیا۔

ایبا چوکی پر بیٹھی تھیں۔ گھٹنوں پر ان کا سر رکھا تھا۔ ان کے شانوں سے دلائی ڈھلک چکی تھی۔ ان کے سامنے نیچی سی کرسی پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بھاری ڈریسنگ گون میں ڈوبا ہوا۔ جیسے ایبا کے البم کی پُراسرار تصویر مجسم ہو کر کرسی میں سما گئی ہو۔

"تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ تم نے جانے بوجھے بغیر یہ کیسے یقین کر لیا کہ میں تم سے جھوٹ ہی بول رہا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میرے دو بھائی بھی تھے۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ میری تین بہنیں بھی تھیں۔ تم سے ہوسٹل میں مل بھی چکی تھیں۔ تم سے خط و کتابت بھی تھی، تم نے اخباروں میں یہ بھی پڑھا ہو گا کہ میرٹھ کا سب سے بڑا فساد میرے گاؤں میں ہوا تھا۔ اور اب تم کو شاید یہ سن کر حیرت بھی نہ ہو۔ اس لیے کہ تم سن چکی ہو گی...... کہ ہزاروں بدنصیب آدمیوں کی طرح..... میں بھی لاہور جب پہنچا ہوں..... تو میرا بھرا پرا گھر فساد کی آگ میں جل کر سیاہ ہو چکا تھا...؟

"میں نے نہیں سنا.... خدا کی قسم میں نے نہیں سنا.... میں نے جو کچھ سنا.... کاش میں وہ سننے کے لیے زندہ نہ رہتی" اپیا نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس نے ان کے صندلیں ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں رکھ لیے اور ان کی حسین آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کیا سنا تم نے.... میں بھی تو کچھ سنوں.... وہ کون سی ایسی خبر تھی جس نے تمھارے دل سے میری تصویر نوچ کر پھینک دی۔"

.... بولتی کیوں نہیں ہو.... منہ سے بولو.... زبنے....."

"میں نے یہ سنا تھا کہ تم پاکستان میں ڈائرکٹر ہو اور کوئی امریکن لڑکی تمھاری بیوی بن چکی ہے" وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور اپیا کے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو خود بیٹھا پونچھتا رہا۔

"میں ڈائرکٹر نہیں ہوں.... میرے اوپر الزام کے جھوٹ کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے۔ میں فوج میں ہوں۔ میرا سوٹ کیس کھولو.... اور ثبوت دیکھ لو.... میرے دل پر اپنا ہاتھ رکھو اور اس کی دھڑکن پڑھ لو۔ میں ان بھائیوں کو بھول گیا۔ جنھوں نے اپنی جوان بہنوں کو گولی مار کر کوٹھی کے کنوئیں میں دفن کر دیا تھا اور خود گولی چلاتے چلاتے گولی کا نشانہ بن گئے تھے.... میں اس باپ کو بھول گیا جس نے اپنے ایک مردہ بیٹے کے ہاتھ سے رائفل اور دوسرے مردہ بیٹے کی جیب سے کارتوس لے کر اپنی جان اپنی ایک اولاد اور اپنی آن بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں تم کو کبھی نہیں بھولا۔ زندگی کی تپتی ہوئی دھوپ میں تمھارا خواب مجھ پر سایہ کئے رہا ہے.... زندگی کی ہر خوشبودار چھاؤں میں تمھارا فراق ہڈیوں کو گھلا دینے والے سورج کی طرح میرے سر پر مسلط رہا ہے۔ میں نے تم کو خطوط لکھے.... میں نے تمھارے نام پیام بھیجے لیکن تم نے میرے مرثیے نہیں پڑھے.... تم نے میری فریادیں نہیں سنیں۔ میں نے کتنے جتن کئے۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا لیکن ہندوستان آنے کی صورت نہ نکل سکی۔ ہمیشہ میرے راستے میں پاکستانی فوج کا عہدہ آکر کھڑا ہو گیا۔ جس سے نیچے اتر کر میں تمہیں پا نہیں سکتا تھا۔ میں دنیادار نہیں ہوں ورنہ کیپٹن نہ ہوتا کچھ اور ہوتا۔ تم دنیادار نہیں ہو ورنہ دل کے طاق پر رکھا ہوا یہ بوسیدہ چراغ دس برس تک تمھارے آنسوؤں سے نہ جلتا رہتا۔ تم ماں بن چکی ہوتیں تمھاری اولادیں کلکاریاں مار رہی ہوتیں۔ شاید دس برس سے تم نے آئینہ نہیں دیکھا ورنہ اپنے چہرے کی مُردنی پڑھ کر اپنی کہانی کا نیا نام سوچتیں۔ شاید دس برس سے تم نے کپڑے نہیں بدلے ورنہ اپنا آپ دیکھ کر چونک پڑتیں۔ تم دوسروں کیلئے جو کچھ بھی ہو لیکن میرے لیے ماضی کی سب سے قیمتی نشانی ہو۔ میری برات تمھاری زلف سے لٹکتی ہے۔ میرا ہر دن تمھارے چہرے سے چمکتا ہے میرا ہر خواب گھوم پھر کر تمھاری آنکھوں تک پہنچتا ہے۔ میری ہر تمنا تھک ہار کر تمھارے آغوش میں آکر پڑ رہتی ہے۔ میرے عاشق وجود کے اندر چھپے ہوئے انسان نے تمھاری صورت کے بڑے بڑے کارٹون بنائے اور جب وہ دل کے سامنے لے کر پہنچا تو دل مسکرا کر چپ ہو رہا۔ لیکن بڑی سے بڑی تصویر اس کی نگاہ پر نہ چڑھ سکی.... تمھارا بڑے سے بڑا کارٹون اس کی نگاہ سے نہ اُتر سکا۔ میری تنخواہ بہت کم ہے۔ تمھارے باپ کے باورچی خانے کے مصارف سے بھی کم.... میرا مکان بہت چھوٹا ہے۔ تمھارے شاگرد پیشے سے بھی چھوٹا لیکن تمھارے ہاتھوں کی برکت اور تمھارے وجود کی جگمگاہٹ ہر خوشی کو خرید لے گی۔ ہر آرائش اور ہر سکون کو جنم دے دے گی۔" اس کی آواز بھرا کر ڈوب گئی۔ اب اس کی باری تھی وہ رو رہا تھا۔ اپیا نے اپنے ہاتھوں کو اس کے ہاتھوں کی گود سے نکالا۔ آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ لرزتی انگلیوں سے ریشمی دوپٹے کا کونہ پکڑ کر اس کی آنکھیں پونچھیں۔ اس کی چارہ گری کی۔ اس کی دلداری کی۔ ایسی دلداری جس کے حصول کے لیے کوئی بھی انسان دس برس تک کیا زندگی بھر آنسو بہا سکتا ہے۔

بارش تھم چکی تھی لیکن آنکھیں برس رہی تھیں۔ لال پورہ کی مسجد کے موذن کی رعب دار آواز آ رہی تھی۔ چکیوں کی گھر گھراہٹ پر نرم مترنم آوازیں رینگ رہی تھیں۔ اپیا کا کمرہ تاریک تھا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھل چکا تھا۔ دیوان خانے کے دالان میں پڑی ہوئی تپائی پر تنگ سنگھ

اڈی اوڑھے کاندھے سے بلم ٹکائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کلو سے کو کہو ادھا کھینچ دے مجھے ابھی ابھی تحصیل پہنچنا ہے" اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا وہ شاید پہلی بار مجھے آج صبح کو بیدار ہو کر چو لنا ہو گیا تھا۔ میرے سوال کا جواب دیئے بغیر وہ پھاٹک کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اندر آکر کپڑے پہنے اور تیزی سے باہر آنے کے لیے ڈیوڑھی کی طرف مڑا کہ حسن بانو سامنے آ گئی۔

"بھیا آپ نے ابھی چلے بھی"

"مجھے بہت ضروری کام ہے۔ بہت جلد تحصیل پہنچنا ہے۔ جانے کا جھگڑا کروں گا تو کام رُک جائے گا۔ میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے باہر آ گیا۔ پھاٹک میں ادھا کھڑا تھا۔ بکّا اور تاک سنگھ ایک بیل کی رسی تھامے آ رہے تھے میں اپنے سامان کے ساتھ اپنا دن اپنے خواب سب کچھ گڑھی میں چھوڑ کر نکل پڑا تھا۔ میں وہ بدنصیب جواری تھا جس نے اپنا سب کچھ ایک ہی بازی میں لگا دیا ہو اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ گھر کے دروازے پر کلو نے مجھ سے پوچھا۔

"ادھا کے بچے لا دیں"

"تم ادھا کھول دو۔ جب جاؤ.... میں خط لکھتا ہوں"

لیکن میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اُسے خالی ہاتھ رخصت کر دیا۔ تحصیلدار کے بنگلے پر اس سے ملاقات کی اور ایک ہفتے کی چھٹی لی۔ اور لکھنؤ چلا گیا۔ وہاں اپنی تنہائیوں کے میلے میں کھو گیا۔ اپنی سوگواریوں کے جشن میں گم ہو گیا۔ اور جب کبھی میری مجھ سے ملاقات ہوتی ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کر کے چھٹی کی درخواست بھیج دیتا۔

پھر ایک دن مجھ پر انکشاف ہوا کہ زندگی اپنا کے بغیر کاٹی جا سکتی ہے لیکن نوکری کے بغیر نہیں۔ اس عرفان کے ہوتے ہی میں تحصیل پہنچا۔ چپراسی نے خطوط کے بلندے کے ساتھ ایک چٹھی بھی میری میز پر لا کر رکھ دی۔ اور اس دن کچہری سے آنے کے بعد بڑی دیر سے اپنے مکان کو جھاڑتا رہا۔ پونچھتا رہا۔

سوتے جاگتے لمحے

کشمیری لال ذاکر

امرتا سدھیر کو اسٹیشن پر سی اوف کر کے ابھی ابھی لوٹی تھی اور آتے ہی پلنگ پر گر گئی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دو میل دور ریلوے اسٹیشن سے نہیں کسی طویل سفر سے واپس آئی تھی اور اُس کا سارا جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنا منہ پروں والے تکیے میں چھپا لیا جس کے غلاف پر سدھیر کے سر سے جھڑے ہوئے کئی بال بکھرے پڑے تھے۔ امرتا کے دماغ میں ایک خاص قسم کی بُو لہرانے لگی جو صرف سدھیر کے ہی بالوں سے آیا کرتی تھی۔ لطیف سی ہلکی ہلکی بُو جو معدوم نیندوں، اُجلے خوابوں اور دلکش یادوں کے قافلے لاتی ہے اور سدھیر کو دیکھ کر امرتا ہر بار سوچتی کہ اُس کی شخصیت سے جیسے کسی نشیلی بُو کی لپٹیں نکلتی تھیں۔ سدھیر جیسے ہر گھڑی اونگھتا ہوا سا نظر آتا تھا۔ بوجھل پلکیں، گہری آنکھیں، تھکا ہوا سا چہرہ، بھاری اور لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز۔ وہ چلتا تو امرتا کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ نیند میں چل رہا تھا۔ نیند کی سی کیفیت کا یہ تصور بڑا پیارا تھا۔ اُسے تو سدھیر کے خط پڑھنے سے بھی نیند آ جاتی تھی۔ بلکہ ایک بار تو وہ اُس کا خط پڑھتے پڑھتے واقعی سو گئی تھی اور جب اٹھی تھی تو اُس کے ماتھے سے گرتے ہوئے پسینے کے قطروں نے خط کے کئی لفظوں کو بگاڑ ڈالا تھا جنہیں وہ اپنے ذہن کی مدد سے دیر تک سنوارتی رہی تھی۔

ایک بار اُس نے سدھیر سے کہا تھا۔

"اچھا ہے کہ تم پروفیسر ہو اور تمہارے سوتے یا جاگتے رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر ہوتے تو جانے کتنے ہی مریض اوپریشن ٹیبل پر پڑے پڑے سو جاتے۔"

"اور میں خوش ہوں کہ تم پروفیسر نہیں ورنہ سٹوڈینٹس کی جان پر بن جاتی۔"

سدھیر نے جواب دیا تھا۔

اور پھر دونوں دیر تک ہنستے رہے تھے اور باتیں کرتے رہے تھے اور اُن کی توجہ اُس وقت بٹی تھی جب نوکرانی چائے کا سامان لے کر اندر آئی تھی۔

لیکن آج نوکرانی بھی گھر پر نہیں تھی۔ امرتا نے اُسے دو دن کی چھٹی دے کر گاؤں بھیج دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ سدھیر آئے تو اُس کے سارے کام وہ خود کرے۔ اور اُن چوبیس گھنٹوں میں جو سدھیر نے یہاں گزارے تھے امرتا نے ایک سگھڑ

گرہستھن کی طرح گھر کا سارا کام خود کیا تھا۔ سدھیر نے اُس کی اس تبدیلی پر آمرتا سے مذاق بھی کیا تھا۔ لیکن اب تو سدھیر جا چکا تھا۔ وہ چاہتی تو تھی کہ آج کی رات وہ رُک جاتا لیکن یہ بات اُسے خود سمجھ لینا چاہئے تھی۔ وہ کیوں کہتی اُسے۔ اور سدھیر چلا گیا تھا اور امرتا خود اُسے اسٹیشن پر چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ اس گھڑی پردوں والے تکئے میں سر دبائے پڑی تھی اور جانتی تھی کہ آج اُس کی نوکرانی چائے کا سامان لے کر اُس کی محویت میں مخل ہو گی۔

امرتا نے اوندھے مُنہ لیٹے ہوئے ہی ایک لمبی سانس لی اور اُس خاص بُو کو جو سدھیر کے بالوں سے ہی آیا کرتی تھی۔ ایک دم اپنے دماغ میں سمیٹ لیا۔ اور پھر اُس کے بائیں ہاتھ کی پُشت آپ سے آپ اُس کے ہونٹوں تک چلی گئی۔ اُس کے ہونٹ پُشت کے ٹھیک اُس حصّے پر جم گئے جہاں گاڑی اسٹارٹ ہوتے وقت سدھیر نے اپنے ہونٹوں کا بھرپور دباؤ جمایا تھا۔ سدھیر کے ہونٹ ہمیشہ نم آلود رہتے تھے اور ہونٹوں کی نمی کا ایک ادھورا سا دائرہ آمرتا کے ہاتھ کی پُشت پر جم گیا تھا جسے وہ گاڑی جا چکنے کے بعد بھی وہیں اُسی جگہ پر کھڑی دیکھتی رہی تھی اور نمی سُوکھنے سے اُسے ایک عجیب سی قسم کی سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی جیسے کسی جگہ پر اسپرٹ لگ کر سُوکھنے پر ہوتی ہے۔ اُس نے اپنے ہاتھ کی گوری پُشت کو بڑے پیار سے دیکھا جس کی سطح پر چھوٹے چھوٹے سنہری بال چمک رہے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ کی پُشت کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی ماں اپنے چھوٹے سے معصوم بچے کے لبوں پر نیند میں پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کو تک رہی ہو اور پھر اُسے روشندان کے شیشوں میں سے نکل کر آتے ہوئے دھوپ کے اُس چھوٹے سے ٹکڑے کا خیال آ گیا جو تپائی پر بچھے میز پوش پر پھیلے ہوئے یوں لگا کرتا تھا جیسے کسی نے نیلے میز پوش میں چاندی کا پیوند لگا دیا ہو۔ دھوپ کا یہ چھوٹا سا ٹکڑہ اُس کا وفادار ساتھی تھا جو تین بجے کے بعد روشن دان کے راستے اُس کے کمرے میں آ جاتا تھا اور جب اسپتال کے احاطے میں اُگے نیم کے درخت اُس کا راستہ نہ روک لیتے وہ وہیں آمرتا کے کمرے میں اُس کے تصوّر کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔

دھوپ کا یہ سایہ بلا ناغہ امرتا کے پاس آتا تھا اور جس روز آسمان پر بادل چھا جاتے اور سورج نہ نکلتا تو امرتا کو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی محبوب نے آنے کا وعدہ کر کے نہ آنے کی قسم کھا لی تھی۔ اُسے عجیب بے چینی سی محسوس ہوتی لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ اُس کا روز کا ساتھی، دُھوپ کا وہ چمکتا ہوا ٹکڑہ کل بھی موجود تھا۔ وہ اُس وقت وہیں تھا جب دروازے پر دستک ہوئی تھی اور وہ بھاگ کر باہر گئی تھی اور اُس کی ساڑھی اُس کے پاؤں میں اُلجھ گئی تھی اور اُس کی چپل پاؤں میں ٹھیک سے نہ آ رہی تھی۔ سدھیر جب کمرے کے اندر داخل ہوا تو دھوپ کی اُس پرچھائیں نے اُس کا ماتھا چُوم لیا تھا۔ اُس کی آنکھیں پل بھر کو چوندھیا گئی تھیں۔

"میری دوست تمھارا سواگت کر رہی ہے" امرتا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"کون دوست؟" سدھیر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا تھا۔ امرتا کے علاوہ کون سواگت کر رہا تھا اُس کا۔

"دھوپ کی یہ پرچھائیں"

"لگتا ہے تم زندگی میں کبھی اکیلی نہ رہو گی۔ کبھی دھوپ، کبھی چاندنی، کبھی گیت اور کبھی ——"

"اور کبھی تمھارا تصوّر" امرتا نے ٹوک دیا تھا۔

اور پھر وہ دونوں جی بھر کر ہنسے تھے اور دھوپ کی وہ پرچھائیں تباہی سے رینگ کر دیوار پر چڑھ گئی تھی اور انھیں دیکھتی رہی تھی اور مسکراتی رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ اچانک چلی گئی تھی بنا کچھ کہے سُنے، بغیر کوئی بات کیے اور اسپتال کے احاطے میں نیم کے درختوں کے سائے پھیلتے پھیلتے سارے اسپتال پہ چھا گئے تھے اور شام ہو گئی تھی۔

یہ سب گذری ہوئی کل کی باتیں تھیں جنھیں امرتا آج اپنے ذہن میں دہرا رہی تھی۔

ڈاکٹر امرتا سیٹھ اسپتال میں شام کی راؤنڈ پہ چلی گئی اور پروفیسر سدھیر بھاٹیہ کمرے میں بیٹھا گولڈ فلیک کے سگریٹ پیتا رہا۔

امرتا مریضوں کے بیڈز کے درمیان گھوم رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ چونک اُٹھتی۔ اُسے لگتا جیسے اُس کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور کسی کی آواز اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ وہ رُک جاتی اور اُس کے پیچھے چلتی ہوئی نرس سامنے آ کر پوچھتی۔

"یس ڈاکٹر!"

"کچھ نہیں۔"

لیکن جتنی دیر وہ اسپتال میں رہی اُسے یہ احساس ہوتا رہا کہ کوئی اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ بلکہ ایک بار تو اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اپنا ہاتھ اُس کے کندھے پہ رکھ دیا ہو۔ اُس نے ایک دم پلٹ کر پیچھے دیکھا اور نرس کی مخصوص آواز گھبراتے ہوئے انداز میں سنائی دی۔

"یس ڈاکٹر۔"

"کوئی سیریس کیس تو نہیں ہے؟" اُس نے اپنی خفت چھپاتے ہوئے کہا۔

"میٹرنٹی وارڈ میں ہے۔"

اور پھر وہ فوراً میٹرنٹی وارڈ کی طرف گھوم گئی، جہاں نئے انسان کی پُر خلوص مسکراہٹیں اُس کا سواگت کر رہی تھیں۔ میٹرنٹی وارڈ میں جنم لینے والا ہر بچہ اُسے فلاسفر بنا ڈالتا۔ ہر بچے کے جنم پہ اُسے محسوس ہوتا جیسے دُنیا پہ چھائی ہوئی تاریک رات میں ایک نئی شمع جل اُٹھی تھی۔ ہر نیا بچہ اُسے سدھیر کی یاد دلاتا۔ سدھیر کو روشنی اور دھوپ، اُجالا اور چاندنی، برف اور سفید پھول پسند تھے۔ شاید اسی لئے اُسے گورا رنگ اچھا لگتا تھا اور سفید ساڑھیاں اچھی لگتی تھیں اور برف آلود چوٹیاں اچھی لگتی تھیں اور موٹی موٹی شفاف موم بتیاں اچھی لگتی تھیں۔

میٹرنٹی وارڈ سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے سوچا کہ کل اتوار ہو گا۔ سدھیر دھوپ میں بستر لگا کر آرام سے لیٹ سکے گا وہ اُس کے پاس بیٹھی نِٹ کرتی رہے گی۔ سدھیر سگریٹ پیتا رہے گا اور وہ اُس کے دھوئیں کو فضا میں لہراتے ہوئے دیکھتی رہے گی۔ کل اُسے اسپتال کے وارڈز میں نہ گھومنا ہو گا۔ دوائیوں کی تیکھی بُو کی جگہ سدھیر کے لمبے لمبے بالوں سے اُٹھتی ہوئی باس اُس کے ذہن میں سنڈلاتی رہے گی۔ آج رات وہ بجلی نہیں جلائے گی۔ بڑی بڑی شفاف موم بتیاں مینٹل پیس پر سجا دے گی۔ موم بتیاں اُس نے کل ہی منگوائی تھیں کیونکہ سدھیر کو موم بتیاں پسند تھیں اور سدھیر کی پسند امرتا کی پسند ہی تو تھی۔ یوں سوچتے سوچتے وہ اپنے کوارٹر

تک پہنچ گئی۔ اُسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ نرس اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسپتال کے احاطے میں لگے لیمپ جل رہے تھے اور رات کے سیاہ گیسو کائنات کے شانوں پر بکھر گئے تھے۔

"گڈ نائٹ ڈاکٹر" امرتا جب اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچی تو نرس نے کہا۔

"گڈ نائٹ سویٹ نائٹ اِن گیل" امرتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم ساتھ تھیں کیا؟"

"جی"

"حد ہو گئی۔ میں تو ایک دم کھو گئی تھی۔"

"کبھی کبھی کہیں کھو جانا اچھا لگتا ہے ڈاکٹر"

"ہاں اچھا ہی لگتا ہے، گڈ نائٹ"

نرس واپس مڑ گئی اور امرتا اپنے کوارٹر کے اندر آ گئی۔

سدھیر آرام کرسی میں سمٹ کر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ امرتا کو ایک دم ہنسی آ گئی۔

"کالج کی گھنٹی بج گئی، اٹھو" اُس نے کہا۔

سدھیر چونک پڑا۔ اُس نے کرسی کی پُشت کے ساتھ کھڑی امرتا کی طرف دیکھا اور مسکرا یا اور امرتا نے جھک کر اپنے رخسار اُس کے ٹھنڈے کالے بالوں پر رکھ دیئے اور تتلیوں کا ایک تیز قافلہ اُس کی پلکوں کو چھوتا ہوا سا گذر گیا۔ کچھ لمحوں کے لئے جیسے وہ ایک گہری دُھند میں بھٹک گئی جیسے پہاڑ کی کسی بہت اونچی چوٹی پر کھڑی ہو۔

امرتا مینٹل پیس پر بڑی بڑی موم بتیاں جلا رہی تھی۔

"آج دیوالی تو نہیں، موم بتیاں کیوں جلا رہی ہو؟"

"کوئی بھی رات دیوالی کی رات بن سکتی ہے"

"کیسے؟"

"ہر رات کو روشنی کی ضرورت ہوتی ہے"

"لیکن کمرے میں بجلی کا لیمپ جو جل رہا ہے"

"ابھی بُجھا دیتی ہوں اُسے۔"

یہ کہہ کر امرتا نے بجلی کا سوئچ آف کر دیا۔ بجلی کی تیز روشنی کے بعد موم بتیوں کی روشنی تو اُجلا سا اندھیرا بن کر رہ گئی اور مینٹل پیس کے پاس کھڑی امرتا ایک سایہ سا نظر آنے لگی۔

"تم کہاں ہو امرتا؟"

"سدھیر کے پاس"

"میرے پاس تو نہیں ہو تم"

"میں اُس روشنی کے پاس ہوں جو موم بتی کی لَو کی زندگی ہے۔ یہاں ہوں مینٹل پیس کے قریب"

سدھیر کرسی سے اُٹھ کر مینٹل پیس کے قریب آ گیا۔ موم بتیوں کی مدھم سی روشنی میں امرتا اور سدھیر کھڑے یوں لگ رہے تھے جیسے چاندنی رات میں دو مسافر پہاڑی پگڈنڈی کے کسی موڑ پر کھڑے نیچے وادی میں دُور دھبوں کی طرح نظر آتے ہوئے گھروں کو دیکھ رہے ہوں اور سوچ رہے ہوں کہ ان کا تو کوئی گھر بھی نہیں جس کا تصوّر وہ کر سکیں۔ وہ تو صرف مسافر ہیں جو منزلوں کی کھوج میں گھوم رہے ہیں۔

"مجھے موم بتیوں کی یہ روشنی بڑی پیاری لگتی ہے۔"

"کیوں؟" امرتا نے پوچھا۔

اور سدھیر نے امرتا کی آنکھوں کو بڑے دھیان سے دیکھا۔ آنکھوں کی پتلیوں میں بھی موم بتیاں جل رہی تھیں۔

"اس لئے کہ سندرتا بجلی کا لیمپ نہیں موم بتی کا گمبھیر اُجالا ہے جو وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔"

"تو حُسن لافانی نہیں؟"

"نہیں محبت لافانی ہے۔ حُسن کسی دیوتا کے مندر میں جلتی ہوئی جوت ہے اور محبّت آسمان کی وسعتوں میں چمکتا ہوا پورا چاند۔"

"تو تم چاند ہو؟"

"نہیں چاند تم ہو۔ میں آکاش ہوں۔" سدھیر نے جواب دیا۔ اُس کی آواز میں اس کا مخصوص بھاری پن اور لڑکھڑاہٹ تھی جیسے وہ نشے میں ہو۔

اور پھر چاند آکاش کے سینے پر جم گیا۔

امرتا کے ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی موم بتی تھی اور اُس کے سر کی پُشت سدھیر کے کندھے سے لگی تھی۔

اور موم بتیوں کی مدھم سی روشنی میں دونوں کے سائے دیوار پر ہلکورے لے رہے تھے جیسے جھیل کے پانی کی سطح پر تیر رہے ہوں۔

"تمہیں نوکرانی کو کرنی نہیں بلانا ابھی؟"

"نوکرانی ہے، اُسے میں نے دو روز کی چھٹی دے رکھی ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہیں پریشانی نہ ہو۔"

"تو کھانے کا کیا ہوگا؟"

"ابھی تیار کرتی ہوں۔"

"تم تیار کرو گی؟"

"ہاں۔"

امرتا کی بات سُن کر سدھیر نے زور کا قہقہہ لگایا۔

" ڈاکٹر امرتا سیٹھ کھانا بنائے گی ؟"

" کیا میں کھانا نہیں بنا سکتی ؟"

" کیوں مصیبت مول لیتی ہو۔ آؤ کسی ہوٹل میں کھا آئیں "

" ہوٹل میں کھا کھا کر جی نہیں بھرا تمھارا ، ایک روز گھر کا کھانا بھی کھا کر دیکھو ، ذائقہ بدل جائے گا "

امرتا یہ کہہ کر رسوئی گھر میں چلی گئی اور آگ جلانے لگی ۔ سدھیر کچھ دیر وہیں کھڑا رہا ۔ پھر کرسی پہ بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا ۔ سگرٹ سلگایا ہی تھا کہ آواز آئی ۔

" وہاں اکیلے کیا کر رہے ہو ، یہاں آ جاؤ نا "

سدھیر کمرے سے اٹھ کر رسوئی گھر میں آ گیا ۔ امرتا نے آٹا گوندھ ڈالا تھا اور اب آلو چھیل رہی تھی ۔

" لاؤ میں چھیل دوں "

" نہ بابا رہنے دو ۔ کہیں انگلی کاٹ لوگے اور مجھے پٹی کرنی پڑے گی "

" تو برتن دھو دوں ؟"

" نہیں ، بس میرے پاس بیٹھے رہو "

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے ۔ امرتا نے چولھے پر سبزی چڑھا دی تھی ۔

" اچھا سدھیر تمھیں کس قسم کی بیوی پسند ہے ؟"

" بیوی مجھے کسی بھی قسم کی پسند نہیں "

" کیوں ؟"

" میں شادی کو بالکل غیر ضروری انسٹی ٹیوشن سمجھتا ہوں ، قطعی طور پر ان بائیولاجیکل "

" یہ پروگریسو سدھیر بھائیہ بول رہا ہے ۔ میں اپنے سدھیر کی رائے پوچھ رہی ہوں " کتنا گہرا خلوص تھا اس کی آواز میں ۔

" اپنے سدھیر کو تو اپنی ہی امرتا پسند ہے اور کوئی نہیں "

دونوں رسوئی گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر کھانا کھا کر واپس کمرے میں آ گئے ۔

" تم کامیاب بیوی بھی بن سکتی ہو "

" شکریہ " امرتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔

" اچھا اب کیا پروگرام ہے ؟"

" اب ؟" امرتا نے ایک بھرپور نظر سدھیر کے چہرے پر ڈالی ۔ ایک بڑی مہربان قسم کی نگاہ ۔

" ہاں "

اب آتش دان میں آگ جلاتی ہوں ، پھر آگ تاپیں گے اور باتیں کریں گے "

"لیکن یہاں تو کوئی زیادہ سردی نہیں۔"
"تم آئے ہو تو آج آتش دان میں آگ ضرور جلے گی۔"
"پھر نہیں جلے گی کیا؟"
"جب تم دوبارہ آؤ گے تب پھر جلے گی۔ جب تک تو اس کی گرمی کافی ہوگی۔"
یہ کہہ کر امرتا نے آتش دان میں لکڑیاں ترتیب سے رکھنا شروع کر دیں۔ سدھیر اُسے بغور دیکھتا رہا۔
"اب انھیں آگ دکھا دو۔" امرتا نے سدھیر سے کہا۔
"تم ہی دکھا دو نا۔"
"نہیں یہ کام مردوں کا ہوتا ہے۔"
"اب تو بڑی گیان دھیان کی باتیں کرنے لگی ہو۔"
"تمھاری طرح بدھو تھوڑی ہوں۔" امرتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
سدھیر نے لکڑیوں کو آگ دکھا دی اور امرتا نے دو کرسیاں آتش دان کے قریب کھینچ لیں۔
دونوں بیٹھ گئے۔

سدھیر نے سگرٹ سلگا لیا اور امرتا نٹ کرنے لگی۔ چلغوزوں اور ریوڑیوں کی پلیٹ درمیان میں رکھی تھی۔ کبھی کبھی دونوں اُس میں سے کچھ اٹھا بھی لیتے۔ امرتا اُسے اس نئی جگہ کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتی رہی۔ وہاں کا اسپتال، دوسرے ڈاکٹر، سول سرجن، نرسیں، اپنے ماحول کی پوری تفصیلات سمجھا رہی تھی۔ اُسے جن جن لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا اُن کی ذہنی بناوٹ، اُن کے نظریے، اُن کے خیالات اور وہ لطیفے سنا رہی تھی جو چوتھے درجے کے ملازموں نے دو ایک ڈاکٹروں کے بارے میں گھڑ رکھے تھے۔

آتش دان میں لکڑیاں جلتی رہیں، امرتا نٹ کرتی رہی، اور باتیں ہوتی رہیں۔ سدھیر کم بولا۔ زیادہ باتیں امرتا ہی نے کیں۔ وہ سگرٹ پیتا رہا اور آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ کئی لمحوں تک دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ کمرے کی خاموش فضا میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی اور موم بتیوں کا اُجالا کانپ اٹھتا تھا۔ لمحات گذرتے گذرتے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں کوئی کسی سے کچھ کہنا نہ چاہتا تھا۔ دونوں خاموش رہنا چاہتے تھے، اور سوچنا چاہتے تھے اور پل بھر کے لئے اپنے آپ میں کھو جانا چاہتے تھے۔

سدھیر نے انگلیوں میں پکڑے سگرٹ کے ٹکڑے کا آخری کش لیا اور اُسے آتش دان میں پھینک کر کرسی سے اٹھا۔ ایک بھرپور انگڑائی لی اور اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ امرتا بغیر اُس کی طرف دیکھے نظریں جھکائے نٹ کرتی رہی اور اپنے آپ میں کھوئی رہی۔ سدھیر تھوڑی دیر بستر میں لیٹا چھت کی کڑیاں دیکھتا رہا، پھر اُس نے کروٹ لے لی۔

امرتا نے اب نظر گھما کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے اُون اور سلائیاں ایک طرف ڈال دیں اور پھر اُس نے شال اوڑھی اور باہر صحن میں چلی گئی۔ پورنیما کے کئی روز بعد کا چاند آسمان میں اُبھر آیا تھا۔ وہ کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی اور پھر اندر لوٹ آئی۔

"موم بتیاں بجھا دوں؟"

"نہیں جلتی رہنے دو۔"

سدھیر نے امرتا کی بات سنی اور بغیر کروٹ بدلے ہی جواب دے دیا۔ وہ ابھی تک سویا نہیں تھا۔ امرتا بھی اپنے بستر میں لیٹ گئی۔ آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں اور موم بتیوں کی روشنی نے کچھ اس قسم کی فضا بنا ڈالی تھی جیسی کہ مارچ کے آخری دنوں میں بیلوں سے گھرے ہوئے کسی کنج میں دوپہر کے سمے ہوتی ہے۔ کچھ کچھ گرم، اندھیری اور نشہ آور۔ آدھی رات کے ابھرا امرتا کے گھر میں آج دوپہر کی سی کیفیت چھا رہی تھی۔ امرتا کچھ دیر کے بعد سو گئی۔

موم بتیاں ایک ایک کر کے بجھنے لگیں۔ سدھیر جاگ رہا تھا۔ آخری موم بتی بجھی تو اس نے جانا کہ اب رات ہوئی تھی۔ دسمبر کی طویل رات اور مارچ کی دوپہر کا یہ میل بہت حسین تھا۔

امرتا صبح بہت جلدی بستر سے اٹھ گئی۔ آج یہ نئی بات تھی، ورنہ اتوار کو وہ اکثر دیر تک بستر میں پڑی رہتی تھی اور اس وقت تک نہ جاگتی تھی جب تک اس کی چھینی نرس سویٹ نائٹ ان گیل آ کر اسے راؤنڈ کی یاد نہ دلاتی تھی۔

جب وہ غسل خانے میں نہانے گئی تو سدھیر آرام سے سو رہا تھا۔ قریب آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ کمرے میں آئی وہ جب بھی سو رہا تھا۔ امرتا نے اسے جگایا نہیں۔ وہ رسوئی گھر میں چلی گئی۔ اس نے آگ جلائی۔ چائے کے لئے پانی رکھا۔ صحن میں لگی چنبیلی کی بیل سے تازہ کھلی ہوئی شبنم سے بھیگی کلیاں توڑیں اور دیر تک انھیں دونوں ہاتھوں میں رکھ کر سونگھتی رہی۔

سدھیر اب بھی سو رہا تھا اور سورج نکل آیا تھا اور دسمبر کی ایک نکھری ہوئی صبح نے رات کے زانو پر رکھا ہوا اپنا سر اٹھا لیا تھا۔

امرتا نے چائے کا سامان تیار کر لیا، اسے ٹرے میں رکھا اور ایک پلیٹ میں چنبیلی کے تازہ پھول سجا دیئے۔ سدھیر کے پلنگ کے قریب تپائی رکھی اور چائے کی ٹرے اس پر رکھ دی۔ دودھ کے برتن سے گرم گرم دودھ میں سے نکلتی ہوئی بھاپ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ اسے اس سارے سامان میں کسی چیز کی کمی نظر آ رہی تھی۔ اس نے سدھیر کے سرہانے کے نیچے سے گولڈ فلیک کا پیکٹ اور ماچس بھی نکال کر تپائی پر رکھ دیئے۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ کوئی چیز اب بھی کم تھی۔ اتنے میں اخبار والے کی آواز آئی اور امرتا فوراً بھاگ کر صحن میں چلی گئی۔ جیسے جس چیز کی کمی تھی وہ اسے مل گئی تھی۔ اخبار ہاتھ میں لئے وہ سوچ رہی تھی کہ سدھیر کا نوکر صبح چائے کے ساتھ تازہ اخبار بھی تپائی پر رکھتا ہو گا۔ اس نے اخبار کے پہلے صفحے کو سرسری طور سے دیکھا۔ وجے لکشمی پنڈت کی تصویر تھی۔ وجے لکشمی پنڈت اسے بڑی باوقار شخصیت کی عورت لگتی تھی۔ اس کے چاندی کی طرح اجلے بال اور چہرے پر پھیلی ہوئی ہلکی سی روشنی اس کی شخصیت کو وقار اور دلکشی دیتے تھے۔ مسز پنڈت کے لئے امرتا کے دل میں ایک طرح کا ہیرو ورشپ والا جذبہ تھا۔ اس نے اخبار تہہ کر کے تپائی پر رکھ دی۔

"پروفیسر صاحب چائے" امرتا نے بڑے ادب سے سرہانے کی طرف کھڑے ہو کر کہا۔ سدھیر کا نوکر صبح اسے اسی طرح جگاتا ہو گا۔ وہ سوچنے لگی۔

"پروفیسر صاحب ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں" امرتا نے دوبارہ کہا۔ سدھیر کا نوکر اس کے نہ جاگنے پر ایسا بھی کہتا ہو گا

وہ ضرور کہتا ہوگا جیسے ابھی تو سدھیر نے کروٹ سے کر آنکھیں ملنا شروع کر دی تھیں۔ اُس نے امرتا کو اپنے سامنے نہا دھو کر تیار کھڑے دیکھا تو حیران ہو گیا۔

"یہ کیا؟"

"چائے ہے۔"

"تم اتنی جلدی تیار ہو گئیں، کہیں جانا ہے کیا؟"

"نہیں تو۔"

"اتنی جلدی کیوں جاگ گئیں؟"

"عورت کو مرد سے پہلے جاگنا چاہیئے۔ ایسا ہی لکھا ہے ہمارے شاستروں میں۔" امرتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر سدھیر ہنس دیا۔ اُس نے تکیے کے نیچے رکھے سگرٹ کے پیکٹ کو ٹٹولنا چاہا تو امرتا نے تپائی سے پیکٹ اُٹھایا۔ اُس میں سے سگرٹ نکال کر سدھیر کو دیا اور پھر جلایا بھی خود ہی۔

"اخبار اور چائے بھی حاضر ہے" امرتا نے کہا۔

"میرا نوکر بالکل ایسا ہی کرتا ہے" یہ سن کر جیسے امرتا کو دھکا سا لگا ہو۔ جانے کیوں وہ یہ بات سدھیر کے مُنہ سے سننا نہ چاہتی تھی۔

"لیکن وہ چنبیلی کے پھول تو پیش نہیں کرتا" اُس نے تازہ پھولوں کی بھری ہوئی پلیٹ اُٹھا کر سدھیر کے سامنے کر دی۔

"یہ کوئی بھی نہیں کر سکتا، صرف امرتا ہی کر سکتی ہے" سدھیر نے جواب دیا۔

امرتا بنا کچھ کہے اُس کے سرہانے کے قریب پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور پیالوں میں چائے کا پانی ڈالنے لگی۔ ایک پیالی اُس نے سدھیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اخبار پڑھ کر سناؤں؟"

"سناؤ۔"

امرتا اخبار پڑھ کر سنانے لگی اور اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اُس کی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ چائے بڑے سکون سے ٹھنڈی ہوتی رہی۔ سدھیر بڑے مزے سے سگرٹ پیتا رہا اور امرتا بڑے اطمینان سے اخبار پڑھتی رہی۔

اور پھر وہ پھر اُٹھ گئی اور سدھیر صحن میں بستر جما کر لیٹا رہا اور ڈیفن ڈی ماریر کا نیا ناول پڑھتا رہا۔ ڈی ماریر کے ناول اُسے پسند تھے۔ امرتا دوپہر کے کھانے میں لگی تھی۔ ایک بار اُس نے رسوئی گھر سے آواز دے کر کہا۔

"شیو کا سامان لا دوں؟"

"نہیں۔"

وہ پھر اپنے کام میں لگ گئی اور سدھیر ناول پڑھتا رہا۔ کچھ لمحے اور گذر گئے۔

امرتا باہر آئی۔

" نہاؤ، کھانا تیار ہے "

" نہانا کیا ہے، ٹھیک ہے ایسے ہی "

" عجیب آدمی کس قسم کے آدمی ہو تم "

" جانتی نہیں ہو، تمھارا مہمان ہوں "

" مان نہ مان ــــــ " امرتا نے کتاب اُس کے ہاتھ سے کھینچ لی، اُسے کندھوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور غسل خانے میں دھکیل دیا۔ مگر وہ خدا کا بندہ بھی تو آدمی کسی نمبر وَن تھا۔ ہاتھ منہ دھوکر ہی باہر نکل آیا۔ نہایا نہیں۔

" بھوک لگ رہی ہے، کھانا لاؤ "

" نہا بھی چکے تم "؟

" اور کیا نہیں، مردوں کا نہانا ایسا ہی ہوتا ہے "

" یہی تو اصل مردانگی ہے "

دونوں زور سے ہنس دیئے۔

دوپہر کی نیم گرم دوپہر میں دونوں کے زندگی بخش قہقہے بڑے پیارے انداز سے گونجے۔

انھوں نے کھانا ختم کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ امرتا باہر گئی۔

کوئی کیس تھا۔ کسی گاؤں سے دو آدمی لیڈی ڈاکٹر کو ساتھ لے جانے کے لئے آئے تھے۔ امرتا نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ مصروف تھی، نہیں جا سکتی تھی۔ دونوں آدمی، جن میں سے ایک بیمار عورت کا خاوند اور دوسرا اُس کا بھائی تھا منت سماجت کر رہے تھے۔

"بھائی کہہ جو دیا آج میں فارغ نہیں ہوں" امرتا فیصلہ کن انداز سے جواب دیتی ہوئی دروازے سے لوٹ آئی۔

" کیا بات ہے "؟ سدھیر نے پوچھا۔

" کچھ نہیں "

دونوں آدمی اب صحن میں آ گئے تھے۔

" کیا قصہ ہے بھائی "؟

" میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے، اُس کی حالت بہت خراب ہے " عورت کا خاوند بولا۔

" اسپتال میں ہے وہ کیا "؟

" نہیں جی گاؤں میں ہے "

" کتنی دور ہے تمھارا گاؤں "؟

" دس میل " اب کی عورت کے بھائی نے جواب دیا۔

" کہہ جو دیا میں نہیں جا سکتی " امرتا سخت لہجے میں بولی۔

"جاؤ تم لوگ تانگہ لے آؤ۔" سدھیر نے دونوں سے کہا اور اُن کی جان میں جان آگئی۔ اُنھیں لگا جیسے ڈوبتی نیا سنبھل گئی تھی۔ وہ فوراً دروازے سے باہر نکل گئے۔ مہمان میزبان کے گھر میں حکم چلا رہا تھا۔

"تمام دن برباد ہو جائے گا سدھیر۔"

"کسی کی زندگی برباد ہو جائے گی امرتا، ایک دن سے ایک زندگی کہیں زیادہ اہم ہے۔"

"مجھے تو اِن لوگوں نے پریشان کر رکھا ہے۔"

"تمھیں تمھاری فیس دیتے ہیں، مفت تو نہیں لے جاتے۔"

"خاک فیس دیتے ہیں۔"

"ڈاکٹر کا کام بڑا مقدس کام ہے امرتا۔ تم لوگ خوش قسمت ہو جو دُکھ درد کے ماروں کی خدمت کرتے ہو۔"

"یہ فلاسفروں کی باتیں ہیں، حقیقت سے ایک دم دُور۔"

"تمھارے جذبات تمھارا راستہ روک رہے ہیں امرتا۔ تمھیں جذبات سے زیادہ انسانوں کی زندگیوں کا خیال کرنا چاہیے محتاج اور ضرورت مند لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ان کی خدمت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ یہی میری سیکھ ہے۔"

امرتا کچھ نہیں بولی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُبھر آئے۔ بڑا آیا سیکھ دینے والا۔ خود مزے کرتا ہے، دوسروں کو سبق دیتا ہے۔ سنکی کہیں کا۔

اتنے میں گاؤں کے آدمی تانگہ لے آئے اور امرتا ضروری سامان لے کر نرس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اُس نے سدھیر سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ جب تک تانگہ اسپتال کے احاطے سے باہر نہ نکل گیا وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اور پھر اندر چلا آیا۔

تانگہ کچھ دیر پکی سڑک پہ چلنے کے بعد کچی سڑک پہ آ گیا۔ ہچکولے لگ رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر نرس اور بیمار عورت کا بھائی بیٹھے تھے۔ عورت کا خاوند سائیکل پہ تانگے کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ڈاکٹر بیٹھی تھی۔ اس سائیکل والے سے اُسے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ یوں سفر طے کر رہا تھا جیسے اُس کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح کُڑھتی رہی۔ نرس نے دو ایک بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن ماحول سازگار ثابت نہ ہوا۔ اُس نے بھی کوشش چھوڑ دی۔ گاؤں آنے تک امرتا اپنے آپ میں جلتی رہی حالانکہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس سے زخموں کو آرام ملتا ہے۔ لیکن اُس کے زخم اور بھی زیادہ جلنے لگے تھے۔

کیس خاصا سیریس تھا۔ جس لمحہ اُس نے کیس ہاتھ میں لیا وہ فوراً سدھیر سے پیار کرنے والی امرتا سے لیڈی ڈاکٹر امرتا سین بن گئی۔ وہ اپنی سب کمزوریوں، اُلجھنوں اور پریشانیوں کو بھول گئی اور اپنے کام میں اس طرح جُٹ گئی جیسے وہ اوپریشن تھیئٹر میں کھڑی مریض کا اوپریشن کر رہی ہو، ایک دم سنجیدہ، گمبھیر، شانت اور بیدار۔

اور جب ڈیلیوری کے بعد نرس نے بچے کا جسم گرم پانی سے صاف کر کے ڈاکٹر کو دکھایا تو اپنی عادت کے مطابق وہ مسکرا دی، ویسے ہی جیسے وہ میٹرنٹی وارڈ میں نوزائیدہ بچوں کے سرخ ہونٹوں کو دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی۔ اُسے ویسا ہی پُرخلوص احساس ہوا جو اُسے ایسے لمحوں میں ہوا کرتا تھا۔ اُس کے من سے ساری جلن اور کُڑھن کافور ہو گئی اور سدھیر کا چہرہ ایک دم اُس کی آنکھوں

کے سامنے گھوم گیا اور وہ مہر چند کے لئے دوبارہ ڈاکٹر سیٹھ سے امرتا بن گئی جس کا محبوب گھر میں اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

بیمار عورت، اُس کا خاوند، اُس کا بھائی اور گھر کے دوسرے سب لوگ خوش تھے لیکن یہ ناداروں اور غریبوں کی خوشی تھی جن کے پاس مسرت آتی ہے تو بہت سے غموں میں گھری ہوئی، ایک دم سہمی اور گھبرائی ہوئی جیسے کوئی زخمی ہرنی بہت سے شکاریوں کے جنگل میں ہو۔

امرتا نے یہ سب آج بھی محسوس کیا۔ آج پہلی بار جب سدھیر نے اُسے ڈانٹا تھا اور اپنے فرض کا احساس دلایا تھا۔ اور جب عورت کے خاوند نے دس دس کے پانچ نوٹ امرتا کی طرف بڑھائے تو اُس نے مسکراتے ہوئے روپے لینے سے انکار کر دیا اور تانگے میں بیٹھ گئی۔ امرتا تانگے کا کرایہ بھی اُس نے خود دیا۔ نرس نے جب اس پر حیرت کا اظہار کیا تو وہ خاموش رہی۔ اُسے سمجھانے میں سکون کی وہ دولت جو اُس نے اِن جانے میں بٹوری تھی، کھوئی نہیں۔

جب وہ واپس ہسپتال پہنچی تو سات بج رہے تھے اور اندھیرا ہو گیا تھا۔

امرتا کے جانے کے بعد سدھیر کچھ دیر بستر میں پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر اندر چلا گیا۔ کل والے دھوپ کے خوبصورت ٹکڑے نے جب آج بھی آگے بڑھ کر اُس کا ماتھا چوما تو اُسے لگا جیسے امرتا نے اپنے پتلے پتلے گرم ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے تھے۔ یہ احساس اُسے بہت پیارا لگا۔

کمرہ صاف نہیں کیا گیا تھا۔ سگرٹوں کے جلتے جلتے بجھے ہوئے ٹکڑے ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ وہ سگرٹ کے آخری حصے کو ایش ٹرے میں نہیں پھینکتا تھا۔ ایش ٹرے کے استعمال کو وہ سگرٹ کے وقار کی توہین سمجھتا تھا۔ تپائی پر رکھی ایش ٹرے خالی تھی اور سگرٹوں کے ٹکڑے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پژمردہ پھولوں کی طرح فرش پر بکھرے پڑے تھے۔

کرسی میں آرام سے بیٹھے اور سگرٹ پیتے ہوئے اُس نے سوچا کہ اُسے اب زیادہ دیر یہاں نہ رکنا چاہیئے۔ آج تو خیر اتوار تھا امرتا کو زیادہ مصروفیت نہ تھی لیکن کل صبح ہی اُسے کام کرنا ہوگا۔

وہ اگر یہاں رہے گا تو امرتا دل جمعی سے کام نہ کر سکے گی اور کئی مریض جنہیں اُس کی ضرورت ہے اُس کی توجہ سے محروم رہ جائیں گے۔ امرتا کے چلے جانے کے بعد اُس نے خود بھی سوچا تھا کہ وہ نہ ہی جاتی تو اچھا تھا۔ چار پانچ گھنٹے اکیلا رہ کر اُسے بے حد کوفت ہوئی تھی لیکن یہ اُس کا اپنا قصور تھا۔ امرتا اُس کی محبوبہ سے الگ بھی کچھ تھی اور اُس کا یہ دوسرا روپ زیادہ اہم اور سماج کیلئے کہیں زیادہ ضروری تھا۔ وہ اُس کے راستے میں کھڑا ہو کر اُسے سماج تک پہنچنے سے روک رہا ہے۔

اُس نے ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھا۔ آخری گاڑی نو بجے چھوٹتی تھی۔ وہ جا سکتا تھا۔ جب تک امرتا بھی واپس آ جائے گی ابھی تو ساڑھے چھ ہی بجے تھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ ایک دم اٹھا۔ اُس نے شیو کی، پھر بستر باندھا، ہاتھ منہ دھویا، کپڑے پہنے اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے کچھ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ اُس نے چاہا کہ وہ آتش دان میں لکڑیاں سلگائے لیکن یہ ذرا پریشانی والا کام تھا اُس سے نہ ہو سکے گا۔ اُس نے بجلی کا ہیٹر جلا لیا اور اُس سے ہٹ کر کرسی میں بیٹھ کر سگرٹ پینے لگا۔

— — — — — — —

امرتا جب کمرے میں داخل ہوئی تو سارا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ سدھیر بالکل تیار بیٹھا تھا۔ اُس نے امرتا کے لئے کرسی

گھسیٹی اور بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"کیس کیسا رہا امرتا؟"

"سب ٹھیک ہو گیا؟"

"کتنے روپے بنائے ہیں؟"

"گنوائے ہیں پانچ روپے"

"وہ کیسے؟"

"تانگے کا کرایہ بھی خود دیا ہے"

"وہ کیوں؟" سدھیر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ غریب لوگ تھے۔ اُن کے پاس روپے نہیں تھے، وہ روپے میں لے لیتی تو بیمار عورت کے لئے کچھ نہ بچتا، وہ دودھ تک کو ترستی رہتی" امرتا نے جواب دیا۔

"تو تم اس طرح بھی کیا کرتی ہو؟" سدھیر نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا اور امرتا نے سدھیر کی خوشی کو ایک دم محسوس کر لیا۔ وہ تو اُس کے ہر جذبے کو جان جاتی تھی۔

"آج پہلی بار ایسا کیا ہے" اور امرتا نے جھک کر سدھیر کے پاؤں چھُو لئے اور سدھیر کو محسوس ہوا کہ یہ لمحہ بڑا نازک تھا۔ وہ پگھل بھی سکتا تھا اور جم کر فولاد بھی بن سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں رُک گیا تو لمحہ پگھل جائے گا اور لمحے جب پگھلتے ہیں تو وہ بہہ جاتے ہیں۔ وہ چلا گیا تو وہ لمحہ ایک چٹان بن کر امرتا کو سہارا دے گا۔ اُس نے امرتا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کھینچا اور بڑے پیار سے اُس کی طرف دیکھا۔

"بہت تھک گئی ہو گی؟"

"نہیں، اب عادی ہو گئی ہوں" پل بھر کو وہ رُکی اور پھر بولی "تم نے چائے بھی تو نہیں پی؟"

"نہیں"

امرتا نے چائے کا پانی ہیٹر پہ رکھ دیا اور تپائی پر چائے کا سامان لگا دیا۔ تھوڑی دیر میں چائے تیار ہو گئی۔

چائے پیتے ہوئے اُس کی نظر ہولڈال پہ پڑی۔

"ارے یہ بستر کیوں باندھ لیا تم نے؟"

"جاؤں گا نو بجے کی گاڑی سے"

"کیوں؟"

"صبح کالج میں حاضری ہے"

"رُک نہیں سکتے کیا؟" امرتا نے نظریں اُٹھا کر پوچھا۔ اُسے یہ خیال تھا کہ سدھیر ناراض ہو کر جا رہا تھا۔ کاش وہ اُس کے کہنے پہ بھی گاؤں میں جانے سے انکار کر دیتی۔

"جانا ہی ہوگا" نازک لمحہ یقیناً پگھل جاتا اگر سدھیر فوراً ہی جواب نہ دے دیتا اور جذباتی پن میں سوچنے لگ جاتا۔

کئی لمحوں تک دونوں خاموش رہے۔

سدھیر نے محض خاموشی کو توڑنے کے لئے کہا۔

"پیکٹ میں آخری سگرٹ رہ گیا ہے، اسے تو جلا دو امرتا" اُس نے پیکٹ سے سگرٹ نکالا، کر اپنے ہونٹوں میں لے لیا اور ماچس امرتا کی طرف بڑھائی۔

امرتا نے ماچس لے لی اور ساتھ ہی سدھیر کے ہونٹوں سے سگرٹ بھی کھینچ لیا۔ فرش پر گرے خالی پیکٹ کو اٹھایا۔ سگرٹ کو بڑے پیار سے اُس میں رکھا اور پیکٹ اور ماچس کو اپنے سامنے رکھ لیا۔

"یہ آخری سگرٹ نہیں جلے گا" امرتا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اُس نے کلائی گھما کر گھڑی کی طرف دیکھا، آٹھ بج رہے تھے۔ نو بجے گاڑی چھوٹتی تھی۔ سدھیر اُس گاڑی سے جا رہا تھا۔ وہ اگر نہ جانے دے تو وہ رُک بھی سکتا ہے۔ آج کی رات بھی آتش دان میں لکڑیاں سلگ سکتی ہیں، ہینڈل پیس پر شمعیں جل سکتی ہیں اور دوپہر کی سرد طویل رات میں مارچ کی نیم گرم دوپہر کا احساس ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسے نہیں روکے گی۔ جس جس محاذ پر سدھیر کو جیتنا چاہیئے تھا وہاں اُس نے خود ہی ہار مان کر اُسے جتا دیا تھا لیکن اس محاذ پر وہ نہیں ہارے گی کیونکہ یہاں سدھیر کو ہارنا چاہیئے اور وہ اس لمحے جیت کے نشے میں چُور ہو کر ہارنے کی نعمت کو ٹھکرا رہا تھا۔ وہ بھول میں ایسا کر رہا تھا یا جان بوجھ کر یہ تو امرتا نہیں جانتی تھی لیکن جب وہ اس بات پر تُلا ہی تھا تو وہ کیوں دخل دے۔ وہ خود اب کسی کی ہمت میں نہیں ہارے گی۔

اور وہ نہیں ہاری اور تانگہ آ گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پرے سمٹے اس پر بیٹھ گئے اور اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ پلیٹ فارم پر گھومتے ہوئے وہ یوں لگ رہے تھے جیسے دو خاموش بُت اسٹیشن کی زرد روشنی میں بے مقصد چکر لگا رہے ہوں۔

گاڑی آ گئی۔ قلی نے سامان ڈبے میں رکھ دیا۔ سدھیر ڈبے میں داخل ہو کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ امرتا پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ کھڑکی کی سلاخ پر ٹکا تھا۔ پلیٹ فارم پر انسانی زندگی کا دریا پورے جوش سے رواں تھا۔ یہاں ایک کونے میں دو انسان ایک ویران جزیرے میں تنہا، خاموش اور اداس کھڑے تھے۔

انجن نے سیٹی دی۔

"امرتا!" سدھیر نے آہستہ سے پکارا۔

امرتا نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"تم ناراض ہو؟"

"ہاں!" اب اُس نے جواب دیا اور اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں یہ جانتا ہوں، لیکن جان بوجھ کر جا رہا ہوں۔ اس کی وجہ واپس پہنچ کر لکھوں گا۔"

"اب کیوں نہیں بتاتے ؟"

"لمحہ فولاد نہ بن سکے گا، امرتا !"

اور وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ پیشتر اس کے کہ وہ چرٹ بھری آواز میں اُس سے کچھ پوچھتی گاڑی کے پہیے حرکت میں آگئے امرتا کو ہلکا سا دھکا بھی لگا اور پھر سدھیر نے ذرا سا نیچے جھک کر اُس کے ہاتھ کی پشت کو چوم لیا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

امرتا کی آنکھوں میں دسمبر کی صبح کی گہری دھند تھی اور اُس کے ہونٹوں پر چاندی کا نکھار تھا۔

زندگی کا دریا کچھ پُرشانت ہو گیا تھا لیکن امرتا ابھی تک اُسی ویران جزیرے میں کھڑی تھی جہاں سے اُس کا ساتھی ابھی ابھی اُڑان بھر کر آسمان کی وسعتوں میں تحلیل ہو گیا تھا۔

جب وہ گھر واپس پہنچی تو دس بج چکے تھے۔ اُسے بھوک لگ آئی تھی لیکن کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا لگنے سے اُسے کچھ سردی لگنے لگی تھی۔ اُسے خیال آیا کہ وہ آتش دان میں لکڑیاں جلا لے اور آگ تاپے۔ لیکن وہ تو اب اُسی رات جلیں گی جس رات سدھیر یہاں آئے گا۔ پھر اُس نے سوچا بجلی کی تیز روشنی بجھا کر مینٹل پیس پر موم بتیاں ہی جلا لے۔ کل کی موم بتیاں ابھی تک رکھی ہیں۔ لیکن یہ موم بتیاں بھی تو اب جبھی جلیں گی جب سدھیر آئے گا۔

اُس نے ہیٹر کا سوئچ آن کیا اور بستر پر گر گئی۔

— — — — —

بہت دیر بستر میں پڑے رہنے کے بعد جب پولیس لائن کے گھڑیال نے بارہ بجائے تو وہ اُٹھی۔ اُسے زور کی پیاس لگ رہی تھی۔ رسوئی میں جا کر اُس نے پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس پیا اور اُس کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ کمرے میں واپس آ کر آرام کرسی میں بیٹھ گئی۔ تپائی پر چائے کے خالی برتن یوں پڑے تھے جیسے مسافروں کے چلے جانے کے بعد سرائے کے کمرے کھلے پڑے ہوں۔ ایک کونے میں گولڈ فلیک کا پیکٹ اور ماچس رکھی تھی۔ وہ کچھ لمحے پیکٹ کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس کا ہاتھ پیکٹ کی طرف بڑھا۔ اُس نے اُسے کھولا اور اُس میں پڑا آخری سگرٹ نکالا۔ اُس کے سرے پر جیسے ابھی تک سدھیر کے گیلے ہونٹوں کی نمی موجود تھی۔ سدھیر کے ہونٹ ہمیشہ نم آلود رہتے تھے اور بڑے سُرخ لگتے تھے جیسے پوپی کے پھول ہوں جنھیں چُومنے سے نیند آنے لگے۔ سدھیر کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے اُسے ہر بار یہی احساس ہوتا تھا کہ اُسے نیند آنے لگی ہے، وہ اونگھنے لگی ہے اور اس کی آنکھوں میں خوابوں کے بجرے تیرنے لگے ہیں۔

اُس نے سگرٹ کے آخری حصے کو ایک بار غور سے دیکھا اور اُسے محسوس ہوا کہ دسمبر کی طویل رات اور مارچ کی نیم گرم دوپہر آپس میں گلے مل رہی تھیں۔ اُس نے سگرٹ کو اپنے ہونٹوں میں دبا لیا جیسے وہ پوپی کے پھول کی پنکھڑیاں چومنے لگی ہو۔ اُس نے ماچس سے دیا سلائی نکال کر جلائی اور سگرٹ سلگا لیا۔ پہلا کش زور سے لینے سے اُسے کھانسی آ گئی۔ وہ خاصی بیدردی سے کھانسی اور پھر اُس نے سگرٹ کے دو ایک کش اور لئے۔ ذرا دھیمے پن سے۔ اب بات بن گئی تھی۔ اُس نے کرسی پر پاؤں پھیلا دیئے۔ ہیٹر کی گرمی اُس کے ٹھنڈے پاؤں میں سرایت کرنے لگی۔ اُس کے ہونٹوں سے پوپی کے پھولوں کی جلتی ہوئی پنکھڑیوں

کا دھواں نکل کر فضا میں لہرانے لگا۔ جیسے سدھیر کے بال ایک دم بکھیر دینے سے لہرا جاتے تھے۔ اُس نے آنکھیں موند لیں۔ جیسے اُسے نیند آ رہی تھی۔ جیسے اُسے خوابوں کے جزیرے سے کوئی بلا رہا تھا، جیسے سرد اور خاموش رات میں کہکشاں کی چوٹی پر کھڑا کوئی اُسے اشارے کر رہا تھا۔

اُسی لمحہ گاڑی ہاپڑ اسٹیشن پر رُکی تھی اور سُدھیر ڈھیر سارے صفحوں کا ایک پلندہ لفافے میں ٹھونس کر آر۔ ایم۔ ایس میں ڈال رہا تھا۔ جنھیں وہ اب تک لکھتا رہا تھا اور اُن میں لمحوں کے فولاد بن جانے کی بات کہتا رہا تھا۔ لمحے جو جم جائیں تو پہاڑ بن جایا کرتے ہیں۔

زاویے

ابوسعید قریشی

وہ کہا کرتا:

"دنیا زاویوں کا کھیل ہے۔ دیکھنے والی آنکھ کا معجزہ۔ نگاہ و نظر کے زاویے! یہ فاصلے یہ قرب، یہ ہجر و وصال کی کیفیتیں، جمالیات کا علم، تناسب کی سائنس، حسن و قبح کے پیمانے۔ سب کے سب دیکھنے والی آنکھ کے اندر پوشیدہ ہیں۔ فلسفے کے دفتر، شاعروں کی بیاضیں، نگارخانوں کی دیواریں، آثار قدیمہ کا جادو۔ سائے کے سائے —— اور انسان۔ آدم و حوا کے بیٹے سبھی!......

"بدصورت سے بدصورت اور ذلیل سے ذلیل آدمی کا بھی ایک حسین پہلو، ایک جمالیاتی زاویہ ضرور ہوتا ہے۔ ایک ہمیں کو اس کے دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔"

بات کرتے وقت وہ مخاطب کے قریب آجاتا۔ جیسے یہ راز صرف اسی کو بتا رہا ہے۔ اُس کی باتیں پھر میرے کانوں میں گونج اٹھیں۔ تانبے سی آواز جو بات ختم ہونے کے بعد بھی دیر تک فضا میں معلق رہتی۔ —— اور وہ جیتا جاگتا میرے سامنے آگیا —— سانولا رنگ، چوڑا ماتھا۔ بکھرے بال جیسے ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے۔ کالر کا بٹن کھلا ہوا، نکٹائی ڈھیلی گویا گرہ باندھنی نہیں جانتا۔ چال جیسے راہوں میں بادل بکھرے ہیں۔ دروازہ کھلا ہو تو بھی دستک دینا اس کا دستور تھا۔

میری ملاقات اُس سے ظفر ربانی فلم کمپنی کے سٹڈیو میں ہوئی جس نے مجھ سے رائٹر ڈائریکٹر کی حیثیت سے کانٹریکٹ کیا تھا۔ جب میں پہلے روز اپنے ڈیسک پہ بیٹھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔

"میرا نام پہ دیبز ہے۔ میں یہاں کیمرہ مین ہوں۔" اس یونٹ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ سا پڑھا لکھا رائٹر ڈائریکٹر اس کو مل گیا۔ میں آپکا دیرینہ مداح ہوں۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ڈائریکٹر کی خوشنودی ہر فوٹوگرافر کو منظور ہوتی ہے۔ رسمی شکریہ ادا کیا۔ لیکن اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"میں نے آپ کے سبھی فلم دیکھے ہیں اور سبھی افسانے پڑھے ہیں۔ سب زاویوں کا قصہ ہے۔ ورنہ حادثات کی اس دنیا میں ہر کوئی فن کار ہوتا۔ ایک اُسی افسانے کو لیجیے جس میں کوزہ گر فنی تخلیق کے درد و کرب اور کامرانی کی علامت بن گیا ہے۔ بظاہر مٹی کے پیالے میں کیا رکھا ہے؟ کمہاروں کی بستیوں میں کروڑوں بنتے ہیں اور لاکھوں ٹوٹتے ہیں۔ ابھی اگلے ہی روز میں ٹیکسالی، مونچھ ڈرد

اور ہڑپہ کی زیارت سے لوٹا ہوں۔ قدم قدم پر ٹھیکریوں کے انبار ملتے ہیں۔ لیکن ان ٹھیکریوں کو جوڑ کر مٹی ہوئی تہذیبوں کا نمائندہ بنا دینا۔ اس کے لیے کسی مارشل اور دہیلر ہی کی ضرورت تھی۔ ادھر افسانے میں یہ کام آپ کر رہے ہیں۔ تہذیبی روایات کی ٹھیکریوں کو جوڑنا سہل نہیں۔ آپ کا کوزہ گر حافظ و خیام، میر و غالب کا سجادہ نشین ہے۔ ورنہ مٹی کا خمیر تو روز ہی اٹھتا ہے اور چاک چاروں پہر گھومتے ہیں۔ پہلے کیوں کسی افسانہ نگار کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ وہ گھومتا ہوا پہیہ اُس پراسرار طاقت کی علامت ہے جس کا نام زندگی ہے۔ کیوں کسی نے یہ سوال نہ کیا کہ گیلی مٹی کے تودے میں کوزہ کہاں سے آگیا ——— یہ سب دیکھنے کے زاویے ہیں! سورج جب تک ایک خاص زاویے پر نہ آجائے قوسِ قزح نہیں بنتی۔ اور جب تک اللہ کی دین نہ ہو آدمی کو اُس زاویے کا علم نہیں ہو سکتا۔"

اپنے افسانے کو اِس زاویے سے شاید میں نے خود بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب اُس نے حافظؔ کا ذکر کیا تو مجھے وہ شعر یاد آ گیا جس پر میں نے ہمیشہ سر دُھنا ہے ؎ گِلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند ——— اور افسانے کے وہ پہلو میرے سامنے آ گئے جو شاید میرے لاشعور میں تھے ——— وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ دنیا زاویوں کا کھیل ہے۔ اور میں سوچنے لگا کہ اس راز کے انکشاف کے لیے شاید کسی فوٹو گرافر کی آنکھ ہی درکار تھی۔ اس کے البم اس فلسفہ کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔

روزمرہ کی چیزوں اور مناظر کو، جنھیں آدمی نظر انداز کر کے نکل جاتا ہے، اس نے ایسے ایسے زاویوں سے دیکھا تھا کہ پہچان مشکل تھی

"اور یہ نخلستان جو آپ دیکھ رہے ہیں، گندے پانی کا جوہڑ ہے جس کے گرد کھجور کے چند پیڑ ہیں۔ خود رو! کھجوریں کھا کر کسی نے گٹھلیاں پھینک دی ہوں گی کبھی۔ جانے کب کی بات ہے۔ اور شاید یہاں سے سینکڑوں میل دور اُس شخص کی ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی، اب اس کو ازمنہ وسطیٰ کے مسافر کو کیا معلوم تھا کہ بیسویں صدی کے ایک کیمرہ مین کو یہاں نخلستان نظر آئے گا ——— کون جانے کہ اُفق کا کونسا زاویہ ماورا کا راستہ ہے۔ ابدیت کا زاویہ ہے؟ انسانی زندگی کا مقصد شاید اس زاویے کی تلاش ہے۔ شعری تنقید سے میرا کوئی علاقہ نہیں لیکن غالبؔ نے اپنے اردو دیوان کے پہلے شعر میں غالباً کسی ایسی ہی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اربوں نوری سال پھیلے ہوئے افق پر ایک زاویے کی تلاش میں ابنِ آدم کی بے بسی۔ اُس کی فریاد!"

اُس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ ایسا باکمال شخص گوشۂ گمنامی میں کیوں پڑا ہے۔ کسی فلم لسٹ یا فلم پر اس کا نام میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ جب میں نے اُس سے اِس بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا کہ میں بڑا متلون مزاج آدمی ہوں ——— زندگی میں تنوع نہ ہو تو تنور ہے۔ زاویے ہر آن بدلتے رہنے چاہئیں۔ وہی ناول اور مختصر افسانے کا قصہ ہے۔ مختصر زندگی کی طویل کہانی طلسمِ ہوشربا کے مصنفوں ہی کا حصہ ہے۔ ورنہ خدا لگتی تو یہ ہے کہ ؎ حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا۔ محبت کی ایک ساعت، نگاہوں کے تصادم کو طول دے کر خود کو اور دوسروں کو بور کرنے سے فائدہ؟ سپاٹ لائیٹ SPOT LIGHT - کا حسن فلڈ FLOOD میں کہاں زاویے ہر آن بدلتے رہنے چاہئیں۔ تفصیل کی نزاکتیں ہجوم میں کہاں قائم رہ سکتی ہیں ——— بالوں کی لٹ، ہونٹوں کا خم، آنکھ کے ڈورے، گریباں کا چاک ... ایک خم، ایک قوس، ایک لکیر ——— کیا یہ کافی نہیں!"

موسیقی سے بھی اُسے خاصا لگاؤ تھا اور ہر چند کہ تعلیم نہیں تھی لیکن اس کی عام بات چیت۔ آواز کے اتار چڑھاؤ۔ اور جملوں کی نشست و برخاست میں سُر اور تال کا احساس ہوتا تھا۔ اور ڈارک روم میں اُسے اکثر گنگناتے ہوئے سنا گیا تھا۔ لیکن اس کی اٹھان

بس اتنی تھی سے جز مے کہنہ و معشوقِ جوان چیزے نیست۔ لیکن نشے کی حالت میں بعض اوقات عمر کی قید بھی اٹھ جاتی۔ ایسی عادتوں کے ساتھ اُس کا مقروض ہونا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ وہ سیٹھ سے لے کر دربان اور دھوبی سے لے کر پنواڑی تک سب کا مقروض رہتا۔ اور ساری تنخواہ قرضے چکانے میں اٹھ جاتی۔ سیٹھ جسے خود بھی فوٹوگرافی کا چسکا تھا۔ اُس کا خاص قدردان تھا، بظاہر بگڑتا لیکن اس کے قرضے اکثر چکاتا رہتا۔

بس کی سواری کو پرویز ہتک تصور کرتا تھا۔ اس لیے ہمیشہ ٹیکسی پر آتا۔ اور کرایہ ادا کرنے کے لیے کسی سے اُدھار لیتا۔ اُدھار مانگنے کا اُسے کچھ ایسا سلیقہ تھا کہ آدمی انکار نہ کر سکتا۔ جانتے بوجھتے بھی کہ واپسی کی امید کم ہی رکھنی چاہیئے۔ اس معاملے میں مکمل اجنبی بھی اُس سے نہیں بچتے تھے۔ فلمی دنیا میں داخل ہونے کی آرزو رکھنے والے اس کے خاص میزبان ہوا کرتے۔ اُن کی گرہ سے شراب پی کر وہ اُن پر احسان کرتا۔ وہ جانتے تھے کہ زاویے یا روشنی کی ذرا سی کمی بیشی ہمارے چہرے کو مسخ کر سکتی ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنے فن میں بد دیانتی کی ہو۔ وہ کہا کرتا:

"پرویز میں آپ کو ہزار عیب ملیں گے۔ پوری شرع اور کل تعزیرات کا بوجھ اس کے سر پہ ممکن ہے۔ لیکن جان بوجھ کر وہ کسی کا زاویہ غلط نہیں کرے گا۔ اس معاملے میں اس کا ضمیر کیمرے کے لینز کی طرح صاف ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

شراب کی حالت میں وہ کبھی کیمرے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا ــ یہ گناہ ہے بھائی۔ نشے میں نماز کا ارادہ!

جب کوئی نیا چہرہ امتحان کے لیے آتا تو پرویز اس کے مناسب زاویے کی تلاش میں ابھی فرش پہ لیٹا ہوا نظر آتا۔ ابھی سیڑھی پہ کھڑا۔ بتیاں جل رہی ہیں اور بجھ رہی ہیں۔ کبھی سپاٹ لائیٹ کبھی فلڈ لائٹ۔ اس کی تلاش کا نتیجہ تصویروں کے ساتھ ایک چارٹ کی شکل میں میرے سامنے آتا۔ یہ چاہیئے والا چہرہ ہے اور یہ تنگ پیشانی رقابت اور سفلہ پن ظاہر کرتی ہے۔ ان آنکھوں سے عفو و درگذر اور رحم و کرم کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ہونٹ ہوس کے ترجمان ہیں ...... اور اس حسینہ کی پیشانی پہ بالوں کی یہ لٹ ایثار و محبت اور سپردگی کا پتہ دیتی ہے۔ اور یہ تِل حافظ کی تفسیر ہے۔"

اُس کے انکشافات کا مجھے ہمیشہ انتظار رہتا۔ اور میں اکثر سوچا کرتا کہ اس شخص کو شاعر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن جہاں میں اُس کے بتائے ہوئے رموز سے ہمیشہ استفادہ کرتا۔ ہاں کسی چہرے کو رد کرنے کا حق بھی محفوظ رکھتا۔

تم زندگی کو صرف ایک زاویے سے دیکھتے ہو۔ لیکن مجھے بیک وقت سات زاویوں پہ نگاہ رکھنی ہوتی ہے۔ سیٹھ اور اُس کے تماش بین۔ رند اور زاہد۔ شیخ برہمن۔ ابھی میرا تمہارا وقت نہیں آیا کہ من مانے تجربے فرماتے رہیں۔ فی الحال ہمیں حدود میں رہ کر ہی ساری چمتکاری دکھانی ہوگی۔

اس قسم کے لیکچر کے بعد وہ ہمیشہ یہ کہہ کر چلا جاتا کہ آپ نے اینگل غلط کرایا سعید صاحب!

ایک روز جب پرویز اپنا فیصلہ صادر کر کے ابھی ابھی گیا تھا میری سیکرٹری نے اطلاع دی کہ ملاقاتی آئے ہیں۔ کارڈ پر لکھا تھا کہ ملاقات کا مقصد زبانی عرض کیا جائے گا۔

اجازت ہے سعید صاحب!

میں نے VISITORS SLIP سے نظریں اٹھا کر پہلے سیکرٹری اور پھر نو وارد کی طرف دیکھا جس نے سیکرٹری کی واپسی کا

بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ میں اُس وقت فلم کے منظر نامے کا خاکہ تیار کر رہا تھا۔ اور نو وارد کی بدتمیزی پر میرا موڈ بگڑ چلا تھا۔ لیکن ملاقاتی کے پیچھے ایک اور چہرہ اُبھرا۔ اور میں جو ابھی ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو اُسی بے تکلفی سے باہر نکال دوں جس بے تکلفی سے وہ اندر چلا آیا تھا — غیر ارادی طور پہ کھڑا ہو گیا۔

"میرا نام مجید ہے۔ اور یہ۔ میری بیگم ہیں۔ طلعت آرا۔ یہ آپ کی فین نمبر وَن ہیں۔ آپ کے سبھی فلم۔ آپ کے سبھی افسانے اِن کی نظر سے گذرے ہیں۔ اِن کے پاس آپ کے افسانوں کی CUTTINGS بھی موجود ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ میرے افسانے جو نقادوں کی سمجھ میں بھی ذرا کم ہی آتے ہیں ایک برقع پوش خاتون اُن کی کیا داد دے سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن سے کسی نے کہہ دیا ہے کہ یہ شخص خود کو بہت بڑا فنکار سمجھتا ہے۔ یہ بھی خوشامد کا ایک انداز ہے۔

"کرم فرمائی ہے اِن کی۔" میں نے کہا۔

"اور یہ آپ کی ہم وطن بھی ہیں۔"

"خوب!" میں کاروباری انداز میں مسکرایا۔

"اور یہ آپ کے خاندان کو جانتی ہیں۔"

مجھے یاد آ گیا کہ میرے بزرگوں کی کیا اسکھ ہوا کرتی تھی۔ چار لاکھ کی آبادی کے اُس شہر میں بچے بچے کو میری آبائی حویلی کا پتہ تھا۔

میں نے کہا "آپ نے بھولی بات یاد دلا دی۔ ویسے اب تو میرا وطن یہی ہے۔ پاکستان۔ ویسے کہاں رہتی ہیں آپ۔ ادھر"

اس نے بتایا کہ فلاں محلے میں "میرے والد کا نام ..... تھا۔ مَیں بچپن میں دادی کے ساتھ اکثر آپ کے ہاں جایا کرتی تھی اور ہمارے گھر میں آپ کے گھرانے کا ذکر رہتا تھا۔

اس دوران اُس کا شوہر خاموش بیٹھا رہا۔ اور میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا۔ میری نگاہیں طلعت آرا کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور پیور تجربے کے مختلف چارٹ پھر میرے سامنے آ گئے تھے —— یہ عورت والہانہ عشق کر سکتی ہے۔ اس کے بالوں کی لٹ سپردگی کی علامت ہے۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ، چھوٹی سی لیکن موزوں ناک اور غلافی آنکھیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ یہ گزرنے والی عورت ہے —— لیکن اس کا شوہر کھنکارا۔ شاید وہ اپنی کالی عینک کے پیچھے سے میری نگاہوں کا تعاقب کر رہا تھا۔

"ہم آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لیں گے۔ در اصل ہم نے آپ کو اس لیے ٹریل دی ہے کہ میرا کام کچھ ایسا ہے کہ آج یہاں اور کل وہاں........"

اب میں نے پہلی مرتبہ اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اور ایک بار پھر میرے دل میں وہی جذبات جاگ اُٹھے جو اُس کے کمرے میں آنے پر پیدا ہوئے تھے۔ اُس کا چہرہ ہالی وُڈ کے کسی فلمی ڈاکو کی یاد دلا رہا تھا۔ رنگت جو تمباکو کی طرح تھی سیاہ چشموں کی وجہ سے اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ مونچھوں کی جگہ ایک سُرمئی خط تھا اور دانت اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ وہ تمباکو کھاتا ہے۔ جسم دوہرا۔ ہاتھ بڑے بڑے، اُنگلیاں موٹی جن میں سُرخ نگینوں والی انگشتریاں چمک رہی تھیں۔

"کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کا چکر چلا رکھا ہے۔ اور بھی کئی دھندے ہیں۔ اور اکیلی جان۔ کبھی کراچی کبھی ڈھاکے کبھی پشاور کبھی

چاٹگام۔ ایک ہفتہ بھی جم کر ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ اور مسز ہیں کہ گھر میں بیٹھی بور ہوتی ہیں۔ فلموں کا انھیں بے پناہ شوق ہے۔ ایک ایک دن میں تین تین شو سے بھی شوق پورا نہیں ہوتا۔ اب چاہتی ہیں کہ خود بھی ایکٹ کریں۔ صلاحیت ان میں ہے۔ اشتہار دیکھا کہ آپ کو نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ آپ کا نام پڑھ کر اچھل پڑیں کہ انھیں تو میں جانتی ہوں ——— کیسے؟ یہ آپ ان سے پہلے ہی سن چکے ہیں۔ رہا میں۔ شوق تو ان کا کچھ نرالا ہی ہے۔ اور میں انھیں کبھی ادھر کا رخ نہ کرنے دیتا۔ لیکن خود میرے دل میں بھی موجود ہے اس کا کیا علاج؟ میرا تو نقشہ کچھ ایسا ہے کہ مہینے میں گویا چھبیس دن غائب۔" وہ اپنے مذاق پر ہنسا "اور مجھے یہ محسوس کر کے انتہائی تکلیف ہوتی ہے کہ یہ بیچاری اکیلی پڑی بور ہوتی ہیں۔ بالکل CRIMINAL تصور کرتا ہوں خود کو۔ اور کئی بار خیال آتا ہے کہ کوئی دوسرا کاروبار شروع کروں ——— لیکن اتنا روپیہ پھنسا پڑا ہے کہ وصولی کے لیے بھی کئی سال درکار ہیں۔ ایسے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بھی نہیں بیٹھا جا سکتا۔ جب تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہ ہو جائے ان کی بوریت مجھ کو کھائے جا رہی ہے اور ماڈرن آدمی ہونے کی حیثیت سے میں ان کے شوق کے راستے میں رکاوٹ نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ اگر آپ کے ہاں PART TIME JOB بھی نکل سکے۔ ایکسٹرا کا پارٹ ہی ہو جائے ——— عرض کیا نا میں نے۔ شوق محض شوق۔ TERMS کی پروا نہیں۔ کھانے پہننے کو نوبت ہے اللہ کا دیا ہوا۔ کاروبار ہے اُس میں کچھ الجھنیں ہیں لیکن دور ہو جائیں گی۔ پھر جائداد ہے بزرگوں کی۔ ہوٹل بھی ہے ایک چھوٹا سا مری میں۔ اُدھر کچھ کلیم کا بھی ہو رہا ہے۔ سندھ میں زمین ملنے کی امید ہے۔ یعنی مصروفیت اور بڑھ جائے گی۔ اس لیے میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے کہ انھیں مصروف ہی رہنا چاہیئے۔ یہ بور نہ ہونے پائیں میری عدم موجودگی میں ——— کیوں طلعت؟"

"جی ہاں" طلعت آرا نے اپنی چٹیا کو انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا "میری ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ فلموں میں کوئی اچھا سا پارٹ ادا کر سکوں۔"

"جی میں خوب سمجھتا ہوں۔" میں نے اُس کی بات کاٹی "لیکن اس تعارف کے بعد۔ میرا مطلب ہے اِس تعلق کے بعد جو آپ نے میرے اور اپنے خاندان میں ظاہر کیا ہے۔ مجھ پر ایک فرض عائد ہوتا ہے۔ اُس تمام ترقی کے باوجود جو فلمی دنیا نے گذشتہ بیس بائیس برس میں کی ہے۔ یہ فضا ابھی آپ ایسی گھریلو خواتین کے لیے کچھ ایسی سازگار نہیں۔ میرا مطلب ہے ہم لوگ خاصے، اور کسی حد تک بجا طور پر بدنام واقع ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں" طلعت آرا کے شوہر نے کہا "مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن آپ کے یہاں ہوتے ہوئے۔"

"حسنِ نظر ہے آپ کا۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔ اور مجھے پرویز یاد آگیا۔ نگاہ و نظر کے زاویے ..... اس اعتماد کا شکریہ۔ لیکن میرے علاوہ بے شمار لوگ اور بھی تو یہاں کام کرتے ہیں۔ اور میں سب کا ذمہ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔"

"لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔" مجید نے کہا "میں بزنس مین ہوں۔ اور تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کا کاروبار اعتبار ہی پر چلتا ہے۔ ہم لوگ لاکھوں کا سودا کرتے ہیں۔ لیکن ایک لفظ بھی لکھنے میں نہیں آتا۔ ان کا شوق ضرور پورا ہونا چاہیئے مگر میری صرف ایک، اور سب سے بڑی WORRY یہی ہے ——— کیوں طلعت؟"

"جی ہاں" طلعت آرا نے اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ویسے بھی اب کتنی ہی پڑھی لکھی اور خاندانی لڑکیاں فلموں میں آ چکی ہیں۔ دیویکا رانی ٹیگور کی نواسی ہے شاید..... اور جانے

کون کون۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ پڑھے لکھے لوگ آپ کے یہاں آ رہے ہیں۔ انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا ہے۔ فسادات نے سارے منصوبے بگاڑ دیے ورنہ یہ تو ایم۔ اے کرنا چاہتی تھیں۔ آپ ایسے قابل ڈائریکٹر کی نگرانی میں یہ ستارہ بن سکتی ہیں۔"

"بہت خوب۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ مصر ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن امتحان سے پہلے میں آپ سے وعدہ نہیں کر سکتا کہ ان کے لیے ضرور کوئی جگہ نکل آئے گی۔"

پرویز صاحب میرے کمرے میں تشریف لے آئیں۔ میں نے INTER COM: کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" پرویز نے معاً دروازے سے سر نکالا۔

ارے آپ یہیں تھے۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید ڈارک روم یا سٹوڈیو میں ہوں گے۔ در اصل مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرور یہیں کہیں ہوگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے جگہ جگہ ANGLE MIRROR لگا رکھے ہیں۔ جیسے ہی کوئی آیا اُسے فوراً پتہ چل جاتا۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اُس سے کچھ کہتا وہ نئے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ چہرہ خوب ہے مگر TEST سے پتہ چلا کہ چہرہ تو "چلتا ہے" لیکن ایکٹنگ کے معیار پر لانے کے لیے اُس پر مہینوں محنت کی ضرورت ہوگی۔ اُس کی MOVEMENTS میں وہ روانی نہیں تھی جس کی مجھے اپنے نسوانی کرداروں میں ضرورت تھی۔ اس کی چال بالکل ویسی تھی جیسے پرانی ہاری بالکہ تصوری پہننے والی کو ایک دم اونچی ایڑی کی سینڈل پہنا دی جائے۔

"سکے گا نہیں!" میں نے اپنے بنگالی میوزک ڈائریکٹر کی اصطلاح میں فیصلہ سنایا۔

پرویز کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ جیسے کوئی فلم اوور ایکسپوز ہو جائے۔ مگر اُسے بات بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اُس نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

"اردو گرامر کو ایک نئی چیز ملی ہے واللہ۔ کیسا جامع الغات لفظ ہے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ سُر کا ایسا سچا آدمی صرف مشرقی پاکستان میں مل سکتا تھا جہاں ندی نالے، دھان کے کھیت، کیلے کے باغ، چائے کی کلیاں اور سندربن کی پوری نباتات گنگناتی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ طلعت آرا اُس کے لیے محض ایک اور عورت ہے جس سے وہ کھیلنا چاہتا ہے۔ اور اپنے مخصوص انداز میں میرا فیصلہ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اب تک ایک TEST بھی کامیاب نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کی باتوں میں مغل مصوری کا لطف تھا۔ دلی اور لکھنؤ کے دیوان خانوں کی بازگشت تھی۔ میں نے اُسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

"اور اُس سُر ساگر سے ایسے آدمی کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے بھی نظر چاہیے تھی۔ سب زاویوں کا کھیل ہے۔ ورنہ ظل الرحمٰن چودھری کو کون جانتا تھا۔ معلوم نہیں مشرقی پاکستان والوں کی آوازیں اتنی خوبصورت کیوں ہوتی ہیں۔ جی ہاں! آواز کے بھی خد و خال ہوتے ہیں۔ خال کے ساتھ بنگال کا قافیہ نہیں باندھا کسی شاعر نے۔ حافظ دیکھ پاتا تو ایک سمرقند و بخارا ہی نہیں پورا سوویٹ یونین بخش دیتا۔ آوازوں میں بھی وہی ملاحت ہے۔ ایسے ایسے زاویے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لچکیلے ہاتھوں، بل کھاتی کمر، لہراتے بالوں کا لوچ —— پیدا کرنا قلی کی دانائی۔ برہمہ پترا کی طاقت۔ اس پر ریسرچ کرنی چاہیے تھی۔ ایسا وائڈ اینگل WIDE ANGLE موضوع ہے کہ جواب نہیں۔ کیا خیال ہے سکے گا؟"

ریسرچ سکے گا۔ لیکن یہ چہرہ ——میں نے سر ہلایا کہ بات نہیں بنے گی۔

پرویز کا منہ نشتر کی طرح کھل گیا۔ لیکن یہ نقش۔ پلکوں کے سایوں میں یہ سندرین کے اسرار۔ اور —اور اعضا کا یہ تناسب دیو داسیوں کی سپردگی۔ اجنتا کی تصویر دیوار سے علیحدہ ہو کر ایلورا کی دیوی سنگھاسن چھوڑ کر چلی آئی ہو۔ ایک عمر نیا دے آدمی پیاسا اس کو حاصل کرنے کے لیے۔ بھکشو ہو جائے دان لینے کے لیے۔"

فلم دیکھنے والے بھی بھکشو بن جائیں گے اور ہال بیچ کر چل دیں گے۔ میں نے کہا۔ اور سیٹھ بھکاری بن جائے گا۔ ویسے چہرہ ٹھیک ہے۔ اور سراپا بھی۔ بقول آپ کے شاید دلربا ہی ہو۔ لیکن ہمیں BLUE FILM نہیں بنانا۔ آواز اور لہجے پر غور نہیں کیا آپ نے؟"

"آپ چارلی چیپلن کے نوفائل ہیں؟"

"مگر سیٹھ اور اُس کے تماش بین۔ اُن کا کیا کیجیے گا۔ اس کے علاوہ چارلی کی ایکٹنگ کہاں سے لائیے گا پرویز صاحب۔ وہ متکلم خاموشی!"

"لیکن SEX APPEAL —سیٹھ اور تماشائی کو اور کیا چاہیئے۔"

آرٹ کا مقصد SEX کو SUBLIMATE کرنا ہے۔ ابھارنا نہیں ہے —سکے گا نہیں یہ دیر صاحب۔ مجھے اُس سے اور آپ سے دونوں سے ہمدردی ہے!"

"زاویہ غلط ہو گیا سعید صاحب!"

ایک دم! میں نے فلمی زبان میں اُس کی تائید کی۔ ہیروئن کا انتخاب کرتے وقت ہمیں BODY LINE کے علاوہ ہزار زاویے اور بھی دیکھنا ہوتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں۔

"مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ ہیروئن ہی کا پارٹ ادا کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اس کہانی میں نہیں تو کسی اور کہانی میں۔"

ہاں۔ کسی اور کہانی میں۔ ایک الھڑ لڑکی۔ اس کہانی کی نستعلیق ہیروئن نہیں نہیں!

لیکن اس فیصلے کے باوجود طلعت آرا ہر چوتھے پانچویں سٹوڈیو میں نظر آنے لگی۔

"اجازت ہے۔ اُس کا چہرہ دروازے کی اوٹ سے جھانکتا۔ اور وہ اسی بے تکلفی کے ساتھ جس سے وہ پہلے دن آئی تھی، جواب کا انتظار کیے بغیر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی۔ اس کو دروازے سے جھانکتے وقت دیکھ کر مجھے ہر بار پرویز کی بات یاد آجاتی اور محسوس ہوتا جیسے کوئی تصویر اپنا فریم چھوڑ کر آ رہی ہو۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تصویر کا پیرہن نہیں بدلتا لیکن وہ ہر بار نئے لباس میں ظاہر ہوتی۔ کبھی ساری، کبھی غرارہ، کبھی شلوار قمیص۔ بال۔ کبھی دو چٹیا۔ کبھی گندھی کبھی ان بندھی۔ کبھی جوڑا۔ کبھی یوں بندھا ہوا جیسے کھلا چاہتا ہے۔ کبھی کھلا ہوا جیسے ابھی ابھی لپٹا ہے۔ اس کے چہرے پر کسی گرم مزاج جواں عورت، اور بدن کے بھید میں سے ناآشنا کنواری کے خدوخال پھولوں اور بند کلیوں کی طرح گڈمڈ تھے۔ خوابوں کے بوکھلا دینے والے تانے بانے۔ اور ہر بار کچھ اس قسم کی باتوں کے بعد وہ چپ چاپ چلی جاتی!

"معاف کیجئے گا میں آپ کا بہت وقت ضائع کر رہی ۔۔۔"

معذرت تو مجھے کرنی چاہیئے کہ آپ اتنی زحمت فرماتی ہیں لیکن میں آپ کی بوریت دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اب تو شاید آپ مجھ سے بھی بور ہو چکی ہوں گی۔ ہر بار وہی جواب دیتا ہوں۔

ایک روز مجھے احساس ہوا کہ اُس کا شوہر ساتھ نہیں ہے۔ یوں بھی جب وہ آتا تو دو ایک باتیں کرکے چپ بیٹھا رہتا۔ اس کے علاوہ اُس کے چہرے میں جانے کیا بات تھی کہ میں نے اُسے ہمیشہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم اس کی موجودگی کا احساس سائے کی طرح کمرے میں موجود رہتا تھا۔ مگر اُس روز جیسے نکل جانے کے بعد بھی کانٹے کی چبھن رہتی ہے۔ میں اُس کے نہ ہونے سے چونک پڑا۔

مجید صاحب تشریف نہیں لائے آج؟ میں نے پوچھا۔

"جی وہ EAST PAKISTAN گئے ہیں۔ چائے کا نیلام ہے نا۔"

اور مجھے یاد آگیا کہ میں نے پاکستان ٹی بورڈ کے لیے ایک مختصر فلم بنایا تھا۔ جس کے لیے کافی ریسرچ کرنی پڑی تھی۔ ایک کلی اور دو پتے! گویا نیچر میں بھی وہی ہماری دنیا کی مثلث تھی۔ اور نہ جانے کیوں اُس وقت مجید اور پرویز ایک ساتھ میرے ذہن میں اُبھرے۔ لیکن میرے ہونٹوں پر آئی ہوئی ہنسی یہ دیکھ کر رُک گئی کہ طلعت آرا اپنی چٹیا کبھی کھولتی ہے کبھی گوندھ رہی ہے۔ اور اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر کوئی بات اناڑی کی لپ سٹک کی طرح رکھی ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سخت اُلجھن میں مبتلا ہے۔ لیکن میں نے اس کے خیالات میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

دراصل ہم فن کار ایک حد تک نہایت ہی خود غرض ہوتے ہیں۔ میں بھی حسن پریشان کو کچھ دیر اور پریشان دیکھنا چاہتا تھا۔ اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خاص خاص موقعوں پر انسانی جذبات کیا کیا شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ آدمی انھیں کیسے چھپاتا اور کیسے ان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی صبر آزما عمل ہے۔ اس کی خاطر چلے کھینچنے پڑتے ہیں۔ جس طرح BIRD WATCHER، پہروں بلکہ مہینوں اس انتظار میں کاٹ دیتا ہے کہ پرندے کب ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ اور جب کہیں جاکر اُسے وہ ساعت دیکھنا نصیب ہوتی ہے جو تسلسلِ حیات کی ضامن ہے۔ اُسی طرح آگہی کی ایک ساعت کے لیے فن کار کو عمروں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اپنی عدیم الفرصتی اور دوسروں کی نجی زندگی میں دخل نہ دینے کی عادت کے باوجود مجھے اپنے گرد فضا میں کچھ عجیب سی بات محسوس ہو رہی تھی جس کا تعلق طلعت آرا، مجید اور شاید پرویز سے تھا۔ اور غیر شعوری طور پر میں نے ایک ساتھ کئی کہانیوں کے تانے بانے تیار کئے تھے۔ لیکن سب کے سب ابتدائی خاکے تھے جن کی تکمیل کا کام میں نے "دوقت" پہ چھوڑ دیا تھا۔ اب شاید وہ ساعت آ رہی تھی کہ اس خاکے میں ایک اور نقش اُبھر آتا۔ مگر طلعت آرا کا اضطراب بڑھتا گیا۔ وہ خاموش بیٹھی اپنے بالوں میں گرہیں ڈال کر انھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس آہو کی طرح تھی جو اپنے ہی نافے کی خوشبو سے بھٹکتا پھر رہا ہو۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر اور اسی طرح چپ بیٹھی رہی تو رو پڑے گی۔ اور اس میلو ڈرامہ کی ساری ذمہ داری مجھ پہ عائد ہو گی۔ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا:

خوب! تو مشرقی پاکستان میں ہیں مجید صاحب۔ پاکستانی چائے ذائقے کے اعتبار سے دنیا کی مقبول ترین چائے ہے۔ اس کا

قہوہ خوب جاندار ہوتا ہے۔ خوشبو البتہ قدرے کم ہوتی ہے۔ چنانچہ دوسری قسموں سے بلینڈنگ کرنی پڑتی ہے۔ زیادہ خوشبو والی چائے کا رنگ پھیکا ہوتا ہے۔

"جی"۔ اُس نے میرے لیکچر سے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا لیکن جیسے کوئی روتے روتے ہنسنے کی کوشش کرے۔ میں نے بات کا رخ پھر بدلا۔

تو چائے کے نیلام پر گئے ہیں مجید صاحب — بہت بھلے آدمی ہیں بے چارے۔ صحیح معنوں میں ماڈرن۔ ایسے فراخدل اور روشن خیال لوگ کم ہی ملتے ہیں۔ میں تو اپنی بیوی کو ہرگز ایسی جگہ نہ آنے دیتا —— برقع پہنا دیتا خدا کی قسم۔ میں نے ڈرامائی قہقہہ لگایا۔ وہ بھی ہنسی اور میں سمجھا کہ خطرہ ٹل گیا — جی ہاں۔ میکے بھیج دیتا۔ یہ مجید صاحب ہی کا دل ہے کہ آپ کی بوریت کو دور کرنے کے لیے اس حد تک جانے کے لیے رضامند ہو گئے ہیں۔ اُن کی ہمت اور جرأت کی میں داد دیتا ہوں۔ لیکن اپنے آپ سے شرمندہ ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ دراصل کہانی کا انتخاب بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آپ کو مصروف رکھنے کے لیے البتہ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ ابھی ابھی۔

اُس کا چہرہ چمک اٹھا۔

انجمن خواتین کے دستکاری مرکز کے لیے آنریری سپروائزر کی ضرورت ہے۔

اُس کا چہرہ پھر بجھ گیا۔ اور اُس کی انگلیاں پھر اپنے بالوں سے کھیلنے لگیں جیسے پھر وہی اُلجھن۔

"آ — پ — کے ہاں بالکل جگہ نہیں؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "شاید میں اپنا مقصد پوری طرح بیان نہیں کر سکی۔ میرا شوق ——"

میں نے اس کی بات کاٹی —— عرض کیا نا میں نے کہ آپ کے لیے کوئی موزوں پارٹ کہانی میں نہیں ہے۔ ایسے ویسے پارٹ سے بات نہیں بنے گی۔ مجھے تکلیف ہو گی اُلٹی۔ کوئی ضرورت مند ہوتا۔ کہیں ادھر اُدھر چھوٹی موٹی ایکسٹرا ——"

"شاید" اس کے ہونٹ کپکپائے "میں بھی ضرورتمند ہی ہوں"۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسا پورا فلم سٹوڈیو میرے اوپر گر پڑا ہے پورا پریمیز، کیمرے، ساونڈ یونٹ، لیبارٹری، سیٹھ، دربان، پرویز!!!

اور پھر وہ کھل گئی۔ اس نے مجھے قسم دی کہ یہ بات کسی اور سے نہیں کہوں گا۔

اس کی شادی ۱۷ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔ دو سال بعد ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس کا شوہر بھی اُن لوگوں میں سے تھا جو آزادی کی بھینٹ چڑھے۔ والٹن کیمپ میں اس کی ملاقات مجید سے ہوئی جو اُس کو اور اس کی بوڑھی ماں کو اپنے گھر لے گیا۔ مجید کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں کو ہنسی خوشی رہنا چاہیئے تھا۔ اچھا خاصا منشی پریم چند یا پنڈت سدرشن کا افسانہ تھا جس میں مجید کو بآسانی شیطان سے فرشتہ بنایا جا سکتا تھا۔ ایک سیدھی سادی سپاٹ فلمی کہانی کے سبھی واقعات اس میں موجود تھے۔

لیکن پہلے شوہر سے طلعت آرا کے دو بچے تھے۔ اور مجید نے ماں جو شروع شروع میں اُن سے کمال شفقت و ہمدردی سے

پیش آئی تھی۔ آہستہ آہستہ روائتی ڈائن بنتی گئی اور اپنے بیٹے کے کان بھرنے لگی —— مگر طلعت آرا کے ضرورت مند ہونے کی وجہ ابھی باقی تھی —— کاروبار میں خسارہ!

لیکن جائداد؟ میں نے پوچھا۔

"وہ نہ ہوتی تو گذر نا ممکن ہو جاتی۔ دال روٹی تو مل ہی جاتی ہے۔ مگر بچے —— میں چاہتی ہوں کہ انھیں کہیں ہاسٹل میں داخل کر دوں۔ ہر وقت کے جھگڑے مجھ سے برداشت نہیں ہوتے ——"

مجھے ڈر تھا کہ اب اُسے ہسٹریا کا دورہ پڑے گا۔ لیکن اس نے ایک اچٹتا ہوا سانس لیا اور سنبھل گئی۔ "لیکن اس کے لیے مستقل آمدنی کی ضرورت ہے۔"

میں پھر بور ہونے لگا۔ وہی قربانی کی کہانی تھی۔ گھر کی ناسازگار فضا۔ ظالم ساس، کانوں کا کچا شوہر اور ایک بیچاری قسم کی گھریلو لڑکی —— اور پرویز نے تو کہا تھا کہ اسے ضرور کسی کہانی کی ہیروئن ہونا چاہئے۔ مگر یہ تو فقط ایکسٹرا تھی جس کے لیے اگر میری فلم میں گنجائش بھی ہوتی تو بھی وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لیے وہ گھر سے نکلی تھی۔ مگر اس "فنی بے بسی" کے باوجود مجھے اس سے ہمدردی تھی محض انسانی ہمدردی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرورت مند ہے۔ لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ غلط جگہ آئی تھی۔ چنانچہ میں نے پھر اپنے اوپر بزرگی طاری کی اور اسے فلمی دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ تمہاری ساس کا ردعمل کیا ہو سکتا ہے۔ بیوہ ہی کی زندگی کچھ تلخ نہیں ہوتی جو جائے کہ.....

میرا مطلب ہے آپ ایسے حالات میں خاص طور پر جب کہ مجید صاحب اپنی والدہ کی خوشنودی کا اتنا خیال رکھتے ہیں آپ کے لیے ایسا اقدام خطرناک ہو سکتا ہے —— میں نے اس امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ نوبت طلاق پر بھی پہنچ سکتی ہے تاہم اس فضا سے باہر، میں آپ کے لیے ضرور کوئی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ اس کا ضرور کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔

لیکن میری بات سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اور وہ چپ چاپ سر جھکائے چلی گئی۔

اس کو گئے ابھی ایک منٹ ہی گذرا ہوگا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

پرویز تھا

"اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میں آپ سے اس منظر کے بارے میں مشورہ چاہتا تھا۔ کہ گا کہ نہیں؟"

لیکن وہ خلافِ معمول چپ رہا۔ وہ اپنی نیکٹائی کو انگلی کے گرد لپیٹ رہا تھا۔ مجھے طلعت آرا یاد آ گئی۔ لپٹنی نیکٹائی اور گندھی چٹیا۔ MIX کا مزا آ گیا۔ لیکن پرویز غم زدہ طرب نظر آ رہا تھا۔

خیریت؟ میں نے پوچھا۔

"اب کیا عرض کروں۔ مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔ آ۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض اوقات اضطراری حالت میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ——"

آپ کی گنگلو HITCH COCK کی فلم بن گئی ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں زیادہ —— SUSPENSE کا قائل نہیں۔

وہ بوکھلا گیا۔

"طلعت۔ میرا مطلب ہے۔ مسز مجید آپ کے کمرے میں داخل ہوئیں تو اتفاق سے میں بھی ادھر ہی کو آ گیا۔ انھیں دیکھ کر میں رک گیا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے کان آپ سے آپ دروازے سے لگ گئے۔ لیکن اس فعل میں ارادے کو ہرگز دخل نہیں تھا۔ تاہم میرا فرض ہے کہ اس غیر مہذب حرکت کے لیے آپ سے معافی مانگوں۔"

مجھے شرارت سوجھی۔ بھئی یہ سے اگر کوئی غیر شائستہ بات میرے منہ سے نکل گئی ہو تو میں بھی آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ کا ساوی ہے صفر کیے اب آپ کانوں میں نہ گھسیئے سعید صاحب۔ میں واقعی سخت شرمندہ ہوں۔ لیکن باور کیجئے کہ تصویر اور مصور کے رشتے کے سوا میری اُس سے۔ میرا مطلب ہے اس سے قطعاً کوئی سروکار نہیں۔"

تصویر اور مصور آپ کے نزدیک دو مختلف چیزیں ہیں؟ میں نے بظاہر ایک نہایت ہی طالب علمانہ قسم کا سوال کیا لیکن شاید غیر شعوری طور پر اس میں طنز پیدا ہو گیا۔ یا شاید وہ فلسفے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے سنی ان سنی کر دی۔

"زاویہ غلط ہو گیا صاحب۔ پورا TRIPED ہل گیا ہے گویا۔ ذرا آپ۔ خود کو۔ اس کی حالت میں تصور کیجئے۔ اور ہمدردی کے ساتھ ———"

مگر میں اُسے فتنہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میلو ڈرامہ ہے بس! — میں نے روکھے پن سے کہا۔ تاہم مجھے اس سے ہمدردی ہے اور میں اُس کے لیے کوئی باعزت جگہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ بھی اپنے اثر و رسوخ سے کام لیجئے۔

دراصل اُسے کل ہی تنخواہ ملی تھی۔ اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ رات وہ کہاں رہا ہے۔ ایسے میں اُس پر رقت طاری ہو جانا معمولی بات تھی۔ اور اُسی کے مختلف قسم کے MOODS کے لیے میرے پاس مختلف علاج تھے۔ اب ایسے میں اُس نے ذرا بھی نرمی کا اظہار کیا ہوتا تو وہ سچ مچ میرے پاؤں پڑنے لگتا کہ میں طلعت آرا کے لیے ضرور کوئی جگہ نکال لوں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ طلعت آرا کو کس زاویے سے دیکھ رہا ہے ——— محض ایک قبول صورت عورت جس کی مصیبت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا ——— اور میرے جی میں آئی کہ اس سے کہہ دوں کہ یہ ہے ہمارا زاویہ! ۔ لیکن اتنی کھلی بات وہ برداشت نہ کر سکتا۔ اس کے علاوہ اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود میرے دل میں اُس کی بہت عزت تھی۔ چنانچہ میں اس وقت بھی مسکراتا رہا۔ جب اس نے کہا کہ کاش میرے افسانوں میں فلسفے اور میری عملی زندگی میں اور زیادہ آہنگ ہوتا۔ اور میں نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میرے افسانوں کا مطلب محض انسان سرائی ہے۔ فلسفے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر افسانہ ایک نئے ماحول ایک نئے کردار اور نئے واقعات کا عکس ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ میں کسی خاص فلسفے کا مبلغ ہوں۔ غلط ہے۔ پنساری کے باٹ اور سنار کے باٹ الگ الگ ہیں۔ مگر وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا کہ زاویہ غلط ہو گیا۔

میں نے طلعت آرا سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لیکن اس نے کہا کہ نرسنگ کا کام مجید صاحب کو پسند نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر وقت مریضوں سے واسطہ صحت کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔

نرسنگ کی طرح بچے پڑھانے سے بھی طلعت آرا کو دلچسپی نہیں تھی۔ بڑی کلاسیں ہوں تو اور بات ہے۔ لیکن یہ کے جی کے بچے تو مغز کھا جاتے ہیں۔

میری نمبر وَن فین نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا۔ کاش اس نے میرا نام نہ سنا ہوتا۔ وہ میرے خاندان کو نہ جانتی۔ اور میں

کہ وہ اندر ہی اندر پیدا ہوتا ۔ اور میرے تو جی میں آئی کہ اس کے میاں کو بلاؤں اور صاف صاف کہہ دوں کہ ہم چار کے سوداگر اپنی گلی کو سنبھال لو مجھے اپنا میرہ بگڑتا نظر آ رہا ہے ۔ لیکن پتہ چلا کہ وہ یہاں کے آنے کا کوئی ٹھیک پتہ نہیں ۔ بہت دن سے شہر ہی نہیں آیا ۔ جس کی وجہ سے طاعت آرا خلاف معمول پریشان تھی ۔ اور جانے مجھ میں اس کو کیا بات نظر آتی تھی کہ اپنی پریشانیوں کے حل کے لیے وہ بار بار میرے پاس آ رہی تھی ۔ میں مشکل میں پھنس گیا بالکل ایسے ہی جیسے کالر سنگ پر اور یہ میں دو دو ۔ لیکن وجہ سمجھ میں نہ آ سکی ۔

کہ یکایک جیسے میرے کالر کا بٹن ٹوٹ گیا ۔ اور میرا وردنا ب ہو گیا ۔

ایک روز فلم کمپنی سے میرا ناطہ یکایک ٹوٹ گیا ۔ ہوا یہ کہ کنٹریکٹ کے مطابق سیٹھ کو کہانی کے کسی پہلو میں دخل دینے کا حق نہیں تھا چنانچہ جب اس نے سیکنڈ ہیروئن کا کردار پلاٹ میں اپنی تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیا تو میں نے اس کی توجہ کنٹریکٹ کی طرف دلائی ۔ لیکن اس کی سیٹھئیت بیدار ہو گئی ۔

سالا تم کیسا رائٹر ہے بابا ۔ ایک ایکسٹرا بھی نہیں ڈال سکتا ۔ اتنا بھی کھیال نہیں کرتا کہ ہمارا مال لگتا ہے ۔

میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں ۔ اس کو پرویز نے بھی محسوس کیا جو اس وقت میرے پاس ہی بیٹھا تھا ۔ اس نے اپنے مستعلیق انداز میں کوشش کرنی چاہی کہ بات ٹل جائے ۔ "سیٹھ صاحب کا مقصد شاید یہ ہے ——————"

لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی ۔ سیٹھ صاحب خود ہی ایل ایل بی ہیں مسٹر پرویز ! ان کے دلائل مجھے منظور ہیں ۔ اور ان کا لہجہ جو شاید ان کے نزدیک روزمرہ بلکہ شاید گھریلو بات ہی کا لہجہ ہو گا ، مجھے ناپسند ہے ۔ اب میرا یہاں کام کرنا میرے اصول اور میری غیرت کے خلاف ہو گا ——— اس لیے کنٹریکٹ خلاص ۔

دراصل میں نے اس سے منہ مانگی شرطوں پر معاملہ کیا تھا ۔ اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں اس بے تکلفی سے جا سکتا تھا ۔ اور جب میں نے اپنا بریف کیس بھی اٹھایا تو سیٹھ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔

جب میں کمرے کا دروازہ بند کر رہا تھا تو پرویز کے ہونٹ ہلے ۔ شاید وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اینگل غلط ہو گیا ۔

سیٹھ سے کنٹریکٹ کرنے سے قبل ایک موزوں فلم کے بارے میں UNESCO سے میری دیر تک خط و کتابت ہوتی رہی تھی ۔ یہاں بھی زاویے کے مدار پر بات آگے نہیں بڑھ رہی تھی ۔ لیکن اس روز جب میں اپنے فلیٹ پہنچا تو یونسکو کا خط میرا انتظار کر رہا تھا ۔ میں نے معاہدہ بھر کے بھیج دیا اور اپنے مشرق بعید کے سفر کے انتظامات میں مصروف ہو گیا ۔

دو سال بعد جب میں چھٹی پر کراچی پہنچا تو پہلا آدمی جو مجھے ایئرپورٹ پر ملا ۔ پرویز کا اسسٹنٹ تھا ۔

ہیلو موی ماسٹر ۔ اینگل ٹھیک ! محض قربت ! ۔ میں نے پوچھا ۔

اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا ۔ اور پھر یکایک سنجیدہ ہو گیا ——— ایک دم رونگ (WRONG) ! موی ماسٹر ! کیلیٹی پزلڈ ۔ ایسا اینگل ہے سالا ۔ ایسا اینگل ۔ پورے سرکل کے مالک (موافق) ایک دم گول ۔

مجھے لاہور جانا تھا ۔ اور P-I-A کی روانگی میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا ۔ ہم ریستوراں میں بیٹھ گئے ۔

کیا ہو گئے موی ماسٹر ——— وہ ! چلتا ہے نا اب بھی ۔

" ارے ! " وہ چونک پڑا " آپ کو اب تک یاد ہے ! "

بلیٹھے یاد ہے ضمانت دے کر تمہیں اور تمہارے استاد کو پولیس سٹیشن سے لانا بھی یاد ہے۔

"ارے" اس نے "رے" کو لمبا کھینچا۔ موی ماسٹر ایکدم ASHAMED

ارے نہیں۔ میں نے کہا۔ وہ تو مجھے ایسے ہی یاد آ گیا تھا۔ ورنہ میرا ارادہ کسی قسم کا احسان جتلانے یا تمہیں شرمندہ کرنے کا نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں کہ آرٹسٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور میں اُن کے بیچ بیہودہ چیز روا سمجھتا ہوں جو اُن کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ ویسے کام میں گڑبڑ ہو تو LEMON SQUASH بھی زہر ہے۔ ایک دم BAD۔ خیر پرویز کی سناؤ۔ بڑا پیارا آدمی ہے۔ لیکن ڈرنک نے گڑبڑا دیا اُس کو۔ کوئی بیا ایگل ڈھونڈا ہے نہ نہیں اُس نے؟

"سرکل۔ ایک دم سرکل۔" اس نے رم میں انگلی ڈبو کر میز پہ دائرہ کھینچا۔ موی ماسٹر ایک دم STUPIFIED ہے سعید صاحب۔ ایسا MYSTRY ہے کہ سالا بیچ کاک بھی چکر میں پڑ جانے میں بولا۔"

اور موی ماسٹر نے بتایا کہ پرویز نے شراب چھوڑ دی ہے۔ کوکا کولا تک نہیں پیتا کہ اس میں بھی الکوہل کا امکان ہے۔

"ایک دم RESPECTABLE۔ ایک دم بغیر داڑھی کا مولوی ——— ہاں" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کہ "سٹڈیو کا سٹاف بولتا ہے استاد کو اِشک ہو گیا ہے اشک۔ نہیں سمجھے لو دو LOVE"

اتا پتا پوچھنے پر اس بیہودہ زنگاری سے طلعت آرا برآمد ہوئی۔ سیٹھ کی نئی کہانی کی ہیروئن!

"ایک دم ٹریجیڈی" موی ماسٹر نے رم کا دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا "پرویز ماسٹر آیا بن گیا قریشی صاحب۔ یہ جو بچہ لوگ کو کھلاتا۔ آ! آیا۔ بچہ لوگ پرویز کے پاس اور ممی ——"

سیٹھ کے ——— میں نے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ایک دم ٹھیک ——— میں بولا۔ سرکل ایک دم سرکل۔"

اور ایک بار پھر وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ابھرا جب طلعت آرا پہلے روز میرے کمرے میں آئی تھی۔ سیاہ برقع سے جھانکتا ہوا الھڑ چہرہ۔ اور اس کے ساتھ ہی دو آنکھیں، جن میں غالباً ایک من ہول تھا عینک کے کالے شیشوں کے پیچھے پیچھے گھورتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

اور اُس کا شوہر۔ میں نے پوچھا۔

"ہز بینڈ اُس کا، سالا بیوی کی دولت پر عیش کرتا ہے اور کیا" موی ماسٹر نے رم کا ایک لمبا کش لگایا اور کسی بطخ کی طرح جو تالاب کی تہ سے موتی نکال لاتی ہو۔ اپنی گردن میرے قریب لاتے ہوئے بولا۔ اپنے HUSBAND سے اِشک کرتی ہے سالی۔ L-O-V-E ——— پھر موی ماسٹر بولا۔ تیرے کو کیا مسٹر۔ دنیا ایک دم سرکل ——— ایک ڈبل رم بولائے موی ماسٹر آج ایک دم SAD ہے سالا ——— سعید صاحب تم بھی ماسٹر پرویز کو نہیں سمجھا سکتا۔

اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو رم میں تحلیل ہو رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پرویز پھر اپنی نستعلیق آواز میں اپنا فلسفہ بیان کر رہا ہے ——— زندگی زاویوں کا کھیل ہے سعید صاحب . . . .

لہو ترنگ

غلام علی چودھری

کردار

خاور خاں — قبیلہ قبلوتن کا حاکم

فلک ناز — خاور خاں کی بیوی

شہزاد — خاور خاں کی بھتیجی

راہبِ اعظم — خداوندِ روزگر کے معبدِ اعلیٰ کا نگران

ہورماز — سالارِ محل

یاقوت — غلامِ خاص

الماس — کنیزِ خاص

کامران — ایک غدار تاہک سردار۔ زرینہ کا بھائی

ببرک خاں — قبیلہ تاہک کا حاکم

زرینہ — ببرک خاں کی بیوی

ارجمند، زیرک، فیروز — ببرک خاں کے بیٹے، بہ ترتیبِ عمر

راہبہ — خداوندِ روزگر کے معبد کی نگران

سردار اور سپاہی اور عام لوگ

رخش — ایک گھوڑا

نافہ — ایک ہرنی

لہو ترنگ

یہ ملکِ گیہان کی وادیِ جوردان کا قصّہ ہے۔ جو دریائے دماب کی جولانیوں سے فروزاں ہے۔

سرزمینِ جوردان کے شمال میں کوہِ ازلاف ایستادہ ہے۔ دماب اس کی بلندیوں سے اُترتا ہے۔ اور وادی کا سینہ چیرتا ہوا جنوب میں پھیلے ہوئے بحرِ ابدم میں گم ہو جاتا ہے۔

جوردان میں عرصۂ بعید سے دو قبیلے ہاکب اور قبلوق آباد ہیں۔ اور دریائے دماب ان کے درمیان قدرتی سرحد ہے۔ اس طرح کہ اس کا ایک کنارہ ہاکبوں کے قبضہ میں ہے اور دوسرا قبلوقوں کی حکمرانی میں۔

ہاکب اور قبلوق زمانۂ قدیم سے ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان دو قبیلوں کی داستان ملکِ گیہان کی تاریخ ہے!

پہلا منظر

خاور خاں - یاقوت! ہم یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کہ ہاکبوں کا جتنا نقصان اس بار ہوا۔ اِتنا کبھی نہیں ہوا۔ پہلے تو یہی ہوتا تھا کہ مال بھی ہم قبلوقوں کا لُٹتا تھا اور جانیں بھی ہماری جاتی تھیں...... اس دفعہ شاید دشمن پوری تیاری سے نہیں آیا۔

یاقوت - نہیں عالی جاہ! حملہ تو ہاکبوں نے بڑے زور کا کیا تھا اور یہ حضور جانتے ہیں کہ وہ بے جگری سے لڑتے ہیں مگر قبلوقی سردار نے ایسا پھندا لگایا تھا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئے۔

خاور خاں - ہم بھی تو سنیں کہ یہ کیونکر ہوا۔

یاقوت غلام عرض کرتا ہے عالی جاہ! چند روز پہلے دماب کے کنارے ایک ذخیرے کے درمیان صرف اس خیال سے ایک چھوٹی سی بستی آباد کی گئی۔ کہ ہاکب اسے دیکھ کر حملہ آور ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اِتنی بے صبری دکھائی کہ پرسوں سُورج ڈوبنے سے پہلے ہی چڑھ دوڑے۔ ہمارے سپاہی ذخیرے میں چھپے بیٹھے رہے۔ جب ہاکب پورے طور سے نرغے میں آ گئے۔ تو انھوں نے یک لخت یلغار کر دی۔ پھر تو گویا ان کے اوسان خطا ہو گئے۔

خاور خاں - بہت خوب! ہا ہا ہا ہا..... پھر کیا ہوا یاقوت؟

یاقوت - (مسرور لیکن مؤدب لہجے میں) پھر کیا ہونا تھا عالیجاہ ہاکب گتنے دم دبا کر بھاگ نکلے۔ لُوٹ مار کرنے آئے تھے۔ اور آدھے سے زیادہ ڈھیر ہو گئے۔ اٹھتر لاشیں تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں عالی جاہ۔ اور قیدی اور زخمی اس کے علاوہ ہیں۔

خاور خاں : ہا ہا ہا . . . . . اس کا تو یہی مطلب ہوا۔ کہ اگر ہم قبلوں تدبیر سے کام لیں۔ تو ہاکوں کی بہادری کے پرانے قصے بے معنی ہو جائیں . . . . . مگر کچھ تو حملہ آوروں کے ہاتھ بھی آیا ہی ہوگا۔

یاقوت : ہاں عالی جاہ۔ دو ہاکی تیل کا ایک کپا گھوڑے کی پیٹھ پر لا رہے تھے کہ ہمارے تیر اندازوں نے دیکھ لیا بس پھر کیا تھا۔ تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کپا چھلنی ہو گیا۔ اور دونوں ہاکی تیل اور خون میں لت پت ہو کر گر پڑے۔

خاور خاں : ہا ہا ہا ہا . . . . . ہا ہا ہا . . . . . کتنے خوش نصیب نکلے ! . . . . کتنی روغنی موت آئی ! . . . . ہا ہا ہا ہا . . . . .

(نہایت مختصر وقفہ)

خاور خاں - (آہ بھرتے ہوئے) آج میرے مرحوم بھائی اور بھتیجے کی روحوں کو کچھ نہ کچھ تسکین تو ضرور ہوئی ہوگی۔ . . . . کاش میں کسی روز یہ بھی سنوں۔ کہ ہاکوں کی ایک ایک بستی خاکستر ہو گئی ہے . . . . . ایک ایک مرد، عورت اور بچہ موت کی نیند سلا دیا گیا ہے۔

(خاور خاں تالی بجاتا ہے اور الماس آتی ہے)

الماس - عالی جاہ نے یاد فرمایا ؟

خاور خاں - ہاں الماس۔ (جذباتی انداز میں) شہزاد کو بلاؤ۔ شہزاد کو جو میرے بھائی کی آخری نشانی ہے۔ جو مجھے اپنی بیٹی سے بڑھ کر عزیز ہے۔

الماس - ابھی تعمیل ہوتی ہے عالی جاہ !

(الماس جاتی ہے)

خاور خاں - کچھ اور کہنا ہے یاقوت ؟

یاقوت - صرف ایک گذارش اور ہے عالی جاہ ! کامران نامی ایک ہاک سردار جو پرسوں والے حملے میں گرفتار ہوا، دربار میں حاضر ہونے کی التجا کرتا ہے۔ سالار محل اس بارے میں حضور کی اجازت کا منتظر ہے۔

خاور خاں - کیا مضائقہ ہے اس کے آنے میں۔ بھیج دو۔

یاقوت - تعمیل حکم بجا لاتا ہوں عالی جاہ !

(یاقوت ایک طرف جاتا ہے۔ اور دوسری طرف سے شہزاد آتی ہے)

شہزاد - عمو ! آپ نے مجھے یاد فرمایا ؟

خاور خاں - ہاں بیٹی۔ بیٹھ جاؤ۔

(فلک ناز آتی ہے)

خاور خاں - فلک ناز ! تم بھی آ گئیں۔ اچھا ہوا۔ تمہارے قبیلے کا ایک آدمی یہاں آ رہا ہے۔

فلک ناز۔ خاور خاں! مجھے یہ کانٹا چبھونے میں تمہیں کیا لطف آتا ہے؟

خاور خاں۔ (ہنستے ہوئے) تو تمہیں اس کانٹے کی چبھن محسوس ہوتی ہے!

فلک ناز۔ ضرور محسوس ہوتی ہے۔ ہمیشہ محسوس ہوگی۔۔۔ اور کیوں محسوس نہ ہو؟

خاور خاں۔ میں حیران ہوں فلک ناز تم کیا عورت ہو!۔۔۔۔۔ آج سے انیس برس پہلے ایرج نے ایک شبخون مارا اور تمہیں ہاکب سردار ببرک خاں کے خیمے سے اٹھایا۔ تم تین سال ایرج کے حرم میں رہیں۔ اور تمہیں خداوند روزگار نے بلند بخت جیسا بیٹا اور شہزاد جیسی بیٹی دی۔ ایرج ہاکبوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اور تم میرے حرم میں آئیں اور تمہارے ہاں خرم اور پروین پیدا ہوئے۔ آج سے دو سال پہلے ایک ہاکی لٹیرے نے بلند بخت کو بے دردی سے قتل کیا۔ اور اس کی لاش کی بے حرمتی کی۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ہوا۔ فلک ناز مگر تمہارے دل سے اپنے قبیلے کی محبت نہ گئی۔ تمہیں ابھی تک طعن کا نشتر چبھتا ہے اور تمہیں اس پر فخر ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ ہے نا؟

فلک ناز۔ خاور خاں! تم اس بات پر کیوں مصر ہو۔ کہ میرا دل تمہاری مرضی کے مطابق دھڑکے جب کہ وہ خود میری مرضی کے مطابق دھڑکنے پر تیار نہیں!۔۔۔۔۔ مجھے ایرج اور بلند بخت سے محبت تھی اور رہے گی۔ مجھے تم سے شہزاد سے، خرم اور پروین سے محبت ہے اور رہے گی۔ مگر اسی طرح مجھے ہاکب قبیلے سے، اپنے وطن سے، اپنے بھائی ببرک خاں سے اور اس کے بچوں سے محبت ہے۔ اور رہے گی۔

خاور خاں۔ مگر میں حیران ہوں تمہارے دل میں آگ اور پانی کیسے یکجا ہو گئے۔

فلک ناز۔ خاور خاں۔ یاد رکھو۔ کہ وہ لہو جس کی ندی دل سے ابلتی ہے۔ آگ اور پانی سے مل کر بنتا ہے۔

شہزاد۔ میں یہ نہیں سمجھتی ماں۔ تم کیسے بلند بخت کے قاتلوں سے محبت کر سکتی ہو؟

خاور خاں۔ شہزاد! یہ بات میری اور تمہاری عقل سے بالا ہے۔

فلک ناز۔ یہ تمہاری ہی نہیں میری عقل سے بھی بالا ہے۔۔۔۔۔ (دھرائی ہوئی آواز میں) میں بڑی بدنصیب ہوں شہزاد۔ خداوند روزگار وہ وقت نہ لائے کہ تم بھی کسی ایسی الجھن میں گرفتار ہو۔

(فلک ناز جاتی ہے)

شہزاد۔ مجھے ہاکبوں کے نام سے نفرت ہے۔ بھوکے۔۔۔۔۔ لٹیرے۔۔۔۔۔ قاتل۔

خاور خاں۔ ایرج کی بیٹی اور بلند بخت کی بہن غیرت مند ہے۔۔۔۔۔ شہزاد! تم نے سنا۔ پرسوں کے معرکے میں ان وحشی ہاکبوں کی کیا گت بنی۔۔۔۔۔ اکثر تو کھیت رہے۔ اور بہت سے قیدی بنے۔ اور زخمی ہوئے۔۔۔۔۔ ایرج اور بلند بخت کی روحوں کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی!

شہزاد۔ اس سے کیا ہوتا ہے عمو؟ وہ تو زندہ ہونے سے رہے۔

خاور خاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو شہزاد۔۔۔۔۔ لیکن ہمارے سینے کی آگ تو اسی طرح سرد ہو سکتی ہے۔

(یاقوت آتا ہے)

یاقوت - عالی جاہ! قیدی باریابی کا منتظر ہے -

خاور خاں - حاضر کرو -

(سپاہی اور قیدی آتے ہیں)

یاقوت - خانِ عالی وقار کے حضور میں آداب بجا لاؤ -

(قیدی اور سپاہی سر جھکاتے ہیں)

خاور خاں - (ہنستے ہوئے) قیدی غیر مسلح ہے یاقوت ؟

یاقوت - مطمئن رہیئے عالی جاہ -

خاور خاں - (زور سے ہنستے ہوئے) تو سپاہی پیچھے ہٹ جائیں -

(سپاہی پیچھے ہٹ جاتے ہیں)

خاور خاں - کیا نام ہے تمہارا ؟

قیدی - کامران - میں قبیلہ ہابک کے سرداروں میں سے ہوں -

خاور خاں - ہبرک خاں کو جانتے ہو ؟

قیدی - جی ہاں - ایک تو میں اس کا قریبی عزیز ہوں دوسرے وہ آپ کی طرح قبیلے کا حاکم ہے -

خاور خاں - ہماری طرح ؟ احتیاط سے بات کرو قیدی -

قیدی - ہاں آپ ہی کی طرح - بس اتنا فرق ہے - کہ اسے خداوندِ روزگر نے یہ شان و شکوہ اور عیش و فراوانی میسّر نہیں کئے شاید آپ کو علم ہے وہاب کے اُس پار وادی اتنی اُونچی ہے کہ صرف شدید طغیانی کے وقت دریا کا پانی اُس طرف پھیلتا ہے -

خاور خاں - ٹھیک ہے تم اپنے لٹیرے پن کو اسی طرح جائز ثابت کر سکتے ہو .... لیکن تم نے ہم سے ملنے کی درخواست کیوں کی ؟

قیدی - آپ کی خدمت بجا لانے کی تمنّا ہے ...... بات یہ ہے - کہ میں اپنے سردار ہبرک خاں کا نمک کھو چکا ہوں! وہ میرا -

(خاور خاں تالی بجاتا ہے اور الماس آتی ہے)

خاور خاں - الماس! خانم سے کہو یاد کرتے ہیں -

الماس - حکم بجا لاتی ہوں عالی جاہ!

(الماس جاتی ہے)

قیدی - یوں لگتا ہے جیسے اس دوشیزہ کی رگوں میں ہابکی خون ہے -

خاور خاں - زبان بند کرو قیدی -

قیدی۔ میں چپ بھی رہوں تو کیا۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش بول رہا ہے۔

خاور خاں۔ (جوش میں آکر) خاموش!

شہزاد۔ میں ہاکموں پر ہزار لعنت بھیجتی ہوں۔

(فلک ناز آتی ہے)

خاور خاں۔ آؤ فلک ناز!

قیدی۔ آداب بجا لاتا ہوں خانم۔

خاور خاں۔ فلک ناز میرا اشارہ اس شخص کی طرف تھا۔ تم اسے پہچانتی ہو؟

فلک ناز۔ (بیزاری کے لہجے میں) ہوں۔

خاور خاں۔ یہ تمھارے قبیلے کا آدمی ہے۔ لیکن شاید اسے دیکھ کر تمھیں خوشی نہیں ہوئی۔

فلک ناز۔ یہ ایسا ہاتک ہے کہ میں بڑے سے بڑے قبیلوں کو اس پر ترجیح دیتی ہوں۔

قیدی۔ خانم میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ کہ اتنا عاف گو ہونا دانشمندی نہیں۔

فلک ناز۔ (آگے بڑھتے ہوئے) میں دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوتی۔

(فلک ناز جاتی ہے)

قیدی۔ میں نے ابھی ابھی ایک فیصلہ کیا ہے حضور۔

خاور خاں۔ کیا؟

قیدی۔ ببرک خاں کی بہن میری اس سے زیادہ تذلیل نہ کر سکتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اپنی ہر صلاحیت ببرک خاں اور اس کے خاندان کے خلاف استعمال کروں گا۔ اس مقصد کے لئے قبیلوں سے ہر ممکن تعاون کروں گا اور بڑے سے بڑا نقصان اٹھانے سے بھی دریغ نہ کروں گا۔

خاور خاں۔ ہم اس پر غور کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ یاقوت! قیدی کو محل کے جیلخانے میں رکھا جائے۔

یاقوت۔ ارشاد کی تعمیل ہوگی عالی جاہ!

(یاقوت، کامران اور سپاہی جاتے ہیں)

خاور خاں۔ شہزاد بیٹی! میرا خیال ہے یہ قیدی ہمارے کام آئے گا۔

شہزاد۔ نام تو اس کی صورت سے بیزار معلوم ہوتی تھی۔

خاور خاں۔ (ہنستے ہوئے) یہی بات تو اس کے حق میں گئی ہے ورنہ میں دشمن پر کیسے اعتبار کر سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔

(الماس آتی ہے)

الماس۔ دسترخوان بچھ گیا ہے عالی جاہ!

خاور خاں۔ آؤ بیٹی چلیں۔

(خاور خاں شہزادہ اور الماس جاتے ہیں)

دوسرا منظر

بہرک خاں۔ زربینہ! تم اتنی پریشان کیوں ہوتی ہو؟ وہ حملہ ارجمند کی سرکردگی میں ہوا تھا۔ اور اسی نے مجھے ساری واردات سنائی ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ کامران قتل نہیں ہوا۔

زربینہ۔ (پریشان لہجے میں) لیکن وہ واپس کیوں نہیں آیا..... لڑائی ہوئے چار دن گزر گئے۔

بہرک خاں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ قید ہو گیا ہوگا۔

زربینہ۔ یہ تو اور بھی بری بات ہے..... کاش ہم نے گوہر کی شادی اس کے بیٹے سے کر دی ہوتی۔

بہرک خاں۔ تم پگلی ہو۔ اگر تم اس بات سے مطمئن ہو سکتی ہو تو میں اب کر دیتا ہوں۔

زربینہ۔ اب اس کا فائدہ؟

بہرک خاں۔ میرے ساتھ کھل کر بات کرو زربینہ مجھے کس بھول بھلیاں میں ڈال رہی ہو؟ —— آخر کامران کے قید ہونے سے اس بات کا کیا تعلق؟..... اور پھر خود تم نے اس کی مخالفت کی تھی۔

زربینہ۔ پچھتا بھی تو میں ہی رہی ہوں..... تم کامران کو نہیں جانتے...... اس نے مجھے تمہارے حرم میں صرف اس لئے دیا تھا کہ تم قبیلے کے حاکم بننے والے تھے۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ اِس سے اُس کا ذاتی وقار بڑھے گا۔ میں نے اُسے تمہارے قریب نہ آنے دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اِس تعلق سے ناجائز فائدے اُٹھائے گا۔ اور بالآخر تمہارا مقام دوسرے سرداروں کی نظر میں گر جائے گا۔ اصل میں کامران کی طبیعت میں فساد ہے۔ ذرا اشارہ پالے کہ اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ تو انتہائی عداوت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے اس نے تمہارے خلاف سازش کے کیسے کیسے جال پھیلائے...... وہ جاہ و اقتدار کا بھوکا ہے۔ اور سخت کینہ پرور ہے...... تم کہتے ہو وہ قبلہ قوں کی قید میں ہوگا۔ یوں ہوا ہے تو جانے کیا طوفان کھڑا ہو...... وہ مجھ سے آخری بار ملا تھا تو اس نے مجھے یہ کہہ کر دھمکایا تھا کہ میں سارے قبیلے کو برباد کر دوں گا..... میں اُسے جانتی ہوں آخر وہ میرا بھائی ہے۔

بہرک خاں۔ تم خواہ مخواہ فکر مند ہو رہی ہو زربینہ۔ ایک تو کامران کا بچنا بھی شبہے میں ہے دوسرے اور کیا قہر ڈھالے گا وہ! ہابک اور قبلہ قوں صدیوں سے لڑتے آ رہے ہیں (ہنستے ہوئے) ایک معرکہ ذرا زیادہ بڑا ہو جائے گا اور کیا؟

زربینہ۔ تم اس طرح کی باتیں کرتے ہو تو مجھے خوف آتا ہے۔

بہرک خاں۔ اس لئے کہ ہابکوں کے بڑے خاں کی بیوی ہو..... جانے تم نے ارجمند اور فیروز جیسے دلاور بیٹے کیسے جن لئے۔ یہ انہی کا کام تھا کہ پچھلے حملے میں اتنے سپاہیوں کو دشمن کے نرغے سے نکال لائے۔

زیبنہ۔ ارجمند اور فیروز تمھاری طرح نڈر ہیں اور زیرک اور گوہر میری طرح کمزور دل والے۔

برک خاں۔ تم غلط کہتی ہو زیبنہ۔ گوہر کمزور دل والی نہیں۔ وہ تو بڑی بہادر لڑکی ہے۔ اور ...... (ہنستے ہوئے) زیرک واقعی ناکارہ ہے۔ لڑنے بھڑنے سے کوسوں دُور بھاگتا ہے۔

زیبنہ۔ (قدرے توقف سے) ارجمند اور زیرک دونوں نے اپنے اپنے گھر بسا لئے مگر فیروز کی نظر میں تو کوئی بایک سردار جچتا ہی نہیں۔ کسی کے ہاں اس کا آنا جانا نہیں ...... (آہ بھرتے ہوئے) میرے جی میں کئی بار خیال آتا ہے فلک ناز یہاں ہوتی تو شاید......

رک خاں۔ فلک ناز کا ذکر نہ کیا کرو زیبنہ۔

زیبنہ۔ بہن کا نام بھی نہیں سن سکتے؟

ل خاں۔ اس کا خیال آتا ہے۔ تو میری رگوں میں خون کھولنے لگتا ہے۔ یہ قبیلہ، یہ حکومت، یہ جنگ و جدل۔ حتیٰ کہ اپنی ساری زندگی ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں بیکار جیا ہوں۔

زیبنہ۔ یہ بات ہے تو تم نے اُسے قبلوقوں کے پنجے سے کیوں نہ چھڑا لیا۔

رک خاں۔ اس لئے کہ اس نے خود چھوٹنے کی کوشش نہ کی ...... اس معاملے میں عورت کی رضا کو ذرا سا بھی دخل ہو تو اسے واپس لانا بے معنی ہوتا ہے۔

زیبنہ۔ تو تمھارا مطلب ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ایرج خاں کے گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھی تھی ... شرم کی بات ہے۔

ل خاں۔ اتنی زیادتی نہ کرو زیبنہ۔ تمھیں پتہ ہے فلک ناز کامران سے نفرت کرتی تھی۔ اور میں بابا کی آخری خواہش کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے قبلوق سردار کی گرفت کو ایسی شادی پر ترجیح دی۔

زیبنہ۔ یہ کامران کی برکت سے ہوا۔ یا تمھاری کمزوری سے۔ فلک ناز سے عمر بھر کے لئے وطن اور قبیلہ چھوٹ گیا۔

بند۔ (باہر سے پکارتے ہوئے) بابا! ...... بابا!

رک خاں۔ آجاؤ ارجمند

(ارجمند آتا ہے ساتھ ہی زیرک اور فیروز بھی)

بند۔ (ہنستے ہوئے) زیرک اور فیروز بھی آ جائیں بابا؟

خاں۔ (ہنستے ہوئے) کیوں نہیں۔ سب آجاؤ بیٹا...... آؤ ادھر بیٹھو۔

بند۔ بابا! زیرک ہم سے پوچھ رہا تھا کہ ہاکوں اور قبلوقوں کی اس جنگجوئی کا انجام کیا ہو گا؟ آخر یہ بات کہاں جا کر ٹکے گی؟ فیروز نے کہا کہ یہ سوال بے سُود ہے۔ ہم نے جنگجوئی کی ابتدا کی ہو تو ہم اس کا انجام بھی سوچیں۔ یہ قصہ ہمارے پہلے سے چلا آ رہا ہے اور ہمارے بعد تک چلا جائے گا۔ میں نے کہا۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ زیرک ڈرپوک ہے، اس کے دل میں ہمت ہوتی تو اسے ایسی بات نہ سُوجھتی۔ اُدھر زیرک کہتا ہے کہ تم دونوں میرے سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ ایک نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور دوسرے نے پتھر دے مارا ہے۔

(ببرک خاں اور زرینہ دبی دبی ہنسی ہنستے ہیں)

ببرک خاں۔ (کھلکھلاتے ہوئے) بیٹا تم سمجھتے ہو کہ میں تم تینوں سے زیادہ دانا ہوں اور تمہاری مشکل حل کرنے کا اہل ہوں حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ مجھ میں اور تم میں صرف ایک فرق ہے کہ میں نے زندگی کے نشیب و فراز تم سے زیادہ دیکھے ہیں ...... مختلف موقعوں پر کسی نہ کسی شکل میں یہ سوال میرے ذہن میں بھی ابھرا ہے۔ اور میرا حال بھی بالکل تم سا ہے۔ کبھی میں ارجمند تھا۔ کبھی زیرک اور کبھی فیروز ...... میں بہت چھوٹا تھا فیروز سے بھی کہیں چھوٹا۔ ایک بار سخت خشک سالی آئی۔ دواب سوکھ گیا۔ درخت جل گئے۔ مٹی بھن گئی۔ پتھر چٹخ گئے۔ پرندے دواب کے اس پار اڑ گئے مویشی گر گر کے مرنے لگے۔ اور انسان ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دینے لگے ...... بابا نے سرداروں کو اکٹھا کیا اور کہا خداوند روزگار کی قسم وادی کی مٹی خون مانگتی ہے۔ اٹھو اور قبیلوں پر ٹوٹ پڑو۔ یہ نہ کرو گے تو خاک ہو کر اڑ جاؤ گے ...... اس وقت میں بابا کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا قبیلہ فوج بن کر اٹھا۔ اور دواب کے اس پار موت کی لہر بن کر پھیل گیا۔ ایسا کشت و خون میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ادھر ہم لوٹ کھسوٹ کرتے اجڑتے بستے گھروں کو لوٹتے ادھر کوہ ازلات سے باد و باراں کا طوفان اٹھا اور وادی جوداں پر چھا گیا۔ دواب میں ایسی طغیانی آئی کہ اس طرف والا اونچا حصہ بھی جل تھل ہو گیا۔ وادی جی اٹھی فضائیں بس گئیں۔ اور بستیاں آباد ہو گئیں ...... بابا مجھ سے کہا کرتا تھا۔ ببرک یہ نسخہ میری ایجاد نہیں ورثے میں چلا آ رہا ہے ...... (آہ بھرتے ہوئے) ایک شبخون میں ابرج خاں فلک ناز کو اٹھا کر لے گیا۔ سبب چاہے کوئی بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی بھر کے جنگ و جدال کے باوجود میں اپنی بہن کو دشمن کے چنگل سے نہ چھڑا سکا ...... زیرک خاں! تم چاہے زبان سے اقرار نہ کرو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس وقت تمہارے خون کے اندر بھی چنگاریاں دوڑنے لگی ہیں۔ اور عجب نہیں کہ اس عالم میں تمہارا ہاتھ بھی قبضۂ شمشیر تک جا پہنچے ...... یہ خداوند روزگار ہی جانتا ہے کہ انسان کے دل میں غیرت اور انتقام کے شعلے کیوں دہکتے ہیں ...... (بھرائی ہوئی آواز میں) اور اپنی ماں سے پوچھو ...... میں ابھی کہہ رہا تھا۔ کہ فلک ناز کا خیال آتا ہے تو مجھے اپنی ساری زندگی بے کار نظر آتی ہے اب میں کیا بتاؤں کہ ہتھیار کیوں اٹھائے جاتے ہیں ...... کبھی زمین کی مٹی اس کا تقاضا کرتی ہے کبھی دل کی آگ اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور لہو گرائے بغیر نہ زمین کی مٹی جی سکتی ہے۔ نہ دل کی آگ بجھ سکتی ہے ایسا کیوں ہے؟ ...... (بھرائی ہوئی آواز میں) یہ مجھ سے نہ پوچھو۔ میرے بیٹو۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ میں تو یہی جانتا ہوں کہ فلک ناز میری زندگی کی سب سے بڑی شکست ہے!

(ببرک خاں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں)

تیسرا منظر

خاور خاں۔ کامران! ہم نے تمہارے اور ببرک خاں کے تعلقات کو خوب سمجھ لیا ہے۔ تم اپنی وفاداری کا مزید یقین نہ دلاؤ ہم تمہا

خدمات قبول کرتے ہیں۔

کامران ۔ یہ حضور کی عنایت ہے۔ میں ہاک نژاد ہوں مگر آج میں اپنے نسب پر فخر کرتا ہوں۔

خاور خاں ۔ ان الفاظ کی ضرورت نہیں کامران۔ ۔ اپنی نیت اپنے عمل سے دکھاؤ۔

کامران ۔ آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔

خاور خاں ۔ کامران! ایک بات ہمیشہ میرے دل میں کھٹکتی رہی ہے شاید تم تسکین کر سکو۔

کامران ۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر تسکین کیا ہوگی!

خاور خاں ۔ پرانے واقعات بھی سنے ہیں اور خود بھی دیکھا ہے۔ ایک عام ہاک لڑائی کے میدان میں ایک عام قبلاق کی بہ نسبت کہیں زیادہ دلیر اور ثابت قدم ہے۔ حالانکہ قبلوق ہاکوں سے کہیں زیادہ خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟

کامران ۔ (ہنس کر) سبب تو حضور نے خود ہی بیان کر دیا ہے خوشحالی اور فراوانی ہمیشہ جنگاہ سے دور رہتی ہے۔ اور تنگدستی اور سخت کوشی کا ایک قدم ہر وقت کارزار میں ہوتا ہے۔ ہاکوں کی سرزمین خشک اور پتھریلی ہے۔ وہ جفاکش نہ ہوں تو زندہ کیسے رہیں۔ قبلوقوں کا وطن زرخیز ہے۔ انھیں جانفشانی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ . . . . . اور گستاخی معاف اگر آپ کی مملکت کا شمالی علاقہ پہاڑی نہ ہوتا۔ اور آپ کے اکثر سپاہی وہاں کے رہنے والے نہ ہوتے تو شاید ہاک آپ کو غلام بنا چکے ہوتے۔

خاور خاں ۔ تمہارا مطلب ہے۔ ہم کبھی ہاکوں پر غالب نہیں آ سکتے۔

کامران ۔ کیوں نہیں آ سکتے؟ ضرور آ سکتے ہیں۔

خاور خاں ۔ کیسے؟

کامران ۔ اس غلام کی صلاحیتوں کی قدر کیجئے۔

خاور خاں ۔ ہم اس کے لئے تیار ہیں۔

کامران ۔ جنگی معاملات میری تحویل میں دے دیجئے۔ اور کامیابی ہو تو رباب کے اس پار کی عملداری مجھے تفویض فرمائیے۔

خاور خاں ۔ (قدرے توقف کے ساتھ) ہم اس پر غور کریں گے . . . . . مگر جو کام اتنی صدیوں میں نہ ہوا وہ تم کیسے کر لوگے؟

کامران ۔ انسان کے ذہن کی کوئی حد نہیں حضور۔ ہو سکتا ہے۔ آج سے پہلے کسی نے اس مقصد پر توجہ ہی نہ دی ہو اور اگر یہ ہوا بھی ہو تو اس کے لئے صحیح طریق کار نہ اختیار کیا گیا ہو۔ اس پچھلے مقابلے کو لیجئے ہاکوں کا کتنا نقصان ہوا۔ اس کا باعث صرف یہ تھا۔ کہ قبلوقی سالار نے ہوشیاری اور چابکدستی سے کام لیا . . . . . . آخر وہ کونسا عقدہ ہے جسے ناخنِ تدبیر وا نہیں کر سکتا؟

(ایک طرف آہٹ ہوتی ہے)

خاور خاں ۔ (بلند غضبناک آواز میں) ٹھہر جاؤ۔ اس پردے کے پیچھے کون ہے؟ . . . . فلک ناز تم میرے تخلیے میں . . .

(شہزادی ہنستی ہوئی اور نافہ کو کھینچتی ہوئی آتی ہے)

خاور خاں۔ اوہ تم ہو شہزادو تم ہو...... میں سمجھا فلک ناز ہے۔
شہزاد۔ یہ نافہ بڑی شریر ہے عمو۔ آپ کی خوابگاہ میں گھس گئی۔
کامران۔ کتنی خوبصورت اور پیاری ہرنی ہے۔ اور اس کا نام کتنا خوشبودار اور پیارا ہے۔
خاور خاں۔ قبلوتوں کی سرزمین کی حسین سے حسین اور قیمتی سے قیمتی شئے شہزاد کے قدموں میں ہے۔ کیونکہ شہزاد اس سرزمین کی سب سے حسین اور قیمتی شئے ہے!
کامران۔ اس میں کیا شک ہے!
خاور خاں۔ کامران، شہزاد اور نافہ ہر روز سہ پہر کے وقت شہر پناہ کے باہر سیر کو جاتی ہیں۔
کامران۔ بہت خوب۔ کتنی بھلی لگتی ہیں دونوں۔
خاور خاں۔ جاؤ بیٹی۔ گھوم آؤ...... اور سنو آج کسی کنیز کو ساتھ نہیں لے جاؤ گی؟
شہزاد۔ نہیں عمو۔

(شہزاد نافہ کی زنجیر تھامے چلی جاتی ہے)

کامران۔ شہزاد کی شکل فلک ناز سے کتنی ملتی ہے!
خاور خاں۔ لیکن اس کی طبیعت مجھ سے ملتی ہے!...... جاؤ کامران ہم تمہارے معاملے پر مزید غور کر لیں گے تو تم پر سے باقی پابندیاں بھی ہٹا لی جائیں گی۔
کامران۔ حضور کی نوازش۔ غلام تو آپ کا ہو چکا۔

چوتھا منظر

ہبرک خاں۔ زرینہ! جانے میں اتنا توہم پرست کیوں ہوتا جا رہا ہوں۔
زرینہ۔ کیوں کیا بات ہے؟
ہبرک خاں۔ پانچ سات روز ہوئے مجھے ایک خواب آیا۔ میں نے اسے بھلانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ رہ رہ کر میرے خیال سے الجھتا ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ حقیقت بن کر رہے گا۔
زرینہ۔ تم تو شاید اسے کچھ دیر اور دبا سکو مگر میں وہ خواب سنائے بغیر نہیں رہ سکتی، جو مجھے آج رات آیا۔
ہبرک خاں۔ نہیں نہیں۔ میں اسے دبا سکتا تو تم سے کیوں کہتا۔ سنو۔ میں نے دیکھا کہ میں بڑی تیزی سے ہوا میں اڑتا جا رہا ہوں، گہرے کالے بادل میرے دائیں بائیں اوپر نیچے سے گزر رہے ہیں پھر یک لخت میرے قدم زمین پر ٹھہرتے ہیں اور میں فلک ناز کو اپنے سامنے کھڑی پاتا ہوں۔ میں اسے اپنے ساتھ آنے کو کہتا ہوں تو وہ انکار میں سر ہلا دیتی ہے میں پھر پرواز کرنے لگتا ہوں اور آناً فاناً سارے کا سارا آسمان سرخ ہو جاتا ہے میں اڑتا اڑتا کہیں کا

کہیں پہنچ جاتا ہوں۔ میرے پاؤں زمین سے لگتے ہیں اور میں مڑ کر دیکھتا ہوں کہ افق کے ایک طرف سُرخی چھیٹی ہوئی ہے اور خطرناک انار اُڑتی ہوئی میری طرف آرہی ہے۔ وہ زمین پر اُترتی ہے تو میں اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیتا ہوں اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

زرینہ ۔ ہاں جو کام زمین کے راستے نہ ہوئے وہ ہوا کے راستے ہی ہوں گے۔

ببرک خاں ۔ تم اتنی سنگ دل کیوں ہو زرینہ؟ تم ہمیشہ میری دُکھتی رگ کو چھیڑتی ہو۔

زرینہ ۔ چلو ہٹاؤ اس جھگڑے کو اور میرا خواب سنو .... میں دیکھتی ہوں کہ ہم دونوں اپنے صحن میں انار کے درخت کے پاس کھڑے ہیں اور اس پر لگے ہوئے چار پکے اناروں کو دیکھ رہے ہیں۔ یک بیک آندھی چلنے لگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے سب سے بڑا انار سُرخ ہو جاتا ہے پھر اس سے چھوٹا پھر اس سے چھوٹا۔ پیشتر اس کے کہ سب سے چھوٹا انار سُرخ ہو تم اُسے جھٹ اچک کر توڑ لیتے ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے درخت جڑ سے اُکھڑ جائے گا اور میں آگے بڑھ کر اس سے چمٹ جاتی ہوں اور اسے اپنی جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہوں مگر وہ تڑاق سے ٹوٹ جاتا ہے اور میں اس کی شاخوں میں اُلجھی ہوئی زمین پر گر پڑتی ہوں اور جاگ اُٹھتی ہوں .... میرا دل اس وقت سے اب تک پریشان ہے۔

ببرک خاں ۔ میں تو یونہی بہک گیا۔ اور تم بھی بے کار فکرمند ہوتی ہو۔ یہ خواب تو نہیں خیالات کی تلچھٹ ہے جو نیند کے پردے پر اُبھرتی ہے۔

فیروز ۔ (باہر سے پکارتے ہوئے) بابا۔

ببرک خاں ۔ آؤ فیروز۔ آجاؤ۔

(فیروز آتا ہے)

فیروز ۔ بابا وادی کے ہر علاقے سے قحط کی خبریں آرہی ہیں۔

ببرک خاں ۔ تم ہی کہو کیا کرنا چاہیے۔

فیروز ۔ میں نے ارجمند اور زربرک کے ساتھ گفتگو کی ہے اور انھوں نے میری اس تجویز کو پسند کیا ہے کہ ہم تینوں اپنے اپنے ماتحت سرداروں کو ساتھ لے کر وادی کے دورے پر نکلیں اور دیکھیں کہ صورت کیا ہے۔

ببرک خاں ۔ مجھے اس بات سے پُورا اتفاق ہے بیٹا۔ تم کل صبح روانہ ہو جاؤ اور دیکھو۔ داب کے کنارے کا جائزہ میں خود لوں گا۔

زرینہ ۔ فیروز تمھارے ماتحت سردار کون ہیں؟

فیروز ۔ (ہنس کر) ماں کو معلوم ہے ماں۔ مجھ سے کیوں پوچھتی ہو۔

زرینہ ۔ (مسرور لہجے میں) تم ہنستے کیوں ہو بیٹا۔

فیروز ۔ (ہنستے ہوئے) اس لئے کہ میں تمھاری بات سمجھتا ہوں۔

زرینہ ۔ تو پھر جواب دو۔

فیروز۔ (ہنس کر) اچھا تو اِس صورت میں کوئی سردار میرے ماتحت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اجازت ہے بابا ؟

ببرک خاں۔ (مسرور لہجے میں) جاؤ بیٹا۔ خداوند روزگر تمھارا محافظ ہو۔

زرینہ۔ (آہ بھر کر) میرے اِس بیٹے کے لائق لڑکی ہی قبیلے میں کونسی ہے !

ببرک خاں۔ تم نے دیکھا زرینہ ؟ فیروز نے کیسی اچھی تجویز پیش کی ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وادی میں خطرے کے آثار ہیں یا نہیں۔ دوسرے لوگوں کے حوصلے بندھ جائیں گے۔ مزید یہ کہ حاکم میں اعتماد بڑھے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم بجا کہتی ہو زرینہ۔ فیروز بے بہا ہیرا ہے۔

پانچواں منظر

شہزاد۔ نافہ ! ۔ ۔ ۔ ۔ نافہ !

(گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آتی ہے۔ پھر یک لخت
گھوڑا رُک جاتا ہے اور سوار نیچے اُترتا ہے)

ببرک خاں۔ کوئی اور گھوڑا ہوتا تو سموں تلے روند دیتا ۔ ۔ ۔ کتنی خوبصورت ہرنی ہے اور اس کا نام کتنا پیارا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جان بچ گئی ہے اس کی ۔ ۔ ۔ یہ تو دوشیزہ ! ۔ ۔ ۔ ذرا ٹھہرو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ تم سہم گئی ہو بیٹی ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے معاف کر دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں تمھیں نظر بھر کے دیکھ سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ میرا حق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تمھیں پہچان لیا ۔ ۔ ۔ تم سوچ رہی ہو میں کون ہوں ۔ ۔ ۔ تم مجھے نہیں جانتیں مگر جس کے چہرے کا عکس تمھارے چہرے میں جھلک رہا ہے وہ مجھے جانتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہی ایک سردار ببرک خاں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہو، تم میرا نام سن کر ٹھٹک گئی ہو ! ۔ ۔ ۔ میں دماب کے اُس پار دَورہ کر رہا تھا کہ میرے جی میں آیا، چلو خاورخاں کے شہر پہ بھی ایک نظر ڈال لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہاں تمھاری نافہ نے تم سے مِلا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس وقت نہیں بیٹی ۔ ۔ ۔ ۔ صاف صاف کہہ دیتا ہوں فیروز میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے مگر اُس جیسا بہادر اور ہوشمند نہ کوئی ہی ایک نوجوان ہوگا نہ قبیلوں ۔ ۔ ۔ ۔ شاید خداوند روزگر اس بات میں راضی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ چاہو تو نافہ اور تم ابھی رخش کی پیٹھ پہ بیٹھ جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چاہو تو یہ پھر کسی روز اکیلا یہاں آ کھڑا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ رخش جیسا گھوڑا آج تک پیدا نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہوا سے زیادہ تیز دوڑتا ہے اور دشمنوں کی صفوں میں سے بجلی کی طرح تڑپ کر نکلتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وادی، جنگل، پہاڑ، دریا کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور پھر اپنے سوار کو کبھی نہیں گرنے دیتا ۔ ۔ ۔ ۔ جتنے یقین سے اپنے پاؤں پر چل رہی ہو اُتنے ہی یقین سے اُس کی پیٹھ پر بیٹھ سکتی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ کہو رخش کب تمھاری سواری کے لئے حاضر ہو بیٹی ؟

شہزاد۔ (ببرک خاں کے منہ پر تھوکتے ہوئے) تھو !

ببرک خاں۔ (آہ بھرتے ہوئے) تم نے میرے منہ پر تھوک دیا بیٹی ! مجھے اِس کی اُمید نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے باوجود میری

آرزو مرتے دم تک رہی رہے گی ..... خداوند روزگر تمھارا اور تمھاری نافہ کا نگہبان ہو!
(رخش کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آتی ہے)

چھٹا منظر

ورخاں - یاقوت! کامران کو حاضر کرو -
ؤت - ابھی پیش کرتا ہوں عالی جاہ!

(یاقوت جاتا ہے)

ررخاں - (چیختے ہوئے) اِس ہاکی کُتّے کی یہ دلیری! ..... میرے شہر کی فصیل کے سائے میں ایرج کی بیٹی کو ورغلائے .....
اور زندہ واپس چلا جائے! ..... خاورخاں! آج ایرج کی رُوح تجھے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ تیری نظر میں شہزاد
کی کیا قیمت ہے ..... ایرج! ..... ایرج! میں ایک ایک، ہایک کو انتقام کی آگ میں جھونک دوں گا .....
خونیں زمین ان کے پاؤں کے نیچے بھڑک اُٹھے گی اور سرسرانے ہوئے شعلے ان کے سروں کے اُوپر لہرائیں گے
دماب کے اس پار بربادی کی ایسی صف بچھ جائے گی کہ زندگی کی طوفانی سے طوفانی لہر بھی اُسے نہ لپیٹ سکے گی -
(یاقوت آتا ہے)

رت - کامران حاضر ہے عالی جاہ!
رخاں - آنے دو -

(کامران آتا ہے)

ان - غلام آداب بجا لاتا ہے -
رخاں - بیٹھ جاؤ کامران ..... ہمیں تمھارے مشورے کی ضرورت ہے -
ان - میں ارشاد کا منتظر ہوں -
رخاں - آج سہ پہر کوز بیک خاں شہر کی فصیل تک چڑھ آیا -
ان - اچھا؟
رخاں - یہی نہیں اُس نے شہزاد کو پھسلانے کی کوشش کی - وہ چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کی شادی اس سے کر دے -
ران - فیروزکی؟ ..... ہُوں ..... پھر آپ غور کر رہے ہیں اس تجویز پر -
رخاں - کامران! ہوش کی بات کرو -
ران - میں نے یہ گستاخی اِس لئے کی کہ آپ ہر تجویز پر غور کرتے ہیں -
رخاں - میں سمجھ گیا - مجھے یاد ہے تمھاری ایک تجویز تھی -

کامران - جس پر حضور اتنی دیر غور کرتے رہے - بہر حال اجازت ہو تو عرض کروں -

خاور خاں - کہو -

کامران - سوال یہ ہے کہ کیا برک خاں صرف شہزاد کو لینے آیا تھا ؟ . . . . . میں کہتا ہوں - نہیں - میرے قید ہونے کے وقت ہی اس کی مملکت میں قحط کے آثار تھے اور میں سنتا ہوں کہ اب وہ اور بھی نمایاں ہو گئے ہیں - اس کا علاج اس کے پاس قبلو قوں پر حملے کے سوا کوئی نہیں . . . . . اس بار برک شہر پناہ کے نیچے تھا تو اگلی بار اس محل کے اندر ہوگا - حضور اسے نہیں جانتے ، وہ بلا ہے اور اس کا گھوڑا رخش ہزار بلاؤں کی ایک بلا -

خاور خاں - کامران ! حقیقت یہ ہے کہ میں نے مسئلے کو اس رنگ میں دیکھا ہی نہیں تھا - میں معاملات جنگ تمہارے سپرد کرنے کے لئے تیار ہوں اور تمہیں ہاکوں کا سردار بنانے کا وعدہ کرتا ہوں بشرطیکہ تم اس معاہدے کو اپنے آپ تک محدود رکھو کیونکہ قبلوق سردار اس کی مخالفت کریں گے -

کامران - حضور کا ممنون ہوں لیکن دو ایک کام فی الفور کرنے کے ہیں . . . . . اسی وقت جنگ کا فیصلہ کیجیے اور ابھی تمام قبلوق سرداروں کو اس سے مطلع کر دیجیے - کل معبد اعلیٰ پر قربانی پیش کیجیے اور راہب اعظم سے اپنے فیصلے کی تائید حاصل کیجیے - میں جنگ کا نقشہ اور فوجی تدابیر مرتب کر کے جلد از جلد حضور کی خدمت میں پیش کر دوں گا -

خاور خاں - ہم تمہاری خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اب تم پر کوئی پابندی نہیں -

کامران - حضور نے مجھے رہا نہیں کیا بلکہ فرائض کی سنگین ترقید میں ڈال دیا ہے -

خاور خاں - الماس !

(الماس آتی ہے)

خاور خاں - الماس ! شہزاد کو بلاؤ -

(الماس جاتی ہے)

خاور خاں - کامران ! تمہارا شکریہ - تم آرام کر سکتے ہو -

(کامران جاتا ہے اور شہزاد آتی ہے)

شہزاد - کیا بات ہے عمو ؟

خاور خاں - شہزاد ! تم فلک ناز سے الگ رہو !

شہزاد - (انتہائی پریشان لہجے میں) عمو ! عمو ! . . . . . میں ماں سے الگ رہوں ! . . . . . یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ . . . . . اور آخر کیوں ؟

خاور خاں - تم نادان ہو شہزاد -

شہزاد - (بھرائی ہوئی آواز میں) میری سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے -

خاور خاں - یاقوت !

(یاقوت دوڑتا ہوا آتا ہے)

یاقوت - عالی جاہ!
خاور خاں - سالارِ محل کو حاضر کرو۔

(یاقوت دوڑتا ہوا جاتا ہے)

خاور خاں - الماس! ...... الماس!

(الماس آتی ہے)

الماس - خادمہ حاضر ہے عالی جاہ!
خاور خاں - فلک ناز کہاں ہے؟
فلک ناز - (فاصلے سے) میں آ رہی ہوں۔ حکم دینے کی زحمت نہ اٹھاؤ۔ کہو۔
خاور خاں - سن لیا۔ تم نے بھائی کا کارنامہ؟
فلک ناز - ہاں۔ سارا محل سن رہا ہے ..... میرے بھائی کا کارنامہ تمہارے بھائی کے کارنامے سے کم تر ہے ... ایرج مجھے اٹھا لایا تھا۔
خاور خاں - فلک ناز! زبان کو روکو۔
فلک ناز - خاور خاں! ہوش میں آؤ۔
خاور خاں - میں ہاکوں کا نشان تک نہ چھوڑوں گا۔
فلک ناز - مجھے اس کا بڑا غم ہوگا۔
خاور خاں - تمھیں یہ غم ہے کہ مجھے خوشی ہوگی۔
فلک ناز - خداوند روزگار تمہاری خوشی کو غارت کرے!

(فلک ناز جاتی ہے)

خاور خاں - کیا عورت ہے یہ! ..... اس کی روح آج تک زخمی ہے ..... اس کی حمیت کتنی بیدار ہے! ..... اور کتنا بے باک ہے ببرک! ..... شہر کے دروازے تک آ گیا ..... اور میں؟ ..... میں آج تک دواب کے پار نہ جا سکا ..... لیکن اب ہاک بچ نہیں سکتے ..... آج کامران میرے ہاتھ میں ہے ..... میں لوہے کو لوہے سے توڑ دوں گا۔

(یاقوت اور ہرمز آتے ہیں)

یاقوت - عالی جاہ! سالارِ محل حاضر ہے۔
خاور خاں - ہرمز! اسی وقت خاص ہرکارے دوڑاؤ اور ہر قبیلوں سردار کو آگاہ کر دو۔ کہ ہاکوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کر دیا گیا ہے ..... اور دیکھو ہرمز! فلک ناز کی قیامگاہ پر پہرہ لگا دو۔ ابھی! —— اسی وقت!

ہورماز:- } (ایک ساتھ چیختے ہوئے) —— احکام بجا لاتا ہوں عالی جاہ!
شہزاد:- } —— عمّو! . . عمّو! . . . . یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟

(ہورماز جاتا ہے)

خاور خاں۔ تم نہیں جانتیں شہزاد!

شہزاد۔ میں نہیں جانتی عمّو . . . . . لیکن ماں کا کیا گناہ ہے؟

خاور خاں۔ شہزاد! جاؤ! . . . چلی جاؤ! . . . . . جاؤ!

شہزاد۔ میں نہیں جاؤں گی عمّو . . . . . مجھے بتاؤ ماں نے کیا جرم کیا ہے!

خاور خاں۔ تم نہیں جاؤ گی تو میں چلا جاتا ہوں —— یہ لو!

(خاور خاں جاتا ہے)

شہزاد۔ (اپنے آپ سے نہایت پریشان اور بہ اذیت لہجے میں) مجھے ماں سے الگ کر دیا! . . . . . ماں کی قیام گاہ پر پہرہ بٹھا دیا! . . . یہ کیا ہو گیا ہے عمّو کو؟ . . . . . کاش میں وہ بات عمّو سے نہ کہتی! . . . . . اب کیا ہو گا؟ . . . . جانے عمّو اور کامران کی یہ لمبی لمبی خفیہ ملاقاتیں کیوں ہوتی ہیں؟ عمّو سچ مچ بابکوں کا نام و نشان مٹا دے گا؟ . . . . ماں کے دل پر کیا گزرے گی؟ . . . . . اور ماں کی وہ بات کتنی صحیح تھی! . . . ببرک خاں چاہتا تو مجھے اٹھا کر گھوڑے پر ڈال لیتا . . . مگر اُس نے ایسا نہ کیا . . . اور میں نے اس کے مُنہ پر تھوک دیا! . . . . اور اب اس کا سب کچھ برباد ہو جائے گا . . . . . ماں مجھے کبھی معاف نہ کرے گی . . . . میں ماں کو کیا مُنہ دکھاؤں گی!

(ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز)

ساتواں منظر

ببرک خاں۔ دیکھو ارجمند سارے عمل کو اچھی طرح سمجھ لو۔ میں اور زبرک اور فیروز ٹھیک اسی جگہ کھڑے رہیں گے۔ تم اس سفید بکرے کو اُٹھائے دوڑتے جاؤ گے یہاں تک کہ وہ سامنے چٹان کے اوپر معبد میں جا پہنچو گے وہاں تم ایک بوڑھی راہبہ کو آتشکدے کے پاس بیٹھے پاؤ گے۔ وہ تم سے بات نہیں کرے گی، صرف ایک چھُری تمہارے ہاتھ میں دے دے گی جس سے تم آتش کدے کے قریب قربان گاہ کے پتّھر پر بکرے کی گردن کاٹو گے۔ جب اس کا خون پتّھر سے آتش کدے میں ٹپکنے لگے تو تم دوڑتے ہوئے واپس آ جاؤ گے۔

(ارجمند بکرے کو اُٹھا کر دوڑتا ہے)

ببرک خاں۔ فیروز اور زبرک تم غور سے دیکھتے رہنا۔ جب بکرے کا خون آتش کدے میں گرے گا تو چٹان کے اُوپر سے نکلتے ہوئے دھوئیں کا رنگ سُرخ ہو جائے گا اس وقت تم خاموش ہو جاؤ گے اور میں خداوند روزگر کے سامنے التجا کروں گا۔ کچھ

دیر بعد بوڑھی راہبہ چٹان کے اوپر کھڑے ہو کر پکارے گی - اُس کے الفاظ انتہائی توجہ سے سُننا - اُن میں میری دُعا کا جواب ہوگا -

یک - بابا ہم بھی خداوند روزگر کو پُوجتے ہیں اور قبیلو تی بھی اس کی پرستش کرتے ہیں - یہ کیا بات ہے ؟

خان - زیرک ! خداوند روزگر نہ ہاکبوں کا ہے نہ قبیلو توں کا - اس کی خداوندی تو ایک آئینہ ہے جس میں جو جی چاہے اپنی رُوح کا عکس دیکھ لے - ہمارے بزرگ اپنے عزائم اور اعمال کی حقیقت اسی طرح جانچتے آئے ہیں اور میرا خیال ہے اس سے بہتر اس کا کوئی طریقہ نہیں -

دوز - مگر بابا اس سے پہلے تو تم نے یہ عمل کبھی نہیں کیا -

خان - آج تک ایسا مرحلہ پیش نہ آیا تھا بیٹا - میرے بابا نے قحط کے وقت ایسا کیا تھا - اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہو کہ آج قبیلے پر کیا گزر رہی ہے -

روز - بابا ...... وہ ... وہ دیکھو .. دھواں خون کی طرح سُرخ ہو گیا -

خان - خاموش !

(مختصر وقفہ)

خان - (بلند آواز اور مؤدب لہجے میں) خداوند روزگر ! تیری عظمت اس سرزمین پر صدیوں سے سایہ افگن ہے ... تو ہمیشہ سے قبیلۂ ہاکب کا نگہبان اور مددگار ہے .... تیری رحمت سے آفت راحت میں اور سزا انعام میں تبدیل ہو سکتی ہے ..... تو مہربان ہو تو کمی بیشی پر اور زیردستی زبردستی پر غالب آ سکتی ہے ...

خداوند روزگر ! تیرے آسمان سے بارش کی برکت نہ اُتری .... تیرا داب یاب ہو چکا اور تیری یہ سرزمین آج پانی کو ترستی ہوئی دم توڑ رہی ہے ..... مویشی مر رہے ہیں فصلیں سُوکھ رہی ہیں - گاؤں اُجڑ رہے ہیں ...

خداوند روزگر ! میں نے تیرے معبد پر ایک معصوم سفید برّے کی حقیر قربانی پیش کی ہے تو اسے قبول فرما اور میری رہنمائی کر -

خداوند روزگر ! تو مجھے بتا کہ قبیلو توں کے ساتھ جنگ کروں - تو میرے قبیلے کو فتح ہوگی یا نہیں ؟

خداوند روزگر ! میری دُعا کا جواب دے !

(مختصر وقفہ)

(آندھی کا سا شور)

(راہبہ کی کپکپاتی ہوئی آواز آتی ہے)

" ناکامی ...... کے ..... ساتھ ..... کامیابی .. ہے "

" ناکامی ..... کے ..... ساتھ ..... کامیابی ..... ہے "

" ناکامی ..... کے ..... ساتھ ..... کامیابی ..... ہے "

(آندھی کا سا شور آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے)

ببرک خاں۔ ناکامی کے ساتھ کامیابی ہے۔ یہی الفاظ تھے نا فیروز؟ ..... کیوں زیرک! تم نے بھی یہی سُنا؟ ..... ناکامی کے ساتھ کامیابی ہے۔

(ارجمند دوڑتا ہُوا آتا ہے)

ارجمند۔ (ہانپتے ہوئے) کیوں بابا؟ ..... کیا کہا ہے خداوند نے؟ آواز تو آئی تھی مگر میں صاف نہیں سُن سکا۔

فیروز۔ ارجمند! خداوند نے کہا ہے ناکامی کے ساتھ کامیابی ہے۔

زیرک۔ میرا خیال ہے جنگ کا نتیجہ ہمارے خلاف ہوگا۔

ارجمند۔ نہیں زیرک میں تو اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ فتح آخر کار ہماری ہوگی۔

ببرک خاں۔ جلد بازی غیر مناسب ہے۔ میں اس پر غور کروں گا۔ چند روز انتظار کرو۔

آٹھواں منظر

خاور خاں۔ اے راہب اعظم! میں قبیلہ قبلوں کا حاکم معبدِ اعلیٰ کی قربان گاہ پر ایک ہزار سفید بڑہ، ایک سو سفید گوسالہ عسل مصفیٰ اور شراب ناب کے ایک سو خُم اور عطرِ لوبان کے پچاس طشت پیش کرتا ہوں۔ تو خداوند روز گر سے میرے لئے اس بارے میں رہنمائی حاصل کر کہ ناکوں کے خلاف میں نے جنگ کا جو فیصلہ کیا ہے وہ میرے حق میں کیسا ہے۔ میں نے یہ قدم قبیلۂ قبلوں کی حسین ترین دوشیزہ شہزادی کی عزت کی خاطر اُٹھایا ہے۔ اس وقت تمام قبلوں سردار اور ہزاروں شہری معبدِ اعلےٰ کے دروازے پر منتظر ہدایت کھڑے ہیں!

راہب اعظم۔ خاور خاں! میں تیری قربانی خداوندِ روز گر کے حضور میں پیش کرتا ہوں اور اس سے سفارش کرتا ہوں کہ تیری رہنمائی فرمائے۔

(ایک گونج سی پیدا ہوتی ہے اور ایک لرزتی ہوئی آواز آتی ہے)

"کامیابی ..... کے ..... ساتھ ..... ناکامی ..... ہے"

"کامیابی ..... کے ..... ساتھ ..... ناکامی ..... ہے"

"کامیابی ..... کے ..... ساتھ ..... ناکامی ..... ہے"

(گونج آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے)

خاور خاں۔ کامیابی کے ساتھ ناکامی ہے ..... اس کا مطلب ہے میرے لئے جنگ کا انجام شکست ہے۔

کامران۔ بالکل نہیں حضور۔ اس کا مطلب تو صاف یہ ہے کہ آپ کو کامیابی ہوگی۔

خاور خاں۔ مگر کامران یہ ناکامی کا لفظ کیوں آیا ہے؟

کامران — حضور! "آپ کے ساتھ" کا لفظ کیوں بھول رہے ہیں کامیابی کے ساتھ ناکامی ہے ——— اس کے معنی تو صرف یہ ہیں کہ "فتح" آپ کی ہے — مگر آپ کو کچھ نقصان اٹھانا پڑے گا — ظاہر ہے چند آدمی تو آپ کے بھی جنگ میں کام آئیں گے۔

خاور خاں — ٹھیک ہے۔ بس اب گرہ کھل گئی کامران — یہ تو بالکل فتح کا وعدہ ہے۔

کامران — میں آپ کو مبارک پیش کرتا ہوں — اب اٹھیے اور قبیلوں کے سرداروں اور شہریوں کو خوشخبری دیجئے۔

(خاور خاں معبدِ اعلیٰ کے دروازے پر آتا ہے)

(ہجوم کا شور سنائی دیتا ہے)

خاور خاں — معزز سردارو اور عزیز شہریو! تمہیں مبارک ہو! خداوندِ روزگر نے تمہاری قربانی قبول فرمائی ہے.....

(تحسین کا شور)

خداوندِ روزگر نے تم سے فتح کا وعدہ کیا ہے۔

(اور زیادہ شور)

اور سنو! ہم بابکوں کے خلاف یہ جنگ ایک دوشیزہ کی عصمت کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ اس لئے انتہائی پاکیزہ خیالات کے ساتھ ہتھیار اٹھاؤ اور عہد کرو کہ بابکوں کا نام و نشان نہ چھوڑو گے!

خداوندِ روزگر تمہارا مددگار ہو!

(نعرہ ہائے تحسین اور شور)

(شہری عہد کرتے ہیں گاتے اور ناچتے ہوئے)

عطر بکھیرو، عطر بکھیرو، سلگاؤ لوبان — سلگاؤ لوبان
ہر دشمن اس بار کٹے گا ہر تو بیر اس بار جلے گا — پھر باندھو پیمان
سب باندھو پیمان سلگاؤ لوبان
عطر بکھیرو، عطر بکھیرو، سلگاؤ لوبان — سلگاؤ لوبان
پھر باندھو پیمان

نیزہ اپنا سر بابک کا خنجر اپنا سر بابک کا
سب باندھو پیمان سلگاؤ لوبان
عطر بکھیرو، عطر بکھیرو، سلگاؤ لوبان — سلگاؤ لوبان
آگے بڑھو تو دل بھی بڑھے گا خون کا نشہ زور چڑھے گا — پھر باندھو پیمان
سب باندھو پیمان سلگاؤ لوبان
عطر بکھیرو، عطر بکھیرو، سلگاؤ لوبان — سلگاؤ لوبان
پھر باندھو پیمان

نواں منظر

فیروز۔ (ہانپتے ہوئے) غضب ہو گیا بابا!

ببرک خاں۔ کیوں فیروز؟ کیا ہوا؟

فیروز۔ (ہانپتے ہوئے) تغلوق فوجیں ومابؔ کے اس پار اتر آئیں بابا۔ بیک وقت کئی بستیوں پر حملے کئے ہیں انھوں نے اور برابر آگے بڑھ رہی ہیں۔ . . . قحط کے مارے ہوئے ہاتک ان کے پاؤں میں تنکوں کی طرح ٹوٹتے جا رہے ہیں بابا۔

ببرک خاں۔ ارجمند اور زیرک کو بلاؤ فیروز ——— فوراً۔

زرینہ۔ یہ خبر سن کر مجھے وہ اناروں والا خواب یاد آ گیا ہے۔

ببرک خاں۔ ہیں؟ ——— ہاں . . . تم پگلی ہو زرینہ . . . . . اور سنو میں نے ایک بات تم سے چھپا رکھی ہے۔ میں ایک دن فلک ناز کی بیٹی سے ملا تھا۔

زرینہ۔ کیا؟ فلک ناز کی بیٹی؟

ببرک خاں۔ ہاں۔ تغلوقوں کے شہر کے باہر۔ وہی شکل و صورت وہی چال ڈھال جانے مجھے کیا سوجھی۔ میں نے اس سے فیروز کی بات کر دی اور . . . . (زہرخند کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں) . . . . اور اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔

زرینہ۔ تھوک دیا؟

ببرک خاں۔ ہاں . . . . . اور میرا دل اس وقت سے اب تک بے چین ہے . . . . . ٹھیک ہی کیا اس نے . . . . میں اسی کا مستحق تھا . . . . . تم بولتی نہیں زرینہ؟

زرینہ۔ مجھے یونہی کامران کا خیال آ گیا ——— میں سوچ رہی ہوں۔

ببرک خاں۔ کیا؟

زرینہ۔ کہیں تغلوقوں کی اس لشکرکشی میں کامران کا ہاتھ تو نہیں؟

ببرک خاں۔ کامران کا ہاتھ ہو یا نہ ہو چڑھائی تو ہو گئی۔

زرینہ۔ مگر کامران کی کرائی ہوئی چڑھائی زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہاتکوں کی ہر چال سے واقف ہے۔

ببرک خاں۔ ہاں واقعی۔ یہ بیک وقت کئی جگہ حملہ کرنا نئی بات ہے اور ہم اس کے عادی نہیں۔

زیرک۔ (باہر سے پکارتے ہوئے) بابا۔

ببرک خاں۔ آ جاؤ زیرک۔

(زیرک آتا ہے اور ارجمند اور فیروز بھی)

ببرک خاں۔ ارجمند اور فیروز بھی آ گئے . . . . . ہاں ——— ارجمند! تم اپنے ماتحت سرداروں اور ان کے دستوں کے ساتھ شمالی

علاقے کی حفاظت کو نکل جاؤ..... اور زبرک تم پہلے یہ بتاؤ وہی چاہتا ہے تلوار اٹھانے کو؟

زبرک - کیوں نہیں بابا..... میں غلطی پر تھا -

ببرک خاں - ہاں بیٹے تم ہتھیار نہیں اٹھاؤ گے تو دشمن تمہاہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیں گے - تم اپنے ماتحت سرداروں اور ان کے دستوں کے ساتھ جنوبی علاقے کو بچاؤ ——— اور ٹھہرو سب طرف ہرکارے دوڑا دو کہ لوگ بستیوں سے نکل کر پہاڑ کی طرف ہٹ آئیں -

(ارجمند اور زبرک جاتے ہیں)

فیروز - میں کیا کروں بابا؟

ببرک خاں - تم؟..... معبد کے بائیں طرف ٹیلوں کا جھنڈ دیکھا ہے تم نے؟

فیروز - کئی بار دیکھا ہے بابا -

ببرک خاں - تم ابھی وہاں خیمہ لگوا دو اور حرم کو ادھر منتقل کر دو - اس بار عورتوں اور بچوں کو قلعے میں رکھنا غیر مناسب ہے..... یہ کام کر چکو تو میرے پاس آجاؤ میں سالار قلعہ کو مشرقی علاقے کی حفاظت کے لئے روانہ کر رہا ہوں -

(فیروز جاتا ہے)

زرینہ - فیروز کو میدان جنگ سے دور رکھنا ببرک -

ببرک خاں - دل کیوں چھوٹا کرتی ہو زرینہ؟ اٹھو کو ہرکو ارجمند اور زبرک کے بیوی بچوں کو ساتھ لو اور ضرورت کی چیزیں اٹھالو ——— خداوند ہی جانتا ہے پھر یہاں ایسے بیٹھنا نصیب ہوگا یا نہیں؟

دسواں منظر

ببرک خاں - خیمہ لگ گیا فیروز اور حرم وہاں پہنچ گیا؟

فیروز - سب کچھ ہو گیا بابا -

ببرک خاں - یہ تھیلا اور چھاگل کندھے پر ڈال لو اور میرے پیچھے رخش پر بیٹھ جاؤ -

(گھوڑے پر بیٹھنے کی آواز)

(رخش سرپٹ دوڑتا ہے)

فیروز - اس تھیلے میں کیا ہے بابا؟

ببرک خاں - خشک میوہ ہے فیروز -

فیروز - لیکن بابا ہم تو میدان جنگ سے دور جا رہے ہیں -

ببرک خاں - بس یہ پانی اور میوہ محفوظ رکھ کے لوٹ آئیں گے -

(گھوڑے سے اترنے کی آواز)

ببرک خاں۔ میں یہ پتھر ہٹاتا ہوں تم یہ تھیلا اور چھاگل غار میں رکھ آؤ۔

(پتھر کے سرکنے کی آواز)

(فیروز اندر جاتا ہے)

فیروز۔ یہاں رکھ دوں بابا؟

ببرک خاں۔ نہیں فیروز — ذرا آگے...... اور آگے۔

(پتھر کے سرکنے اور فیروز کے چیخنے کی آواز)

فیروز۔ بابا... بابا — یہ کیا کر دیا تم نے؟... مجھے یہاں کیوں بند کر دیا؟... نکالو مجھے...... میں مر جاؤں گا۔ نکالو بابا — نکالو۔

ببرک خاں۔ میں تمھیں خداوند روزگر کے سپرد کرتا ہوں فیروز۔ یا تو وادی اس غار میں سے زندگی پائے گی یا ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو جائے گی۔

فیروز۔ (چیختے ہوئے) بابا...... بابا... میں سر پھوڑ پھوڑ کر مر جاؤں گا بابا....

(گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز)

گیارھواں منظر

ببرک خاں۔ ارجمند! آخر اس مسلسل پسپائی کی کوئی وجہ بھی تو ہو!

ارجمند۔ ایک محاذ پر کئی طرف سے حملہ ہوتا ہے بابا اور چھوٹے چھوٹے دستے برابر امنڈتے چلے آتے ہیں — قدم ہی نہیں جمنے دیتے۔

ببرک خاں۔ سالار قلعہ بھی پیچھے ہٹ آیا ہے۔ تمھارے لشکر کو بھی یہی دقت پیش آئی ہے زیرک۔

زیرک۔ بالکل یہی مشکل میری ہے۔ کہیں پاؤں ٹکنے تو آدمی کوئی چال بھی چلے۔

ببرک خاں۔ اس کا مطلب ہے دشمن کی چال بڑی ہی پختہ اور کامیاب ہے.... مشعل کو نیچے رکھو زیرک۔ اسی نشانے پر تیر آسکتا ہے۔

زیرک۔ لیکن وہ سامنے معبد کا آتش کدہ اتنا روشن ہے۔ وہ دشمن کو دکھائی نہیں دیتا۔

ببرک خاں۔ واقعی۔ یہ تو بہت بڑا خطرہ ہے.... ابھی اٹھو.... اسے بند کر دیتے ہیں.... راہبہ خاص دعا کر رہی ہوگی مگر یہ ہمارے خیمے کا نشان دے سکتا ہے۔

(تینوں جاتے ہیں۔ پہاڑ پر چڑھنے کی آہٹ ہوتی ہے)

(وقفہ)

زیرک۔ فیروز کہاں ہے بابا؟

ببرک خاں - وہ اُوپر پہاڑ پر بسر کا ذخیرہ کر رہا ہے۔
ارجمند - (چیختے ہوئے) وہ اُدھر کیا ہے بابا!.... قلعہ جل رہا ہے.... غضب ہو گیا۔

(فاصلے پر شور)

ببرک خاں - اور یہ نیچے مشعلیں کیا ہیں؟.... حرم پر حملہ ہو گیا.... وہ آتشیں تیروں کی بارش ہونے لگی....
زبرک - خیمے کو آگ لگ گئی بابا۔

(تینوں بڑی تیزی سے نیچے دوڑتے ہیں)
(قریب سے یک لخت باجا اور طبل بجنے کی آواز آتی ہے
عورتوں اور بچوں کی چیخیں۔ سپاہیوں کے آوازے
"کسی کو نہ چھوڑو!".... "سر اُڑا دو!")

ببرک خاں - تلواریں کھینچ لو بیٹو اور حرم کی عزت پر قربان ہو جاؤ.... (تیزی سے دوڑنے کی آوازیں۔ ملا جلا شور جاری ہے)
(شور آہستہ آہستہ ختم ہوتا ہے)

بارھواں منظر

ببرک خاں - فیروز مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ میں نے بڑی مشکل سے غار کے منہ سے پتھر ہٹایا۔
فیروز - پھر تم بیہوش ہو کر گر پڑے تھے بابا۔
ببرک خاں - ایک.... دو.... تین.... تین دن ہو گئے مجھے یہاں پڑے!.... طوفان.... تھم گیا ہے فیروز؟
فیروز - ہاں بابا مگر بارش ابھی نہیں رکی۔
ببرک خاں - اور رخش کے زخم بھی ٹھیک ہو گئے۔
فیروز - نہیں بابا ابھی بالکل ٹھیک نہیں ہوئے۔
ببرک خاں - ارجمند نے کئی قبلوق کاٹے اور ان کا پیچھا کیا مگر آخر زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑا.... زبرک بھی بڑی بہادری سے لڑا اور تین کو گرا کے گرا...... اور ان کے بیوی بچوں کو تو ان وحشیوں نے سب سے پہلے قتل کر دیا تھا....
زرینہ اور گوہر کو ایک قبلوق نے ایک ہی خنجر سے مارا...... یہ تجھے گوہر نے بتایا.... اُس نے میرے بازوؤں میں جان دی فیروز.... تم نے سب لاشوں کو معبد میں جلا دیا۔

فیروز - ہاں بابا۔
ببرک خاں - اور سچ مچ قبلوقوں کا کوئی سپاہی دماب کے اس طرف نہیں رہا ہے۔
فیروز - میں نے تو ایک بھی نہیں دیکھا.... کوئی طوفان تھا بابا.... درخت کیا.... چٹانوں سے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر اُڑ رہے تھے.... اُس قہر میں کون ٹھہر سکتا تھا؟.... اور بارش کتنی بے پناہ تھی!

ببرک خاں - ایک اِدھر اُدھر پھرنے لگے ہیں فیروز ؟

فیروز - میں نے تمھیں بتایا تھا ناکہ کوئی تین سو کے قریب معبد میں جمع تھے - انھوں نے خداوند روزگر سے بار بار تمھاری صحت کے لئے دعا کی..... اور بابا انھوں نے لاشوں کو بڑے ادب سے اُوپر پہنچایا -

ببرک خاں - مجھے تیری فکر نہ ہوتی فیروز تو میں دیکھتا کس طرح قبلوق زیرک اور ارجمند کے سر کاٹ کر ساتھ لے جاتے ! .....
زرینہ تیرا خواب بالکل سچا نکلا..... سب سے چھوٹا انار لہولہان ہونے سے بچا ! ..... اور میرا خواب ! ....
میرا خواب ! فلک ناز کیسے آ گئی ..... خداوند روزگر نے کہا تھا ناکامی کے ساتھ کامیابی ہے ..... ناکامی کے ساتھ کامیابی ہے ..... فیروز اٹھو پہلے رخش کو غار کے منہ تک لے آؤ پھر سہارا دے کر مجھے اُٹھاؤ -

(فیروز جاتا ہے اور رخش کو لے کر آتا ہے)

ببرک خاں - زین اچھی طرح کَس دی فیروز ؟ ..... اور لگام بھی اس کی گردن پر لپیٹ دی ؟

فیروز - ہاں بابا -

ببرک خاں - اب اِدھر آؤ اور مجھے اُٹھاؤ -

(فیروز ببرک خاں کو اُٹھاتا ہے - وہ لڑکھڑاتا ہوا غار کے منہ تک آتا ہے اور رخش کو چمکارتا ہے)

ببرک خاں - (بھرائی ہوئی آواز میں) رخش ! میرا ایک بازو اور ایک ٹانگ تجھے جواب دے گئی مگر تو ابھی تک میری خدمت پر کمربستہ ہے ..... تیرے زخم ٹھیک نہیں ہوئے رخش لیکن تیرے ذمے ایک فرض ہے اور میں شاید اسی لئے زندہ ہوں کہ تجھے وہ پورا کرتے دیکھ لوں - دوپہر ہو رہی ہے اور وہ اب طغیانی پر ہوگا ..... احتیاط سے ..... اچھا ؟

ببرک خاں - (اس کی پیٹھ پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے) ..... لے اب چل ! (رخش کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آہستہ آہستہ فاصلے پر گم ہو جاتی ہے)

فیروز - بابا ! یہ کیا ہو گیا تمھیں ! ..... رخش کو گنوا دیا ! ..... میں سمجھتا تھا آپ چڑچڑے ہونے لگے ہیں ..... تمھارے حواس خراب ہیں بابا -

ببرک خاں - میں زخموں سے چُور ہوں فیروز ..... مجھے لٹا دو ..... مجھے لٹا دو -

تیرھواں منظر

خاور خاں - کامران ! دیکھتے ہو تھکے ؟

کامران - لطف اُٹھا رہا ہوں عالی جاہ !

خاور خاں - تم تو ان کے نام بتا سکتے ہو -

کامران - کیوں نہیں۔ یہ ارجمندہ کا سر ہے اور یہ زبرک کا ..... اور یہ ... نہیں یہ فیروزہ کا نہیں۔

خاور خاں - زبرک کا کونسا ہے۔

کامران - زبرک اور فیروزہ کے سر ان میں نہیں ہیں حضور۔

خاور خاں - تو اس کا مطلب ہے وہ دونوں بچ گئے۔

کامران - (تامل سے) کچھ کہا نہیں جا سکتا .. مگر بچ کے کہاں جا سکتے ہیں عالیجاہ! ادھر ادھر گر کے مر گئے ہوں گے۔ ..... سارا حرم کٹ گیا وہ باقی رہ گئے؟

خاور خاں - یاقوت! اٹھا لو یہ طشت - یہ خونیں دستر خوان - میری آنکھیں سیر ہو گئیں! اٹھاؤ اسے اور شہر پناہ کے باہر آسمان کے گدھوں اور زمین کے کتوں کے لئے ڈال دو!

(طشت اٹھانے کی آواز - یاقوت جاتا ہے)

چودھواں منظر

شہزاد - (اپنے آپ سے مخاطب ہے) شہزاد! اب تو تیرے دل کو چین آ گیا ..... تو نے جس کے منہ پر تھوکا تھا اس کا ملک برباد ہو گیا .... قبیلہ بکھر گیا ... اس کا حرم خون میں لت پت ہو گیا .... مگر الماس نے کامران کو یہ کہتے سنا ہے کہ زبرک خاں اور فیروزہ کے سر طشت میں نہیں تھے .... ہو سکتا ہے وہ زندہ ہوں .... فیروز زندہ ہو .... تو .... ہاں ..... زبرک خاں کہتا تھا رخش تمہیں جیسے میرے پاس لا سکتا ہے ... اپنے سوار کو کبھی نہیں گرنے دیتا ... جتنے یقین سے اپنے پاؤں پر چل رہی ہو اتنے ہی یقین سے اس کی پیٹھ پر بیٹھ سکتی ہو .... شہزاد! قبوق شہر میں چراغاں کر رہے ہیں اور زبرک کی آنکھوں سے دیئے بجھ رہے ہوں گے ..... وہ کتنا اچھا تھا .... وہ چاہتا تو تمہیں اٹھا کر اسی وقت گھوڑے پر ڈال لیتا ... مگر اس نے تمہاری مرضی کے خلاف نہ کیا۔ اور تم نے اس کے منہ پر تھوک دیا! .. نہیں نہیں میں نے نہیں تھوکا تھا .. ہوں اب اپنے آپ سے چھپ رہی ہو شہزاد! .. تم جانتی ہو تم ہی نے تھوکا تھا .... نافہ کو ساتھ لو اور چلو .... شاید رخش کہیں سے آ نکلے! .. اٹھو! ..... اٹھو!

(جذبات میں ہیجانی کیفیت)

پندرھواں منظر

الماس - (ہانپتے ہوئے پریشان لہجے میں) عالی جاہ! شہزاد محل میں کہیں نہیں!

خاور خاں - ملکہ ناز کے پاس بھی نہیں؟

الماس - نہیں عالیجاہ! وہ تو جب سے حضور نے منع کیا۔ خانم سے ایک بار بھی نہیں ملی .... میرا تو خیال ہے وہ نافہ کے ساتھ

ببرک خاں - بابک اِدھر اُدھر پھرنے لگے ہیں فیروز ؟

فیروز - میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ کوئی تین سو کے قریب معبد میں جمع تھے - انھوں نے خداوندِ روزگر سے بار بار تمھاری صحت کے لیئے دعا کی ..... اور بابا انھوں نے لاشوں کو بڑے ادب سے اُوپر پہنچایا -

ببرک خاں - مجھے تیری فکر نہ ہوتی فیروز تو میں دیکھتا کس طرح قبلو قزبرک اور ارجمند کے سر کاٹ کر ساتھ لے جاتے ! .....
زرینہ تیرا خواب بالکل سچا نکلا ..... سب سے چھوٹا انار لہو لہان ہونے سے بچا ..... اور میرا خواب ! ....
میرا خواب ! فلک ناز کیسے آئیگی ..... خداوندِ روزگر نے کہا تھا ناکامی کے ساتھ کامیابی ہے ... ناکامی کے ساتھ کامیابی ہے ..... فیروز اٹھو پہلے رخش کو غار کے منہ تک لے آؤ پھر سہارا دے کر مجھے اُٹھاؤ -

(فیروز جاتا ہے اور رخش کو لے کر آتا ہے)

ببرک خاں - زین اچھی طرح کس دی فیروز ؟ ... اور لگام بھی اس کی گردن پر لپیٹ دی ؟

فیروز - ہاں بابا -

ببرک خاں - اب ادھر آؤ اور مجھے اُٹھاؤ -

(فیروز ببرک خاں کو اُٹھاتا ہے - وہ لڑکھڑاتا ہوا غار
کے منہ تک آتا ہے اور رخش کو چمکارتا ہے)

ببرک خاں - (بھرائی ہوئی آواز میں) رخش ! میرا ایک بازو اور ایک ٹانگ مجھے جواب دے گئی مگر تو ابھی تک میری خدمت پہ کمربستہ ہے ..... تیرے زخم ٹھیک نہیں ہوئے رخش لیکن تیرے ذمے ایک فرض ہے اور میں شاید اسی لیئے زندہ ہوں کہ تجھے وہ پورا کرتے دیکھ لوں - دوپہر ہو رہی ہے اور دم اب طغیانی پر ہوگا .... احتیاط سے ...... اچھا ؟

ببرک خاں - (اس کی پیٹھ پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے) .... لے اب چل ! (رخش کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آہستہ آہستہ فاصلے پر گم ہو جاتی ہے)

فیروز - بابا ! یہ کیا ہو گیا تمھیں ! ..... رخش کو گنوا دیا ! ..... میں سمجھتا تھا آپ چڑھنے لگے ہیں ..... تمھارے حواس خراب ہیں بابا -

ببرک خاں - میں زخموں سے چُور ہوں فیروز .... مجھے لٹا دو .... مجھے لٹا دو -

تیرھواں منظر

خاور خاں - کامران ! دیکھتے ہو تحفے ؟

کامران - لطف اُٹھا رہا ہوں عالی جاہ !

خاور خاں - تم تو ان کے نام بتا سکتے ہو -

کامران - کیوں نہیں۔ یہ ارجمندہ مہر ہے اور یہ زبرک کا ..... اور یہ ... نہیں یہ فیروزہ کا نہیں۔

خاور خاں - برک کا کونسا ہے۔

کامران - برک اور فیروز کے سر ان میں نہیں ہیں حضور۔

خاور خاں - تو اس کا مطلب ہے وہ دونوں بچ گئے۔

کامران - (تامل سے) کچھ کہا نہیں جا سکتا ... مگر بچ کے کہاں جا سکتے ہیں عالیجاہ! ادھر ادھر گر کے مر گئے ہوں گے۔ ..... سارا حرم کٹ گیا وہ باقی رہ گئے؟

خاور خاں - یاقوت! اٹھا لو یہ طشت - یہ خونیں دسترخوان - میری آنکھیں سیر ہو گئیں! اٹھاؤ اسے اور شہر پناہ کے باہر آسمان کے گدھوں اور زمین کے کتوں کے لئے ڈال دو!

(طشت اٹھانے کی آواز - یاقوت جاتا ہے)

چودھواں منظر

شہزاد - (اپنے آپ سے مخاطب ہے) شہزاد! اب تو تیرے دل کو چین آ گیا ..... تو نے جس کے منہ پر تھوکا تھا اس کا ملک برباد ہو گیا .... قبیلہ بکھر گیا - ... اس کا حرم خون میں لت پت ہو گیا .... مگر الماس نے کامران کو یہ کہتے سنا ہے کہ برک خاں اور فیروز کے سر طشت میں نہیں تھے .... ہو سکتا ہے وہ زندہ ہوں ... فیروز زندہ ہو ... تو ... ہاں .... برک خاں کہتا تھا رخش مجھیں جیسے میرے پاس لا سکتا ہے ... اپنے سوار کو کبھی نہیں گرنے دیتا .... جتنے یقین سے اپنے پاؤں پر چل رہی ہو اتنے ہی یقین سے اس کی پیٹھ پر بیٹھ سکتی ہو ... شہزاد! قبوق شہر میں چراغاں کر رہے ہیں اور برک کی آنکھوں کے دیئے بجھ رہے ہوں گے ..... وہ کتنا اچھا تھا ..... وہ چاہتا تو تمہیں اٹھا کر اسی وقت گھوڑے پر ڈال لیتا .... مگر اس نے تمہاری مرضی کے خلاف نہ کیا - اور تم نے اس کے منہ پر تھوک دیا! ... نہیں نہیں میں نے نہیں تھوکا تھا ... ہوں اب اپنے آپ سے چھپ رہی ہو شہزاد! ... تم جانتی ہو تم ہی نے تھوکا تھا - ... نافہ کو ساتھ لو اور چلو .... شاید رخش کہیں سے آ نکلے! ... اٹھو! ..... اٹھو!

(جذبات میں ہیجانی کیفیت)

پندرھواں منظر

الماس - (ہانپتے ہوئے پریشان لہجے میں) عالی جاہ! شہزاد محل میں کہیں نہیں!

خاور خاں - فلک ناز کے پاس بھی نہیں؟

الماس - نہیں عالیجاہ! وہ تو جب سے حضور نے منع کیا - خانم سے ایک بار بھی نہیں ملی .... میرا تو خیال ہے وہ نافہ کے ساتھ

باہر گئی تھی ابھی واپس نہیں آئی -

خاور خاں - دماغ چل گیا ہے تمہارا - اس کی سیر تو اتنی دیر سے موقوف ہے -

الماس - نہیں عالی جاہ! کل میں نے اسے نافہ کے ساتھ باہر جاتے دیکھا تھا - اور مجھے یقین ہے وہ آج بھی گئی ہے -

خاور خاں - شہزادی! شہزادی!

(آواز گونجتی ہے اور خاور خاں کے ادھر اُدھر چلنے کی آواز آتی ہے)

خاور خاں - (گھبراہٹ اور غصے کے لہجے میں) شہزادی! شہزادی!

(آواز گونجتی ہے)

خاور خاں - (توقف کے ساتھ) یاقوت!

یاقوت - عالی جاہ!

خاور خاں - سالارِ محل کو حاضر کرو -

(کامران آتا ہے اور یاقوت جاتا ہے)

خاور خاں - تم آگئے کامران؟ میں تمہیں بلانے والا تھا -

کامران - کیا ارشاد ہے عالی جاہ؟

خاور خاں - شہزادی نافہ کو لے کے باہر گئی تھی اور ابھی واپس نہیں آئی -

کامران - تو کیا خیال ہے حضور کا؟

خاور خاں - میں تم سے پوچھ رہا ہوں - تمہارا کیا خیال ہے؟

کامران - میرا کیا خیال ہو سکتا ہے عالی جاہ! یہ حرم کی بات ہے -!

(یاقوت جاتا ہے)

یاقوت - سالارِ محل اجازت کا منتظر ہے عالی جاہ!

خاور خاں - آجاؤ ہورماز ..... شہزادی نافہ کے ساتھ گئی تھی واپس نہیں آئی تمہیں کچھ معلوم ہے کہاں ہے وہ!

ہورماز - جان بخشی ہو عالی جاہ! میں نے خوف کے مارے اطلاع نہ کی ..... سالارِ شہر پناہ نے خبر دی تھی کہ شہزادی نافہ سمیت ایک صبا رفتار سفید گھوڑے پر بیٹھ کے دماب کی طرف چلی گئی - سپاہیوں نے تعاقب کیا مگر اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے اور تیر چلانا خطرناک تھا شہزادی کو لگ سکتا تھا -

خاور خاں - شہزادی دماب کی طرف چلی گئی ..... شہزادی ہیرک کے پاس چلی گئی ..... شہزادی فیروز کی گود میں چلی گئی ..... اور یہ کشت و خون! ..... یہ قتل و غارت ..... یہ قہر و غضب ..... یہ کیوں ہوا؟ ..... میری آدھی سے زیادہ سپاہ جنگ اور طوفان اور طغیانی کی نذر ہو گئی - قبیلے کے گھر گھر میں ماتم ہے ..... اور شہزادی چلی گئی ..... یہ کیوں ہوا؟ ..... ہاں یہ کیوں ہوا -؟ میں تم سے پوچھتا ہوں کامران! ..... خدا دند روز گر نے کہا تھا کامیابی

کے ساتھ ناکامی ہے۔ مگر تم نے مجھے جنگ کی آگ میں دھکیل دیا ۔۔۔ تم چپ ہو ۔۔۔ تم بول نہیں سکتے ؟ ۔۔۔۔۔۔ جواب دو کامران ! ۔۔۔۔ ہورماز ! یہ خاموش ہے ۔۔۔۔۔ اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دو ۔۔۔۔ کامران کا سر قلم کر دو۔

ابھی ! ۔۔۔۔۔ اسی جگہ !

(تلوار کے وار اور جسم کے گرنے کی آواز آتی ہے)

نادر خاں۔ یاقوت ! الماس ! ان شمعوں کو گل کر دو۔ ان مشعلوں کو پھینک دو ۔۔۔ یہ میرا منہ چڑا رہی ہیں ہورماز ! ۔۔۔ ان میں قیلوزوں کا خون جل رہا ہے ۔۔۔۔۔ ان کی روشنی میں بابکوں کی زندگی جھلک رہی ہے !

سولھواں منظر

ببرک خاں۔ فیروز یہ غار میں روشنی سی کیسی ہے ؟

فیروز۔ باہر آسمان صاف ہو گیا ہے بابا اور سورج سامنے غروب ہونے والا ہے۔

ببرک خاں۔ اچھا ؟ ۔۔۔۔ شام ہو گئی ؟ تو پھر تم غار کے منہ پر کھڑے ہو جاؤ فیروز ! ۔۔۔۔ رخش آتا ہی ہوگا ۔۔۔ میرے کانوں میں اس کی ٹاپ گونج رہی ہے ۔۔۔۔۔

فیروز۔ تمہارا دماغ جواب دے گیا ہے بابا ۔۔۔۔ پہلے اسے خود ہی بھگا دیا اور اب بیکار رہک رہے ہو۔

ببرک خاں۔ میرے حواس خراب نہیں فیروز ۔ یہ دیکھو ۔۔۔ سننے نہیں ہو تم ؟ ۔۔۔۔ یہ آ رہا ہے میرا رخش ! ۔۔۔ نکلو اور دیکھو اس کی پیٹھ پر کون ہے !

(ببرک خاں خود جوش میں اٹھتا ہے اور گر پڑتا ہے)

فیروز۔ بابا کیوں اٹھے تھے تم ۔۔۔ اتنی بری طرح گرے ہو ۔۔۔ اٹھو۔

(فیروز ببرک خاں کو اٹھاتا ہے)

(گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی ہے)

فیروز۔ ہاں بابا ۔۔۔۔ سچ مچ رخش آ رہا ہے۔

(فیروز ببرک خاں کو گھسیٹتا ہوا باہر دوڑتا ہے)

فیروز۔ بابا ! ۔۔۔۔۔ یہ رخش پر کون ہے ؟

ببرک خاں۔ یہ ؟ یہ میری نظروں میں فلک ناز ہے فیروز ۔۔۔۔۔

(گھوڑے کے رکنے اور ہانپنے کی آواز)

ببرک خاں۔ مجھے چھوڑ دو فیروز ۔۔۔۔ مجھ میں بے پناہ طاقت آگئی ۔۔۔۔ تم نافہ کو لے لو فیروز ۔۔۔۔۔ اور آؤ نافہ کی ملکہ ! اترو ۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ یہ غار تمہارا محل ہے ۔۔۔۔ اوہو ! ہوش کھو رہی ہے ملکہ ! تھک گئی ہے ۔۔۔ دل نہ چھوڑ دو بیٹی ! ہاں ٹیک لگا لو ۔۔۔ ادھر ۔۔۔ یہاں اس پتھر پر۔ آخر میں تمہیں یاد آ گیا بیٹی ۔۔۔ آخر میرا خواب سچا

نکلا ۔۔۔ زرینہ تم پاس نہیں ۔ لیکن نہیں تم ضرور دیکھ رہی ہو! ۔۔۔۔

شہزاد ۔ مجھے معاف کر دو بابا! ۔۔۔ مجھے معاف کر دو!

ببرک خاں ۔ یہ بات نہ کہو بیٹی ۔۔۔ میں احمق تھا ۔۔۔ مجھے تیری قیمت کی خبر نہ تھی ۔۔۔ مگر میں نے ادا ہی کیا کیا ہے۔
۔۔۔ یہ لہو کے دھارے تو ہر جیلے لہراتے ہیں ۔۔۔ یہ تو فیروز کا ہاتھ ہے اور یہ کس کا ہاتھ ہے بیٹی ؟

شہزاد ۔ شہزاد کا ۔

ببرک خاں ۔ شہزاد! کتنا پیارا نام ہے۔ بس میرے دل میں یہی آرزو تھی شہزاد کہ یہ دونوں ہاتھ مل جائیں ۔

(ببرک خاں ہاتھوں کو ملا کر بوسہ دیتا ہے پھر اپنی پگڑی
سے کلغی اتارتا ہے)

ببرک خاں ۔ اور یہ لو فیروز یہ کلغی تمھاری پگڑی پر لگاتا ہوں ۔ آج سے تم قبیلے کے سردار ہو ۔

فیروز ۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) بابا ۔۔۔ بابا!

ببرک خاں ۔ شہزاد! فیروز! شام ہو رہی ہے میرے بچو ۔۔۔ چولھے میں آگ جلاؤ ۔۔۔ اس اندھیرے غار میں چراغاں کر دو ۔
۔۔۔ وادی کو زندگی سے معمور کر دو ۔

(رخش کے دھڑام سے گرنے کی آواز)

ببرک خاں ۔ (تڑپ کر اٹھتے ہوئے) رخش گر گیا فیروز ۔۔۔ میرا رخش گر گیا ۔۔۔ آج تک نہ گرا تھا ۔

(فیروز اور ببرک اور شہزاد باہر آتے ہیں)

ببرک خاں ۔ (رخش کی گردن سے لپٹتے ہوئے) رخش! میرے جسم! میری جان! میرے رخش! ایک سفر تو نے اکیلے کیا دوسرا
سفر اکیلے نہیں کر سکتا ۔ میں تیرے ساتھ ہوں گا ۔۔۔ یہ دیکھ میں نے تیری لگام تھام لی ہے! ۔۔۔

(رخش کے ہانپنے اور دم توڑنے کی آواز ۔ اس کے ساتھ
ہی ببرک خاں جان دے دیتا ہے)

شہزاد ۔ بابا! ۔۔

فیروز ۔ بابا! ۔۔۔ بابا!

(سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز)

دِلّی کی روشنی

ایک کہانی

جلیل ہاشمی

وہ سرد اور سیاہ، زمستاں کی شام تھی
تارے کہیں کہیں نظر آتے تھے دُور دُور
بکھری ہوئی ہو جس طرح ٹوٹی ہوئی لڑی
لپٹی ہوئی تھیں چاند کے پیکر سے بدلیاں
بیمار کے باغ پر تھیں گھٹائیں تُلی کھڑی
چنگاریاں سی اُڑی تھیں مہندی کی باڑ میں
کرتے تھے سرسراتے ہوئے جگنو روشنی
بے چاپ اوس اترتی تھی دامانِ سبزہ پر
بھیگی ہوئی تھی رات کی دیوی کی اوڑھنی
زینہ بہ زینہ مرحلوں میں بجتا تھا جلترنگ
کچھ گنگناتی، بہتی ہوئی سست سست گومتی
پردے پڑے ہوئے تھے، دریچوں پہ کامدار
تھی تخت پر بچھی ہوئی چاندی سی سوزنی
قالین پر کٹار دھری تھی گراں بہا
چندن کی خوشبوؤں سے فضا تھی رچی بسی
اک گوشے میں چمکتے ہوئے پیلے گھنگھرو
اور شمعداں میں شمع فروزاں کے پاس ہی
منڈلا رہے تھے شب زدہ پروانے دیر سے
رہتا نہ خود پہ قابو تو گرتے تھے ٹوٹ کے

دیوان پر وہ دشمنِ ایمان و آگہی
خنجر سے کی آب تیغ نگہ کو دیئے ہوئے
کشمیری شال کندھوں پہ ڈالے دراز تھی
سینے میں مدّ و جزر کا عالم لیے ہوئے
سر کو اٹھائیں جس طرح موجیں رُکی ہوئی
ننھے پنکھڑی سے بھیگے ہوئے لب سیئے ہوئے
وہ قہر بھی بلا تھی قیامت تھی آگ تھی
لَو شمع سے لگائے ہوئے گم تھی دھیان میں
کھوئی ہوئی خیالوں میں افکار میں گھری
"میں بھی ہوں شمع مجھ پر بھی پڑتے ہیں شاد
بخت آزمائے معرکۂ شب، یہ بے قرار
کھاتے ہیں کتنی بے جگری سے مری کٹار
ملے گھٹتے ہیں یہ پیاسے کئی دشت بے اماں
امید کے سراب، تمنا کے ہفت خواں
پاتے ہیں میرے چشمۂ لب سے بس ایک جام
وہ بھی شکستہ ٹھوکریں کھایا ہوا ہزار
یہ لوگ میرے ایک تبسم کے پھول پہ
اپنے چمن لٹانے کو تیار ہر گھڑی
اچھا ہوا کہ ان کو خبر تک نہیں ہوئی
دِلّی سے دُور اور دِلوں سے بہت پرے
ہیں گومتی کنارے یہاں لکھنؤ میں ہوں
کوئی نہیں جو اب مجھے مجبور کر سکے
" وہ ٹھمریوں پہ مرکیاں وہ انگ ترت کے "
" زہرہ! بس اک پہاڑی مری جان کی قسم "
" لپکا نہیں وہ شعلۂ آواز دیر سے "
بیباک گھورتی ہوئی نظروں کا مجھ کو غم؟
تنہائیوں کی بزم سجائے ہوئے ہوں آج)

اس پیکرِ شباب مجسّم شراب نے
انگڑائی لے کے بدلی جو کروٹ تو سامنے
استادہ تھی زرینہ نہایت ادب کے ساتھ
پوچھا جو اس سے "کیا ہے زرینہ بتائیے"
بولی کنیز دھیرے سے پلّو سنبھالتی
"اک نوجوان ملنے کو کہتا ہے آپ سے
ارشاد ہو یہ لونڈی اسے کیا جواب دے"
جھلا کے ناگواری سے وہ مست ساحرہ
کہنے لگی "یہاں بھی نہیں چھوڑتے موئے
للّٰہ ٹال آ اسے، مجرا نہ ہوگا اب
گھنگھرو نہ پہنوں گی، نہیں معلوم ہے تجھے
انگ انگ چور ہے مرا، پوروں میں درد ہے
جا مجھ کو اپنے حال پہ خلوت میں چھوڑ دے"
ڈر کر کہا زرینہ نے "کہتا تھا نوجواں
کچھ کام ہے بہت ہی ضروری یہاں مجھے"
آئینہ سی جبیں پہ پڑے چند تیکھے بل
پڑ جائیں جیسے جھیل کے پانی پہ لہریے
"کیا کام اس کو مجھ سے ہے یہ جانتی ہوں خوب
یہ نوجوان یہ بانکے یہ چھیلے یہ منچلے
لینے نہ دیں گے زہرہ کو دو سانس چین سے
اب میں نہیں ملوں گی کسی سے کوئی بھی ہو
جاؤ اسے جواب دو، رخصت کرو اسے
اللہ میرے دلّی سے اٹھ آنے کی خبر
جنگل کی آگ بن گئی، کیا جانے کیا بنے"
کچھ ثانیوں کے بعد جو پلٹی کنیز پھر
"اب بھی نہیں گیا وہ جواں کچھ تو بولیے؟"
کہنے لگی زرینہ "نہ ہوں فکر مند آپ

یاں لکھنؤ میں آپ کی آمد کے حال سے
واقف نہیں کوئی بھی، ہٹائیں یہ وسوسے
اور یہ جوان، اور یہ کھڑا ہے جو بے قرار
دِلّی سے آ رہا ہے نہ لوٹے گا بن ملے"
دل کو پکڑ کے بیٹھ گئی وہ پری جمال
چھتیاں پھڑک گئیں دِلّی کے نام سے
ہونٹوں کو کاٹنے لگی دانتوں میں بار بار
آنکھیں چمک چمک اٹھیں، ابرو لپک گئے
پہچان بھی سکی ہو اسے کون ہے بھلا؟
"دیکھا نہیں کبھی اُسے پہلے کنیز نے
کہیئے اس اجنبی کو بلا لاؤں یا نہیں"؟
سینے میں دل دھڑکنے لگا زور زور سے
جنبش ہوئی لرزتے لبوں کو ہلی زباں
"صورت یہ ہے تو لاؤ بلا کر یہاں اُسے
ہاں ٹھہریو — یہ شمعیں ہٹا کر نئی دھرو"
پھر کھو گئی خیالوں میں (دِلّی سے اس گھڑی
آیا ہے کون میری ملاقات کے لئے)
آہٹ ہوئی تو چونک کے دیوان سے اُٹھی
ہونٹوں پہ دلنواز تبسم لئے ہوئے
دو گام چھم سے چل کے بصد شان دلبری
پھیلائے ہاتھ "آئیے تشریف لائیے"
نووارد اک چھریرے بدن کا جوان تھا
بے اختیار ہنس پڑا زہرہ کو دیکھ کے
"میرا بھی خیال تھا اس وقت آپ کو
فرصت ضرور ہوگی غم روزگار سے"
اس بے تکلفی پہ وہ یک لخت چونک اُٹھی
گہری نظر سے جائزہ مہماں کا لیا

آنے لگی قریب قدم تھے دبے دبے
وہ لمحہ دوسرا تھا کہ زہرہ کے ہاتھ میں
ٹوپی تھی اس جوان کی اور بال تھے کھلے
" عالم.... م.... گھبرا! تو ہے! ترے بہروپ ہیں عجیب
اوسان میرے آج خطا ہی تو کر دیئے "
" خاموش! زہرہ نام مرا یہ نہیں یہاں
دوبارہ ایسی بات نہیں ہونی چاہیئے
آہستہ بول رکھتے ہیں دیوار و در بھی کان
نکلے نہ میرے آنے کی بات اس مکان سے
جانم! میں فتح خان ہوں، افغان جوہری
دیکھو زرینہ کو بھی نہ اس کا پتہ چلے "
ششدر تھی زہرہ سنگ کا پیکر بنی ہوئی
" سمجھی نہیں ہیں لائے ہو کیا داستاں نئی "
" ڈرنا ذرا نہیں مری دِلّی کی روشنی
شہ کا ندیم خاص نہیں تھا حیات خاں ؟
" ہاں "
" — رستی اس کی کٹ گئی تلوار سے مری "
زہرہ کی تیز چلتی ہوئی سانس رک گئی
گلرنگ عارضوں پہ اتر آئی دھوپ سی
اک دھندی بکھر گئی نظروں کے آس پاس
" اللہ میرے کانوں میں کیسی خبر پڑی
کیا کہہ رہے ہو تم نے یہ کیا کر دیا کہو
تم نے اودھ کی گدی سے لی مول دشمنی
ٹکرا کے ٹوٹ جاتا ہے شیشہ چٹان سے "
" زہرہ سنو تو! بھول نہیں اس میں کچھ مری
اس نابکار نے مری ہمشیر کو چھپا
اختر پیا کے ساتھ نبھانے کو دوستی

اس وقت بیگماتِ اودھ میں مری بہن
سب سے نئی دلہن ہے فضیلت مآب کی
کچھ مصلحت تھی ورنہ بدلتا نہ میں یہ روپ
ـــ ہے چوک میں دکان مری میں ہوں جوہری
ڈر موت کا نہیں مجھے جب آن ہی گئی ـــ
دِلّی کی گلیاں چھان لی ہوں گی پیادوں نے
ٹوہ لیتے ہوں گے میری وہاں گھڑسوار بھی
اب اتنا چاہتا ہوں کہ تم روشنی میں آؤ
تنہائیوں میں دن نہ گزارو بڑی بڑی
دربار تک تمہاری رسائی نہیں کٹھن
کایا اودھ کی مجھ کو پلٹنا ہے جانِ من
کیا جانے میری سلمہ سی کتنی ہی لڑکیاں
محبوس ہیں حرم میں، خدارا انھیں چھڑاؤ"
دیوان سے وہ اٹھ گیا اک بار جوش میں
زہرہ کی کالی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے
" باتیں بہت سی ہو گئیں اب میٹھو تھک گئے
افسوس میں تمھاری مدد کر نہ پاؤں گی"
" میں معذرت طلب ہوں نہایت خلوص سے
بہتر یہ تھا کہ چاہتی ہو دل سے تم مجھے"
ناگن کی طرح زہرہ کئی پیچ کھا گئی
" میں کیا ہوں خوب جانتی ہوں بس نہ بولئے
رقاصہ کو نہ دیجیے محبت کے واسطے
گزری ہو جس کی عمر اشاروں پہ ناچتے
میں ایک جسم بیچنے والی ہوں دیکھئے
میرے لئے کسی کو محبت نہ چاہیئے
میں اور پیار؟! دھوکے میں تم آج تک رہے"
یہ کہہ کے زہرہ رونے لگی پھوٹ پھوٹ کے

"جانم بہو نہ رَو میں رکھو مجھ پہ اعتماد
مجھ کو ذرا سمجھنے کی کوشش تو کیجیے
میں نے بتا دیا ہے تمھیں اپنا بھید تک
کیا تم ثبوت کہتی نہیں پیار کا اسے
کیوں دے رہی ہو دل میں جگہ ایسی بات کو
واللہ میں نے غیر کبھی سمجھا نہیں تجھے"
کچھ دیر تک وہ دشمنِ ایمان و آگہی
جذبات کے اُٹھے ہوئے طوفان میں بہی
پیوست لب تھے لب سے مسلط تھا اک سرور
ساحل نظر نہ آتا تھا موجوں میں دور دور
اک دم تڑپ کے نکلی وہ اس کی گرفت سے
آنکھوں پہ لاج کی پلکوں کی چلمن لیے ہوئے
انگڑائیوں سے ٹوٹ رہا تھا بدن تمام
روشن تھے پیچ و خم تو فروزاں خطوط تھے
"رہ جاؤ آج رات مری جان کی قسم"
"زہرہ تم ایسے حال میں ٹھکرا دو مت مجھے"
"جس طرح بن پڑا میں نبھاؤں گی اپنا عہد
دوں گی تمھارا ساتھ کہ یہ کیسی ہی کڑے سے"
دن ہوتے ہی اُڑی یہ ہوائی کہ لکھنؤ
دِلّی کی روشنی سے فروزاں ہُوا تمام
ملتے تھے جس مقام پہ دو چار منچلے
چرچے اُسی کے ہوتے تھے آتا اُسی کا نام
چھڑتے اُسی کے تذکرے، چلتی اُسی کی بات
کوچوں دریچوں ڈیوڑھیوں باغوں محلوں میں
دیوان خانوں میکدوں عشرت کدوں میں عام
دربارِ خاص میں بھی ہوا اس کا اہتمام
فانوس جھاڑ مخملیں قالین شمعدان

مشک عنبر عود موتیے گنیٹے شراب جام
ایوانِ خاص ایک دلہن کی طرح سجا
سائے ہوئے طویل اور آئی سلونی شام
اندر سبھا میں اُتری پری چھم سے چھن چھنن
جیسے کرے چمن میں گجر دم صبا خرام
وہ نافۂ غزال تھی خوشبو کی لہر تھی
چلتی تھی وہ کہ پھینکتی تھی شست موج دام
غارت گری کو اپنے جلو میں لئے ہوئے
طوفانِ رنگ و نور بپا کرتی گام گام
مسند کے پاس آ کے رُکی جب وہ ساحرہ
جلوہ گری پہ رہ گئے درباری دل کو تھام
کافر ادا نے جھک کے جو تسلیم عرض کی
سرکار کے حواس پہ بجلی سی گر پڑی
بولے سنبھل کے "کرتے ہیں ہم بھی تمھیں سلام
دیکھا تمھیں تو ہم کو مسرت بڑی ہوئی
اور یہ کہ ہم ہیں پہلے ہی سے آشنائے نام
اس وقت ہاتھ میں نہ تھی گو صبر کی زمام
تاہم کہا کہ "ٹھمری مناسب ہے، اس گھڑی"

لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم
سیاں مورے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے
بجلی چمکے بادل گرجے چھائی گھٹا گھنگھور مورے بالم
سیاں مورے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے
ماتھے کی بندیا بسر گئی ہے اپنے ہاتھ لگا جا رے بالم
سیاں مورے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے

ٹھمری سنا چکی تو وہ جانِ غزل جھکی

حضرت نہال ہو کے پکارے "ستم ستم!
واللہ راگ رنگ کی تم سے بہار ہے
قائل تمھاری ٹھمری کے ہی ہو گئے ہیں ہم"
اس داد پر وہ فتنہ وہ طناز پھر جھکی
" زہرہ نواز! لونڈی پہ ہے آپ کا کرم"
" کرتے ہیں ہم عطا تجھے ہیروں کا ستلڑہ!"
" ہیں فن کو بیچنے نہیں حاضر ہوئی حضور!"
" توہین کر رہی ہے ہماری یہ نوبہار
ہم دیں گے زہرہ! مانگتی جاؤ جنم جنم
تم آزما کے دیکھو سمجھتی ہو دل میں کیا
ہم فن شناس رکھتے ہیں فنکار کا بھرم"
زہرہ نے ہار لیا کچھ دیر سوچ کر
" ہو جان کی امان تو کچھ عرض حال ہے"
" وعدہ ہے جان بخشی کا، ہاں مدعا کہو"
" دیدار بیگمات اودھ کا سوال ہے"
یہ سن کے اہل بزم پہ اک برق سی گری
حضرت کی گویا قوت گویائی مر گئی
(رقاصہ! یہ خیال و جنوں ہے محال ہے)
پردے کے پیچھے سلمہ نے زہرہ کی بات پر
انگلی کو کاٹ ڈالا (یہ جرأت؟! کمال ہے)
سہمے ہوئے تھے سب کہ وہ گستاخ گلبدن
اس جرم کی سزا میں نہ چڑھ جائے دار پر
یہ تو کوئی طلب نہ تھی اک گہری چوٹ تھی
کردار تاجدار پہ، شاہی وقار پہ
مہر سکوت ٹوٹ گئی، جان عالم اب
گمبھیر ہو چکے تھے بہت اس کے وار پر
" زہرہ! مطابق عہد کے تم کو سزا نہیں
پورا کریں گے ہم تری خواہش کو بالیقیں"

یہ سن کے حاضرین بھی سب دنگ رہ گئے
زہرہ کے یہ گمان میں گزرا نہ تھا کبھی
" بیگم اودھ کی بننا پڑے گا مگر تمہیں !"
سینے پہ ہاتھ باندھ کے وہ سرو قد جھکی
" اس ذرۂ حقیر کو کیجیے گا سرفراز
پوری مگر ہو پہلے تمنا کنیز کی "
" منظور ہے ہمیں یہ ————"
———— زہے بندہ پروری !"

○

سلمہ سے اولادہ علی بیگمات ہیں
" ہمت ہی اس سوال کی کیسے بھلا پڑی ؟"
وہ فتنہ ساز ہنسنے لگی " حیرت اس پہ کیوں
ڈر کیسا پھر جو سر کو ہتھیلی پہ رکھ چکی
" بیگم ! یہ پردہ کھینچوں اجازت اگر ملے "
" کیوں خیر تو ہے " چھوٹ گیا دل غریب کا
" سمجھی نہیں ہوں آپ کا مطلب میں باجی جی "
" کیا تم نہیں ہو چھوٹی بہن " ع " کی کہو "
" تم کون ————؟"
"———— کوئی بھی ہوں مگر دوست ہوں تری
بھائی ترا یہیں ہے بتا دوں اتا پتا ؟
وہ چوک میں جو بیٹھا ہے افغان جوہری
میں اس جگہ اسی کے اشارے پہ آئی ہوں "
اور آگے بڑھ کے کان میں کچھ اس کے کہہ دیا
پیچھے ہٹی تو زہرہ نے دیکھا کہ اس گھڑی
اک کپکپی سی سلمہ کے سارے بدن میں تھی
" بھیا سے کہیے جان نہ جوکھوں میں ڈالیے
پھر لوٹ کر نہ آئے گی عزت لٹی ہوئی

ڈر مجھ کو جان کا نہیں، ہے وسوسہ یہی
حضرت محل سے چھپتی نہیں بات کوئی بھی"
رخصت ہوئی یہ کہتی ہوئی زہرہ سلمہ سے
"آگے بڑھے قدم کو نہ پیچھے ہٹاؤں گی"
اک لونڈی انتظار میں تھی اس کے سامنے
"سرتاج بیگمات نے . . . . . . "
"——— اچھا چلو چلی"
حضرت محل کے سامنے جا کر لرز اٹھی،
تیوری چڑھی تھی، تیز تھے ناوک نگاہ کے
پیوستہ ابروؤں کی کمانیں کھنچی کھنچی
سنجیدگی کا رنگ چڑھا تھا جلال پر
گوشے لبوں کے چپکے، کئی بات ضبط کی۔
"ہاں لکھنو میں آنا ہوا کیسے آپ کا
خواہش نہیں یہ محل کی توہین ہے کھلی
تم اپنا عزم اب بھی بدل سکتی ہو، ڈرو!
ہم بیگمیں بھی ہیں کوئی چیزیں نمائشی
سلمہ سے اتنا وقت ملاقات میں؟ اغرض؟
اب تم یہاں سے آگے کو جا سکتی ہو———
——— گلاب!
ملنا ہے بانوانِ حرم سے انہیں ابھی"

○

ہر گوشہ باغ شاہی کا زہرہ نے دیکھ کر
جب جائزہ حرم کا لیا تو ٹھٹک گئی
فریاد کرتے جسم، سسکتی جوانیاں
نظریں، نہ آنے والی براتوں کی منتظر
خلوت کدوں میں چپکے سے روتی اداسیاں
نوحہ گر آنگنوں کی فضا مرگ نغمہ پر

سرگوشیوں سے گونجی ہوئی بھری ڈیوڑھیاں
سیجیں، ورقِ صحیفۂ ہجراں کے، بے شکن
بھٹکی ہوئی سی بھول بھلیوں میں ہرنیاں
سایوں میں سہمے سہمے ہوئے ٹکڑے چاند کے
بے رحم، منہ چڑاتی ہوئی تنگ جالیاں
صد الف لیلیٰ گونجتی بطنِ سکوت میں
زینوں میں ہانپتے ہوئے بھیدوں کی گٹھڑیاں
غاروں سے اندھے طاقچوں میں شمعیں خود گداز
انبر سے گنبدوں میں جہاں سوز سسکیاں
اِک اِک پلک پہ منتیں پندار کی ہزار
آنکھوں میں رت جگوں کی سلگتی کہانیاں
ہونٹوں کی پپڑیوں میں زمانوں کی تشنگی
حجروں کی چھن چھن میں بلاؤں کی داستاں
برگِ خزاں سے چہرے، جبینیں بجھی بجھی
دامن میں قربتوں کے، پُر آشوب دُوریاں
مجبوریوں کی آگ میں جھلسے ہوئے بدن
ہجراں آئینوں میں گلابوں کی زردیاں
سینے، مزارِ آرزوئے خود سپردگی
کچھ وہ بھی بیگمات سیہ روزگار تھیں
شام عروسی بھی جو طلاء دوز سہرے میں
محرومِ سرفرازیٔ عالم پناہ رہیں
آہٹ پہ چونک چونک اٹھیں آنکھیں موندکر
ہونٹوں پہ پھیرتی رہیں کانٹوں بھری زباں

○

"خواہش تمھاری پوری ہوئی اب ہماری شرط!"
"سرکار! عہد یاد ہے اپنا کنیز کو
لیکن رہے گی رات دیوالی کی کیا بھلی

وعدہ وفا کرے گی یہ لونڈی جہاں پناہ"
یہ کہہ کے دیوی شرم و حیا کی وہ بن گئی
"بسیار خوب! اس کا ہمیں انتظار ہے"

○

اس شام کو "بہار" سے وہ فتنہ گر ملی
"کیا عورتیں اسی لیے ہوتی ہیں جانِ من
بے رنگ رس کلوں کی طرح خاک میں ملیں
تم بھی ہو مرد، ایسا ہی باڑہ بناؤ گے؟
کلیوں پہ تم بھی رکھو گے یونہی گراں سلیں
تم بھی ہوس کے طاق میں شمعیں جلاؤ گے؟
صورت اگر یہ ہے تو مجھے موت ہی بھلی"
"کیا کہنا چاہتی ہو ہٹاؤ پہیلیاں"
"اللہ بیریوں پہ بھی لائے نہ یہ گھڑی
کہتے ہیں قیدیوں کو یہاں بیگمات لوگ
اس باغ میں سسکتی ہے کھلنے کو ہر کلی
دیکھ آئی ہوں حرم میں جھلستے ہوئے گلاب
لی میں نے گام گام پہ محلوں میں جھرجھری
پائے ہیں میں نے جستجوئے مشک میں غزال
یہ آج کس خطا کی سزا تم نے مجھ کو دی
لوگو! اودھ میں قہرِ خدا ہے دُہائی ہے
دِلّی کی طرح لٹ گئی عورت دھڑی دھڑی
نوّاب تم بھی بن کے یہی گل کھلاؤ گے
کیا مجھ کو بھی یہ طوق و سلاسل پہناؤ گے
بیگم تمہاری میں نہ بنوں گی کبھی سنو!
دیکھیں نہ میرے بیری بھی ایسی بُری گھڑی"
اُبھریں فضا میں سسکیاں آنسو چھلک پڑے
تصویرِ درد بن گئی وہ جانِ سرخوشی

دے کر تسلیاں اُسے سلمہ کے بھائی نے
پوچھا کہ "میری سلمہ کی حالت تو ٹھیک تھی"؟
"حضرت محل کو مجھ پہ ذرا شک گزر گیا"
"بیحد ذہین ہے وہ، بہی ڈر ہے مجھ کو بھی"
"ڈال آئی ہوں یہ بات بھی سلمہ کے کان میں
خلوت میں لے یہ وعدہ وہ عالم پناہ سے
دیوالی اب کے سال چھتر میں منائی جائے
تاکہ شرنگ کا بھی وہ اس شب خیال رکھے"

○

حضرت محل کو جشن چھتر کے خیال نے
یوں آ لیا کہ نیند بھی راتوں کی اڑ گئی
بابا سے مشورہ کیا "حضرت! عجیب ہے
قیصر کا جشن اب کے چھتر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"ـــــــــــــــ سُنا و جی
یہ بات ہم پہ چھوڑ دو تم مطمئن رہو
پتے پہ بھی نظر ہے ـــــ" یہ بولے علی نقی

○

دیوالی کی یہ شام تھی جگمگ تھی ہر طرف
حیرت سے آئینہ ہوا جاتا تھا آئینہ
آرائش جمال میں تھی محو نسترن گر
سانچے میں ڈھل رہی تھیں ہزاروں قیامتیں
سولہ سنگار کر کے جو کی خود پہ اک نظر
خیام کی دھڑکتی رباعی تھی سامنے
روشن تھی قوس قوس فروزاں تھے پیچ و خم
ناگن کی طرح رہ گئی اک بار جھوم کر
شعلے مہک رہے تھے حریری لباس میں
اس محویت کے سحر کو توڑا نذیرہ نے

"محلوں سے گاڑی آئی ہے ———"
——— آئی ابھی کہو!"
(آتا ہے کیا نظر ہمیں اس رات دیکھئے)
رکھا دھڑکتے دل سے قدم پائدان پہ
کانٹے بنے ہوئے تھے روئیں سارے جسم کے

○

عالم پناہ چھپر میں مسند فروز تھے
تھیں چند بیگمات پس پردہ خاص خاص
اور اک نشست خاص وہاں زہرہ کیلئے
سر کو ذرا سا خم کیا تسلیم عرض کی
اس مشک میں نہائی ہوئی مہ جمال نے
اور جھم سے مڑ کے جائزہ دربار کا لیا
درباری تک رہے تھے ادھر ہی کنکھیوں سے
سرکار بے قرار نظر آ رہے تھے کچھ
دل پہ ہزار جبر کیا، لب مگر کھلے
" زہرہ!"
"حضور"
"آج سے تم محل بن گئیں"
کچھ ثانیے سکوت گراں میں گزر گئے
آنچل درست کر کے وہ بولی "جہاں پناہ!
لونڈی نے ایک عمر گذاری ہے ناچتے
خواہش ہے آج آخری رقص و سرود ہو
میں منتظر ہوں حکم کی، ارشاد کیجیے"
مسند نشیں کی تیوری پہ ناراضگی کے بل
ابھرے ہی تھے کہ پردے کے پیچھے سے لہجۂ
سلمہ کی جلترنگ سی آواز کے اٹھے
"زہرہ کو ناچنے کے لئے حکم دیجئے"

عالم ہنر کے ایک اشارے کی دیر تھی
طنّاز و فتنہ ساز کا رقص ابتدا ہوا
جاگ اُٹھا سحر سامری، محشر بپا ہوا
طبلے پہ تھاپ پڑتے ہی چھاگل چھنک اُٹھی
گھنگھرو بجے کہ شیش محل چھن چھنا گیا
مبہوت مُرکی مُرکی پہ محفل ہوئی تمام
مسحور تال تال پہ سب حاضرین ہوئے
ٹھمکی تو جاگ جاگ اُٹھے فتنے خواب سے
جھومی تو قوس قوس بدن کی جھلک اُٹھی
لہرا گئی تو ٹوٹ گئے رشتے ضبط کے
گھومی تو جھلملانے لگے سارے پیچ و خم
چھم سے چلی تو ہوش کے سب کام رُک گئے
فن اور شباب شیر و شکر تھے کہ اس گھڑی
حضرت محل کے سامنے سلمہ کہیں نہ تھی
چھوٹا پسینہ، رنگ اُڑا، دل دھڑک گیا
چوکی پہ اس کی بیٹھی تھی اک مہری کاسنی
تالی بجی تو خوف سے پیلی کنیز کے

پیروں میں بیڑیاں تھیں کلائی میں ہتھکڑی
کچھ سوچ ہی رہی تھی وہ سرتاج بیگمات
اک غلغلہ بلند ہوا، پھیلی سنسنی
اور تکتے تکتے محفل رقص و سرود میں
نیزے اُٹھے سنانیں تنیں تیغ چل گئی
چیخیں بلند ہونے لگیں تا بہ آسماں
ہلڑ تھا اک حرم میں، نہ آپے میں تھا کوئی
تمیز اونچ نیچ کی باقی رہی نہ کچھ
پاؤں میں تھی کنیز کے بانو کی اوڑھنی

× × × × × × ×

لہراتے ہی نشانِ بغاوت نگوں ہوا
میدان میں اُترتے ہی تلوار کے دھنی
مارے گئے سُرنگ میں، ایوان میں کٹے،
کام آ گئی نگاہِ جناب علی نقی
جکڑے گئے جو زندہ بچے باغیانِ شاہ
زہرہ کھڑی تھی فرش پہ پتھر بنی ہوئی
جب باغیوں کا قافلہ ایوان سے چلا
زہرہ کے گھنگروؤں پہ تھی زنجیرِ آہنی
اور ساتھ اک چھریرے بدن کا اسیر بھی

○

"تم کون ہو"

"میں زہرہ کا بھائی"

"چہ خوب خوب"

"باغی سزائے موت کا حقدار"

"صد خوشی"

حضرت محل کی ہاں میں ملائی سبھی نے ہاں
سلمہ کی سمت کی جو توجہ "یہ آپ ہیں
کیجیے سزا تصور کی تجویز آپ ہی
ہاں! ان کے ہاتھ کھول دیے جائیں خواہ یہ
ہمراہ باغیوں کے تھیں شورش میں جھنجھر کی
ہم بیگموں کو دیکھتے ہیں احترام سے"
زنجیر جھنجھنا کے گری، ہاتھ کھلتے ہی
قاتل کٹار، تنگ کمر سے ہوئی بلند
سلمہ کے نرم سینے میں پیوست ہو گئی
اس غمزدہ چھریرے بدن کے اسیر نے
گردن جھکائی اور کیا دیدار آخری
ہلکی سی چیخ گونج اُٹھی ایوان خاص میں

عالم پناہ کے ایک اشارے کی دیر تھی
طنّاز و فتنہ ساز کا رقص ابتدا ہوا
جاگ اُٹھا سحرِ سامری، محشر بپا ہوا
طبلے پہ تھاپ پڑتے ہی چھاگل چھنک اُٹھی
گھنگھرو بجے کہ شیش محل چھن چھنا گیا
مبہوت مُرکی مُرکی پہ محفل ہوئی تمام
مسحور تال تال پہ سب حاضرین ہوئے
ٹھمکی تو جاگ جاگ اُٹھے فتنے خواب سے
جھومی تو قوس قوس بدن کی جھلک اُٹھی
لہرا گئی تو ٹوٹ گئے رشتے ضبط کے
گھومی تو جھلملانے لگے سارے پیچ و خم
چھم سے چلی تو ہوش کے سب کام رُک گئے
فن اور شباب شیر و شکر تھے کہ اس گھڑی
حضرت محل کے سامنے سلمہ کہیں نہ تھی
چھوٹا پسینہ، رنگ اُڑا، دل دھڑک گیا
چوکی پہ اس کی بیٹھی تھی اک مہری کاسنی
تالی بجی تو خوف سے پہلی کنیز کے
پیروں میں بیڑیاں تھیں کلائی میں ہتھکڑی
کچھ سوچ ہی رہی تھی وہ سرتاج بیگمات
اک غلغلہ بلند ہوا، پہلی سنسنی
اور تکتے تکتے محفلِ رقص و سرود میں
نیزے اُٹھے، سنانیں تُلیں، تیغ چل گئی
چیخیں بلند ہونے لگیں تا بہ آسماں
بلوہ تھا اک حرم میں، نہ آپے میں تھا کوئی
تیشہ اور تیغ تھا کہ باقی رہی نہ کچھ
پاؤں میں تھی کنیز کے بازو کی اوڑھنی

* * * * * * *

لہراتے ہی نشانِ بغاوت نگوں ہوا
میدان میں اُترتے ہی تلوار کے دھنی
مارے گئے سُرنگ ہیں، ایوان میں کٹے،
کام آگئی نگاہِ جنابِ علی نقی
جکڑے گئے جو زندہ بچے باغیانِ شاہ
زہرہ کھڑی تھی فرش پہ پتھر بنی ہوئی
جب باغیوں کا قافلہ ایوان سے چلا
زہرہ کے گھنگروؤں پہ تھی زنجیرِ آہنی
اور ساتھ اک چھریرے بدن کا اسیر بھی

○

"تم کون ہو"

"میں زہرہ کا بھائی"

"خوب خوب"

"باغی سزائے موت کا حقدار"

"صد خوشی"

حضرت محل کی ہاں میں ملائی سبھی نے ہاں
سلمہ کی سمت کی جو توجہ "یہ آپ ہیں
کیجے سزا قصور کی تجویز آپ ہی
ہاں! ان کے ہاتھ کھول دیجئے جائیں خواہ یہ
ہمراہ باغیوں کے نکلیں شورش میں جھنز کی
ہم بیگموں کو دیکھتے ہیں احترام سے"
زنجیر جھنجھنا کے گری، ہاتھ کھلتے ہی
قاتل کٹار، تنگ کمر سے ہوئی بلند
سلمہ کے نرم سینے میں پیوست ہوگئی
اس غمزدہ چھریرے بدن کے اسیر نے
گردن جھکائی اور کیا دیدارِ آخری
ہلکی سی چیخ گونج اٹھی ایوانِ خاص میں

"صد آفرین اے سلمہ یقیناً دلبر تھی
صد احترام!! اودھ کی تڑپتی ہوئی دلہن"
حضرت محل کی پلکوں پہ آنسو تھے اُس گھڑی
"ہاں بولیئے کہ آپ سے کیسا سلوک ہو؟"
"جو باغیوں کے ساتھ ہو وہ بھی ہے گشتنی
بیگم اودھ کی ورنہ بنا دیجیئے حضور"
بکھری لبوں پہ زہرہ کے زہریلی سی ہنسی
"خلوت کدے میں ملنے کی خواہاں ہے بہ جناب
ہم کر رہے ہیں تم کو رہا آج اور ابھی"
یہ سُن کے لوگ ورطۂ حیرت میں پڑ گئے
یہ حکم تھا عجیب، فراست تھی یہ نئی

○

"تم اس محلے میں پڑی کیوں، چھپا نہیں"
حضرت محل سے زہرہ جو تنہائی میں ملی
"ڈالا ہے اس کے پیار نے اس آگ میں مجھے
باعث تری رہائی کا بس ایک ہے یہی
تو بیگموں کے حال پہ حیران کیوں ہوئی"
"جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا ہے آپ کو
ذی فہم و عقل، صاحب دانش ہیں واقعی
تھا عزم یہ کنیز کا، یہ رسم بیگمات
کر کے رہے گی ختم، مگر کچھ نہ چل سکی
کیا یہ ستم نہیں کہ . . . ."
"———— میں سمجھی تمام بات"
حضرت محل نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی
"یہ بیگمات بھی تو ہیں کمزور عورتیں
حضرت محل کی بات ہے کچھ اور بات جی
چلتا ہے میرا سکہ تو معنی ہیں اس کے یہ
بابا مرے وزیر اودھ ہیں علی نقی

محفوظ میرے سینے میں ہیں زخم بیگمات
ہوتی ہے ان کے حال پہ تکلیف مجھ کو بھی
دریافت کرنا چاہتی ہوں میں یہاں یہ بات
زہرہ اودھ کی گدی پہ گر آج بیٹھتی
یہ بیگمات جاتیں کدھر؟ تھا کوئی مقام؟
وہ باغی نوجوان وہ تلوار کے دھنی،
زہرہ کی اور بہنیں پہنچتیں نہ اس جگہ؟
رسم کہن سے موڑ نہ سکتے وہ منہ کبھی
سوچا نہیں ہے تو نے مگر اس سوال پر،
دِلی کو لوٹ سکتی ہے دِلی کی روشنی!!
اس سے بہت ہی پہلے کہ "وہ" دار پر چڑھے"
حضرت محل کے قدموں میں زہرہ تڑپ گئی
آہوئے زخم خوردہ ہو جس طرح دشت میں
"میں بھیک مانگتی ہوں نہ لوٹا سیے تمہی"
بیتاب ہو کے سینے سے اس کو لگا لیا
حضرت محل نے پی لئے آنسو امڈتے ہی
"کیا چاہتی ہو بولو! اگر ہو سکا تو ہم
دیں گے ضرور، بخل نہ کر پائیں گے ذری"
"مجھ کو بھی اس کے ساتھ سزا موت کی ملے"
حضرت محل سے کہہ کے یہ زہرہ الگ ہوئی
"زہرہ بڑے نصیب ہیں تیرے خدا گواہ
منظور ــــ اور بھی ہے تمنا تری کوئی؟"

○

"باغی کے ساتھ زہرہ بھی سُولی پہ چڑھ گئی"
دن ہوتے ہی خبر یہ بھرے شہر نے سُنی
لیکن کسی نے دیکھے نہ وہ تابدار اشک
حضرت محل کی آنکھوں میں تھی جن کی روشنی،

○

راجہ رانی

احمد شریف

کئی سال پہلے ——

—— شیدا رشیدا بنا تو نہروں کے محکمے میں بیلدار تھا۔ اور ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں کے جال کی اوٹ سے شانتی کو دیکھ دیکھ کر راجہ بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

ان دنوں وہ پیرو دھائی کے پل کے پار سرائے بیلی رام کے ساتھ ملے ہوئے نیم پختہ مکان میں رہتا تھا جس کے وسیع آنگن میں دھول اُڑتی رہتی اور دالان کی نیچی چھت کی کڑیوں میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ویسے اس ماحول میں روح ہر وقت تازہ رہتی۔ رات گئے تک طبلے پر تھاپ پڑتی اور گھنگھرو چھن چھن چھنکتے رہتے۔ مکان کے پچھواڑے پوربی ماشکیوں کا محلہ تھا جن کی سیاہ رو لڑکیاں گیارہ بارہ سال کی عمر ہی میں گریبانوں میں نیم پکے اخروٹ لئے گھروں سے بھاگ جاتیں۔ چند سال بعد جب وہ سرائے بیلی رام کے چکلے میں آ بیٹھتیں تو مائیں اپنی بیٹیوں اور بیٹیاں اپنی ماؤں کو بھول جاتیں۔

شیدے نے ماشکیوں کے محلے کے ادھ پکے اخروٹوں سے بے پرواہ ہو کر ہمیشہ رام پرشاد کی حویلی کی طرف ہی دیکھا جس کی ڈیوڑھی کی ساری چوکھٹ اور دروازوں پر سنہری پترے جڑے ہوئے تھے اور چھت پہ سونے کی کان، سر سے دوپٹہ ڈھلکائے بجلیاں سی گرایا کرتی تھی۔ شانتی اتنی حسین نہ بھی ہوتی تو شیدا اس کے لئے ضرور آہیں بھرتا۔ یہ خیال نہ جانے کب اور کیسے اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا کہ ایک وقت اس کی زندگی میں آئے گا جب لوگ اسے جھک جھک کر سلام کریں گے۔ اس خیال پر وہ ہمیشہ مسکرا کر اپنے آپ کو گالیاں دیتا —— اُلو کے پٹھے، ہونق، لوگ صرف بابا کو سلام کرتے ہیں —— اپنے آپ کو گالیاں دے کر بھی اس کی تسلی نہ ہوتی تو وہ اداس ہو جاتا۔

جب وہ اس مکان میں آ کر رہا اور اس کی نظر پہلی بار شانتی پر پڑی تو اس کی آنکھیں جگمگا اُٹھیں۔ وہ اس وقت چھت پہ زینے کے پاس کھڑا تھا۔ شانتی مسکرا کر غڑاپ سے دیوار کے نیچے چھپ گئی اور اس کے دماغ میں ایک پھرکی سی گھومنے لگی۔ شانتی اور بابا ایک دوسری کے تعاقب میں بڑی تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ شانتی اور بابا، بابا اور شانتی۔

اس کے مکان کی چھت بالکل سپاٹ تھی اور وہاں کھڑے ہو کر تاک جھانک کرنا اخبار [illegible] کے مترادف تھا۔ کئی دن وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔ آخر ایک شام تیل کی شیشی لے کر چھت پر جا بیٹھا اور جانگیہ باندھ کر بدن پہ مالش کرنے لگا

شانتی اپنی چھت پر جھروکوں کے پیچھے آ بیٹھی اور یوں آہستہ آہستہ محبت کی ایک داستان پروان چڑھنے لگی۔ جب بھی اچانک اس کی نظر ماشکیوں کے محلے کی طرف اٹھتی شبراتن کی شربتی آنکھیں دیکھ کر وہ جھنجھلا اٹھتا۔ شبراتن کی موتیے کے کھلائے ہوئے پھولوں جیسی آنکھوں میں ایک کہانی ہوتی جس کو نقطۂ عروج تک پڑھنے سے وہ ہمیشہ کتراتا۔ وہ سوچتا اس کہانی میں مشک اور پھٹے ہوئے بوکے کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے۔ بہت ہوا تو کھونٹی لگی مشک سے پانی کی ایک دھار بہ نکلے گی۔ اور شانتی ——— وہ سوچتے سوچتے مسکرا کر حویلی کی طرف دیکھتا تو خیالوں میں بسی ہوئی سونے کی اینٹیں دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔

ایک شام وہ مورچہ سنبھالے چھت پر بیٹھا تھا۔ شانتی جھروکوں کے اس طرف بیٹھی مسکرا رہی تھی اور وہ نیم وا آنکھیں جھروکوں پر لگائے، ہاتھ باندھے، بھگتی رس میں ڈوبا جھوم جھوم کر ادم۔ شانتی، شانتی، شانتی کا جاپ کر رہا تھا۔ اتنے میں نیچے کسی نے دستک دی۔ وہ برافروختہ سا ہو کر نیچے آیا۔ لیکن دروازہ کھولتے ہی اس کی ساری خفگی جاتی رہی۔ باہر ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کو عورت کہنا اسے کچھ برا سا لگا۔ وہ ابھی لڑکی سے عورت نہیں بنی تھی۔ بس لڑکی اور عورت کے درمیانی فاصلے کی کچھ منزلیں طے کی تھیں اس نے۔ شیدے نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پہ زبان پھیری اور ذرا سا آگے جھک کر منکسر المزاجی سے پوچھا :-

" کہیے "

" دروازے سے ہٹئے تو کچھ کہوں بھی "

وہ ایک پیر دروازے کے اندر رکھ کر بولی۔ شیدے کے کانوں کے قریب ٹھنڈے میٹھے پانی کا جھرنا رم جھم کرنے بہنے لگا۔ وہ جلدی سے دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ بنا اس کی طرف دیکھے اندر آ گئی۔ صحن میں کھڑی ہو کر اس نے دونوں ہاتھ کولھوں پہ رکھے اور مکان کا جائزہ لینے لگی۔ شیدا اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ یوں کھڑی ہوتے سے اس کے بھرے بھرے کولھوں کا ابھار اور کمر کا خم اور بھی نمایاں ہو گئے۔ اندر کی طرف بھیجے ہوئے شانوں کو دیکھ کر اس کا دل چاہا وہ آگے بڑھ کر اسے گدگدائے تاکہ وہ مچل کر بار بار بل کھائے تو وہ اس کے انگ انگ کو دیکھ سکے۔ مگر یوں چپکے سے اکیلی گھر میں چلی آنے پر بھی شیدے کو اس کے قریب جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے دالان میں کھلنگی چارپائی پر بے ترتیب بستر دیکھ کر شیدے سے پوچھا۔

" اکیلے رہتے ہو؟ "

" ہاں "

" تب تو اور بھی اچھا ہے "

وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسی اور اس کے ماحول میں بکھرے موتیوں کی ایک کرن سی لہرائی۔ وہ اس کے قریب آ گیا۔

" اکیلے مرد اور عورت کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو تو مزا ہی مزا ہے "

وہ خود بخود اپنی بات کی وضاحت کرنے لگی۔ شیدے نے حوصلہ کرتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسے دالان میں لے آیا۔ چارپائی پر اسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھنے لگا۔

" یہیں کہیں رہتی ہو؟"
" ہاں ساتھ والے مکان میں "
" اکیلی؟"
" ہوں - ابھی تک لیسنس نہیں ملا "
اس کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر شیدے نے کھینچ کر اسے چارپائی پر لٹا لیا اور خود بھی اس کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا - چارپائی ڈھیلی ہونے کی وجہ سے وہ گتھم گتھا سے ہو گئے - نرم نرم گداز جسم شیدے کے بوجھ تلے لچک گیا - وہ سر کو ہتھیلی پر ٹکا کر بولی -
" لالٹین لینے آئی تھی - پر لگتا ہے تمہارے ہاں بھی نہیں ہے "
" ہے تو ـــــ جلاؤں ؟"
" رہنے دو ـــــ اب کیا ضرورت ہے "
وہ مسکرائی اور ایک بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی - شیدے نے ایک ہاتھ سے اس کی زلفیں بکھیر دیں - اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا - اس کے جسم کی مہک کمرے کے گھٹے گھٹے ماحول میں رچ بس گئی - شیدا نہ جانے کس کس نام سے پکار کر اسے پیار کرنے لگا حالانکہ اس کا سیدھا سا نام تھا پر تبو - رات کے کسی حصے میں وہ اسے کلاوے میں لے کر جذبات سے مغلوب آواز میں بولا -
" تم میری رانی ہو "
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی -
" پہلے خود تو راجہ بن لو "
" ایک روز بن ہی جاؤں گا "
اس کے ذہن میں سونے کی اینٹیں جھلملائیں -
" وہ بھاگ بھی چلے گی ساتھ ؟"
پر تبو کے بظاہر بے تکے سوال پر اس نے چونک کر پوچھا -
" کون ؟"
" شانتی "
شیدے کے جذبات کی چڑھتی ندی جیسے ایک دم لق و دق صحرا میں پہنچ کر سوکھ گئی - وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کیا جواب دے کہ پر تبو کہنے لگی -
" مجھے سب پتہ ہے - میں جانتی ہوں اس کام میں میری ضرورت پڑے گی - اسی لئے آئی تھی "
وہ دیر تک گومگو کی حالت میں لیٹا رہا - وہ سوچ رہا تھا پر تبو کی پیش کش ٹھکرا دے یا قبول کرے - آخر وہ یہ

سوچ کر خاموش ہو رہا کہ نازک معاملات نازک ہاتھوں ہی سلجھ جائیں تو اچھا ہے۔ اس نے پرتیو کو سینے سے لگا لیا۔ پرتیو کہنے لگی۔

"دیدار بازی اور رب راضی کر چھوڑو۔ کسی طرح لے چلو اسے۔"

"پر وہ اکیلے میں ملے بھی؟"

"اچھا، میں انتظام کروں گی۔"

پرتیو نے تن کر انگڑائی لی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ شیدے کی قربت سے بے نیاز ہو کر بے سدھ ہو کر سو گئی۔ شیدا دیر تک سوچ میں غلطاں جاگتا رہا۔ اسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ شانتی کی موجودگی میں پرتیو کا مصرف کیا ہوگا!

اگلی صبح پرتیو نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور دھونسی ہوئی چمنی والی لالٹین لے کر چلی گئی۔

پرتیو چوری چوری دو تین گاہک بھگتا کر رات کے نو بجے تک اس کے پاس آ جاتی اور وہ رات گئے تک راجا اور رانی کی طرح ہمسایہ ریاست پر شبخون مارنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ رام پرشاد کی حویلی کی چار دیواری تک محدود مختصری ہمسایہ ریاست اپنی جگہ کافی مستحکم تھی جس کا چور دروازہ تلاش کرتے کرتے انھیں کئی روز گزر گئے۔ بالآخر پرتیو نے چور دروازہ تلاش کر لیا۔

اس رات پرتیو نے شیدے کے کندھوں پر چڑھ کر کمیٹی کی لالٹین بجھا دی۔ حویلی کے آس پاس گہرا اندھیرا چھا گیا۔ جب شیدے نے حویلی کے پھاٹک کے اندر قدم رکھا تو پرتیو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ دل تھام کر کمیٹی کی لالٹین کے پیچھے دیوار کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ وہ جانتی تھی شانتی طلائی زیورات سے بھرا ہوا اٹیچی کیس سنبھالے حویلی کا دروازہ دھیرے سے کھول کر باہر نکلے گی۔ شیدا اس کا بازو تھام لے گا۔ اس وقت اس پر یہ عجیب احساس نہ جانے کیسے طاری ہونے لگا کہ وہ دولہا اور دلہن کے انتظار میں کھڑی ہے۔ اس کا دل چاہا وہ بھاگ کر گھر کے دروازے میں جا کھڑی ہو اور جب دولہا اور دلہن اندر آنے لگیں تو وہ شگون کا تیل چوکھٹ کے دونوں طرف ڈال کر جلدی سے دلہن کو گلے لگا لے۔

لیکن پھاٹک پر کوئی آہٹ نہیں تھی۔

شانتی کو لے کر دور اندیش شیدا پھاٹک کی طرف آنے کی بجائے عقبی دروازے کی طرف ہو لیا۔ اس نے پھاٹک کی طرف تاریکی میں دیکھا اور مسکرا کر سوچنے لگا۔ پھاٹک کی طرف دیکھتے دیکھتے جب پرتیو کی آنکھیں تھک جائیں گی تو وہ آپ ہی آپ گھر چلی جائے گی۔ لیکن پچھواڑے کی طرف اندھیرے میں قدم بڑھاتے ہی اچانک سونے کی کان میں دھماکا ہوا۔

"پَف — پَف پَف —"

بل ٹیڑھ کر روکتے روکتے شیدے کے سر پر جیسے سونے کی ایک بھاری سل آ گری۔ سنہری ذرات اس کے ارد گرد ناچنے لگے۔ اور پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ مکمل تاریکی۔ جہاں کوئی سرسراہٹ کوئی آہٹ نہیں تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے مکان میں جھلنگی چارپائی پر پڑا تھا۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پرتیو اس کی چارپائی کی پٹی سے لگی لمبی لمبی گھنیری پلکوں پر موٹے موٹے آنسو سنبھالے اسے بہت دور سے پکار رہی تھی۔

"شیدے شیدے!"

اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - وہ روتی رہی اور شیدے کا گریبان بھیگتا رہا - شیدے نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس کے کانوں کے قریب چمکتی آنکھوں والا خونخوار کتا ابھی تک بھونک رہا تھا -

" بُف —— بُف بُف —— "

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا - خوابوں کے شیش محل کی کڑیاں ابھی تک ٹوٹ رہی تھیں - دُور تک کھنڈر ہی کھنڈر پھیلے ہوئے تھے اور ملبے کے ڈھیر پر کوئی بھوکا پلّہ چیاؤں چیاؤں کر کے رو رہا تھا - اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں -

اس واقعہ کے تیسرے روز جبکہ شیدا ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا رام پرشاد کی حویلی کے پھاٹک پر شہنائی بجنے لگی - پریتو نے ہراساں ہرنی کی طرح چونک کر سر اُٹھایا اور شیدے کی طرف دیکھ کر مضمحل اور اُداس ہو کر بیٹھ گئی - جس کے دم قدم سے ہنگامہ تھا - اور اس ہنگامے پر ساری رونق موقوف تھی - وہ چلی گئی - دُور جاتے ہوئے ڈھول کی آواز دیر تک ان کے کانوں میں گونجتی رہی جیسے سرد اندھیری رات میں دُور کوئی کتا بھونک رہا ہو -

تندرست ہوتے ہی شیدے کو بڑے انجنیئر کے بنگلے پر پیشی بھگتنی پڑی - کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے کئی بار اس کے سینے میں چکی سی چلی اور اس کا دل چاہا بیلداری چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے - وہ جانتا تھا پیشی کی وجہ کیا ہے —— رام پرشاد شہر کا بارسوخ آدمی تھا -

جب وہ واپس آیا تو پریتو غمزدہ سی دہلیز پر بیٹھی اس کی راہ تک رہی تھی - وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی -

" کیا ہوا وہاں ؟ —— کیسے گزری ؟ "

" ارے بڑا ڈراما ہوا وہاں ، اندر آؤ "

شیدا چہک کر بولا - اسے چہکتا دیکھ کر پریتو کے گالوں پر گلاب سے کھل اُٹھے - شیدا صحن میں آکر دروازے کے قریب بچھی ہوئی چارپائی پر نیم دراز ہو گیا - پریتو چوکی لے کر اس کے قریب بیٹھ گئی - اور ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکا کر ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھنے لگی جیسے سچ مچ کوئی ڈراما ہونے والا ہو - شیدا کہنے لگا -

" میں نے ڈرتے ڈرتے صاحب کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ بھوت کی طرح اندھیرے کونے سے اُٹھ کر دبے پاؤں میری طرف آیا - اور میرا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا —— چھوکریاں بھگاتے ہوا ایں ! —— میں سہم گیا - اس وقت انگریز بادشاہ اس کے اندر تھا - اس نے دھکا دے کر مجھے صوفے پر گرا دیا اور جھک کر میری آنکھوں کے سامنے انگلی نچا کر کہنے لگا —— چھوکری - ہی ہی ہی —— میرا دل چاہا میں بھی کھی کھی کر کے ہنسنے لگوں - مگر میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ شرابی پر لمحہ بھر میں سو رنگ آتے ہیں - اچانک وہ دھپ سے میرے پیروں میں قالین پر بیٹھ گیا اور بڑے غم سے بولا —— سب خوبصورت چھوکریاں بھاگ جاتی ہیں عبدالرشید "

شیدا بات کرتے کرتے سر اُونچا کر کے تن کر بیٹھ گیا - وہ وہاں بھی اسی طرح تن کر بیٹھ گیا تھا - حالانکہ اس وقت اس پر خواب کا سا عالم طاری تھا - اس کے من مندر میں یکبارگی خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں - زندگی میں پہلی بار اتنے بڑے افسر نے اسے عبدالرشید کہہ کر پکارا تھا اور اس کی شخصیت کے سارے کھردرے پہلوؤں پر ایک دم رندہ پھر گیا تھا - وہ پریتو کو

ہمہ تن گوش پا کر بولا ۔

" پتہ نہیں کون سی خوبصورت چھوکری اس کے دل میں بسی ہوئی تھی ۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میں نے دلاسہ دینے کی خاطر ڈرتے ڈرتے کہا ——— آپ بہت اُداس ہیں صاحب ——— وہ اور بھی اداس ہو کر کہنے لگا ——— کوئی اُداسی سی اُداسی ہے عبدالرشید ——— اس نے جیب سے رومال نکال کر بھوں کر کے ناک صاف کی اور اٹھ کر پرے چلا گیا۔ میں نے سوچا جس گھر میں کانچ کی چوڑیاں نہیں بجیں گی وہاں اُداسی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا!"

" تو وہ اکیلا رہتا ہے کیا؟"

پربتو نے پوچھا ۔

" ہاں ۔ اسے دیکھ کر میرا جی بھر آیا ۔ اور میں یہ سوچ کر چلا آیا کہ لاؤ آج اس کی حاجت روائی ہی کر دیں" اس نے پربتو کی طرف دیکھا اور اسے خاموش پا کر کہنے لگا " فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ کہیں روتے روتے مر ہی نہ جائے سالا "

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور پربتو کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں کوئی کانچ کی چیز گر کر ٹوٹی ہو۔ اس کے گالوں پر کھلے گلاب یکبارگی مرجھا گئے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ خوشی سے ہار سنگار کر کے ساتھ ہو لیتی۔ رشید اگرچہ اس طرح چپکے سے دبے پاؤں اس کی زندگی میں چلا آیا تھا کہ اس کی اپنی ہستی مٹ سی گئی تھی۔ کوئی رشتہ، کوئی ناتا نہ ہونے پر بھی ایک بے نام سی لگن تھی ——— دوری کے خیال سے وہ کانپ اٹھی اور ملتجیانہ لہجے میں بولی ۔

" رشیدے کسی اور کو لے جاؤ وہاں "

" ارے جب دھندہ ہی کرنا ہے تو کسی اونچی جگہ کیوں نہ ہو۔ چل، شاباش "

رشیدے نے پچکار کر کہا۔ پربتو سوچنے لگی۔ آخر وہ دھندا ہی تو کرتی ہے۔ خواہ مخواہ خیالوں میں ایک چھوٹا سا گھر بسا بیٹھی ہے ۔ پگلی ——— وہ اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لی۔ چلتے وقت دروازے کے کنڈے میں پڑے تالے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔

واپسی پر رشیدے نے دروازہ کھولا تو آنگن میں ایک بگولا آغوش میں سوکھے پتے لیے چکراتا پھر رہا تھا ۔ وہ اندر آ کر نڈھال سا، بازو سر کے نیچے رکھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور بیزاری سے بگولے کے سر کو تکنے لگا جو آسمان کی مٹیالی رنگت میں گھل مل گیا تھا۔ وہ دیر تک چپ چاپ وہاں لیٹا رہا۔ عجیب سی بے چینی اور انتشار تھا۔ وہ اٹھ کر چھت پر چلا گیا۔ عالم پرشاد کی حویلی پر نظر پڑی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک ایک اینٹ اس پر ہنس رہی ہو۔ شبراتن نہ جانے اس وقت کہاں تھی! اس نے ماشکیوں کے محلے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور ادھر پکے اخروٹوں کی منڈی کو اجاڑ پا کر سر جھکائے نیچے اتر آیا۔

وہ اس وقت سچ مچ اُداس تھا۔ وہ چاہتا تھا کوئی اس کے پاس ہو تو وہ اس سے کہے ۔

" کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ——— کیسا دن ہے یہ ——— پربتو، شانتی، شبراتن کوئی بھی تو نہیں ہے "

آخر اس نے یہ سوچ کر دل بہلا لیا کہ بنا راجہ بنے اس نے پربتو کو تو ایک رات کی رانی بنا دیا۔ صبح تک وہ آ ہی جائیگی۔ وہ سر شام ہی کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا اور گئی رات تک نیند کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلے دن وہ پیر ودھائی کے پُل پہ کھڑا دوپہر ڈھلے تک پرنیو کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ شاید یہ پہلا موقعہ تھا کہ سرائے بیلی رام کی رہنے والی پرنیو جیسی عورت پیر ودھائی کا پُل پار کر کے واپس نہیں آئی تھی۔ وہاں کی عورتیں رات کے اندھیرے میں اَن دیکھے ٹھکانوں پہ جاتیں اور اگلی صبح چہروں پہ رات کے افسانے لئے لوٹ آتیں۔ شیدا اُداس ہو کر گھر کی طرف مڑا تو اس کے سینے میں جیسے ایک گلہری چپکے چپکے کچھ کترنے لگی۔

دن گزرتے گئے۔

ایک رات کی رانی سدا کی رانی بن گئی۔

شیدے کو کھونج لگی مشک اور پھٹے ہوئے پوکے کی کہانی دلچسپ معلوم ہونے لگی۔ آنگن میں کوئی بگولا چکراتا تو وہ تھوڑی دیر کے لئے مرجھا جاتا۔ لیکن وہ پہلی سی کسک اب نہیں رہی تھی۔ وہ پیر ودھائی کے پل پر کھڑا ہو کر کبھی کبھی دُور درختوں کے پیچھے نظر نہ آنے والے انجنیئر کے بنگلے کی طرف دیکھتا اور رات کو شبراتن کی زلفوں میں مُنہ چھپا کر سو جاتا۔

ایک دن اسے پرنیو کا پیغام ملا۔ اس وقت اسے پتہ چلا کہ پرنیو کی عدم موجودگی میں دل بہلانے کے لئے اُس نے جو جتن کئے تھے سب بے کار تھے۔ وہ اُڑتا اُڑتا وہاں پہنچا۔ راستہ بھر وہ سوچتا رہا کہ پرنیو اسے دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لگ جائے گی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہے گی ـــــ شیدے مجھے یہاں سے لے چل ـــــ اور وہ اسے کلاوے میں لے کر اس کی زلفیں اُلجھا کر کہے گا ـــــ فکر نہ کر جانِ من کسی رات چپکے سے لے جاؤں گا۔

وہ بڑے تپاک سے ملی اور غم خواری کے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"عبدالرشید اچھے تو ہو؟"

تن کر بیٹھنے کی بجائے شیدے کے دماغ میں اس طرح چھُن سی ہوئی جیسے گرم توے پر پانی کا قطرہ آن گرا ہو۔ اس کے کانوں کی لَویں تک سُرخ ہو گئیں۔ اُس کا دل چاہا تڑسے ایک تھپڑ اس کے مُنہ پہ مار کر کہے ـــــ سالی صاحب لوگوں کی نقل کرتی ہے ـــــ لیکن اس نے تنے ہوئے اعصاب پہ قابو پا لیا جس دُنیا میں وہ آگئی تھی اس کے دستور ہی نرالے تھے! ـــــ نئے ماحول کو اس نے بڑی خوبی سے اپنا لیا تھا۔ وہ بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پرنیو ہنس کر بولی۔

"شانتی کا خیال چھوڑ کے تم ٹھیکیداری شروع کر دو ـــــ بیلداری میں کیا رکھا ہے؟"

وہ پھر بھی خاموش رہا۔ وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی رہی۔

جب وہ واپس ہوا تو نوٹوں کے پلندے کے ساتھ مری روڈ کے سنز گنہ ٹکڑے کا ٹھیکہ اس کی جیب میں پڑا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی رفتار کٹے ہوئے پتنگ کی سی تھی جسے اپنی منزل کا علم نہ ہو۔

کاروباری مصروفیتیں بڑھنے لگیں اور وہ پرنیو، شبراتن اور شانتی کو بھولتا گیا۔ پرنیو سے رسمی سا تعلق باقی تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی پیار کرنے کی بجائے شیدے کا دل چاہتا جھک کر کورنش بجا لائے۔ اور شبراتن راتوں کو ملتی تو وہ اس کے قریب ہو کر اس طرح محسوس کرتا جیسے کسی مال کا سودا کر رہا ہو۔ نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے لال کرتی کے اجاڑ سے علاقے میں ٹھیکیداری کے بچے کھچے مال سے ایک کوٹھی کی بنیادیں اٹھوانا شروع کر دیں۔

زندگی کی کشتی پُرسکون پانیوں میں آگے بڑھنے لگی۔

اچانک ایک رات شیدا اور شبراتن بے موقعہ پکڑے گئے۔ ماشکیوں کا سارا محلہ ٹوٹ پڑا۔ اندھیرے میں وہ ان لوگوں کو پہچان بھی نہ سکا جو اس کے ارد گرد جمع تھے۔ ایک طرف سے غصیلی آواز آئی۔

" قیمہ بنا دو سالوں کا۔"

" ارے نہیں بھائی معاملہ پولیس میں دے دو۔"

کوئی معاملہ فہم بولا۔ ایک منچلا شاید شبراتن کے باوا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

" چاچا میری مانو تو مشک بھر کے تین منزلے پہ چڑھ جاؤ اور اس کو کھڑا کر لو نیچے۔ پھر ایسی باندھ کر دھار ڈالو اس کی ٹانٹ پر کہ اُوپر سے نیچے تک سوراخ ہو جائے۔"

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ایک معمر شخص نے کہا۔

" میری مانو تو ان سالوں کا بیاہ کر دو۔"

اس تجویز پر آناً فاناً عمل ہو گیا۔ اور جب لئے بیلی رام کا علاقہ چھوڑ کر جب وہ لال کرتی کے نئے بنگلے میں آئے تو شبراتن فیروزی ساٹن کی کھلے پائینچوں کی شلوار پہنے شیدے کے آگے آگے تھی۔ وہ ایک آرام کرسی کھینچ کر بیچ برآمدے میں ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ اور شبراتن بدحواس سی، اس مرغی کی طرح کمروں میں گھومتی پھری جسے لڑکوں نے مل کر گھیر لیا ہو۔

شیدے کا معمول سا بن گیا کہ وہ فرصت کے وقت برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ پیرودھائی کے پل کے اس پار کی دُنیا اس کے خیالوں سے رفتہ رفتہ محو ہونے لگی۔ لیکن اس پرسکون ماحول میں اس کی حالت گیس بھرے غبارے کی سی تھی جسے دھاگے سے باندھ کر بچے نے مضبوطی سے تھام رکھا ہو۔ وہ چاہتا کچھ ہو۔ اور نہیں تو کہیں سے ایک مرغ ہی چار دیواری پر اچانک چڑھ آئے اور پھڑپھڑا کر، سینہ پھلا کر کہے ـــــ ککڑوں کڑوں ـــــ وہ سر اُٹھا کر برآمدے سے ملے ہوئے کمرے میں جھانکتا اور شبراتن کو بے ڈول سا جسم لئے پلنگ پر پڑی دیکھ کر پھر آنکھیں بند کر کے اُونگھنے لگتا۔

ایک دن وہ راجہ افتخار کا ایلسیشن کھول لایا۔ شاید اس لئے کہ آتے جاتے دیکھ کر بھونکے گا تو سہی اور یوں گھڑی بھر کو پُرہول سناٹا تو ٹوٹ جائے گا۔ اس نے زنجیر ڈال کر اسے پھاٹک کے پاس باندھ دیا اور برآمدے میں پڑی آرام کرسی میں ڈھیر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کتے نے بھونکنے کی بجائے آرام سے بیٹھ کر تھوتھنی اگلی ٹانگوں پر رکھ لی اور شیدے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ شیدے کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے کتا اس کا تمسخر اُڑا رہا ہو۔

خلاف توقع اس وقت پرنبو کا ملازم اسے بلانے کے لئے آیا۔ شیدے کے دل کے کسی ویران گوشے میں گدگدی سی ہوئی۔ اس نے اندر آ کر بڑے اہتمام سے سفید شلوار پر سرج کی کالی شیروانی پہنی۔ پھندنے والی سرخ ٹوپی سر پر رکھی اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

پرنبو جس ماحول میں اسے ملی وہ لٹا لٹا سا تھا۔ سامان ٹرک پر لادا جا رہا تھا۔ اور وہ باغیچی میں چہرہ ہاتھوں کے کٹورے میں رکھے اداس بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھا۔ اسے اداس دیکھ کر اس کا دل ڈوب سا گیا۔ پرنبو نے پھیکی سی ہنسی کے

ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"ہم لوگ جا رہے ہیں"

وہ خاموش رہا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر پرتیبھا کہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے۔ اس کی قربت سے ساری اداسیاں آپ ہی آپ دُور ہو جائیں گی۔ پرتیبھا بولی۔

"میں نے سوچا پتہ نہیں پھر کبھی ملنا ہو یا نہ ہو، جاتی دفعہ دیکھ تو لوں"

شیدے کے دل میں ایک کراہ سی گونجی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پرتیبھا پلکوں پر لرزتے آنسو سنبھال کر بولی۔

"شیدے، تم راجہ بن گئے اور میں رانی، پر جدا جدا دیسوں کے۔ ہے نا عجیب سی بات"

وہ زبردستی مسکرائی۔ شیدا سرک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"پرتیبھا"

"اب کیا فائدہ" وہ اس کے ہاتھ الگ ہٹا کر پرے ہو گئی اور کہنے لگی "اب تو تم بھارا جہ بن جاؤ گے۔ صاحب نے تمہارے لئے لکھا ہے ـــــ عبدالرشید کو خانصاحب بنا دو، وہ بہت کام کا آدمی ہے ـــــ خان صاحب عبدالرشید"

وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔ اس کا انداز تحقیر آمیز نہ ہونے کے باوجود وہ دیر تک وہاں بیٹھ نہ سکا۔ وہ جانتا تھا یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ پھر بھی وہ اُٹھ کر چلا آیا۔

جب وہ بنگلے کے قریب پہنچا تو ایلشین بے تحاشہ بھونک رہا تھا ؂

نئی کتابیں

تاتاریوں کی یلغار۔ مصنف ہیرلڈ لیم، ترجمہ عزیز احمد، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، بہ اشتراک مکتبۂ فرینکلن نیویارک۔

اسلامی سلطنتوں کو جتنا نقصان تاتاریوں کی یلغاروں نے پہنچایا وہ اپنی جگہ بڑی ہی اندوہناک داستانیں ہیں۔ سرحدِ چین سے بحیرۂ روم کے جن خطوں تک یہ لوگ پہنچے وہاں علم و فضل کے خزانوں اور جاہ و حشمت کی تمام تر بنیادوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ عباسیوں کا وہ بغداد جس کی آج بھی کہانیاں سُن سُن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اسے بھی تاتاریوں نے خواب و خیال بنا دیا۔ غرض جہاں پہلے عظیم الشان کتب خانے اور عظیم الشان محل تھے، وہاں کھنڈر ہی کھنڈر رہ گئے ——— ایک مؤرخ نے لکھا ہے ——— "ایک ارغوانی ندی تاتاریوں کی گزرگاہ کا نشان بتاتی تھی۔"

ہیرلڈ لیم نے اب تک جتنی بھی تاریخی انداز کی چیزیں لکھیں ان کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ لیم ہر موضوع پر یونہی قلم نہیں اٹھاتا بلکہ اس کے تمام تر ماخذوں سے استفادہ کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کو اس سے اختلاف ہو یا لیم ہی صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب نہ ہوا ہو مگر وہ لکھنے کا حق ضرور ادا کرتا ہے۔ ابھی پچھلے برس لیم مواد ہی کے سلسلے میں پاکستان بھی آیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لکھنے سے پہلے کتنی ریاضت کرتا ہے۔ لیم خود کہتا ہے کہ "شطرنج کھیلنا اور کتابیں اور مسودے جمع کرنا میرے محبوب مشغلے ہیں جن سے بلند پایہ کتابیں تیار ہوتی ہیں۔"

یہ کتاب اسلامی سلطنتوں کو گہنا دینے والے دور کی ایک خونچکاں داستان ہے جو اپنے مواد کے اعتبار سے بڑی حد تک معتبر ہے۔ اسلامی تاریخی ناولوں میں جتنی دھاندلی ہمارے مصنفین کرتے ہیں وہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ ہم پہلے شرر ہی کو رویا کرتے تھے کہ وہ اپنی داستان سرائی میں، تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کے رکھ دیتے ہیں مگر آج کل جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ تو ناقابلِ برداشت ہے ——— مگر لیم کی تحریروں میں واقعاتی صداقت زیادہ مجروح نہیں ہوتی۔

مکتبۂ فرینکلن ایک امریکی فرم کے اشتراک سے چل رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ امریکی ادیبوں اور امریکی ادب کو روشناس کرائے۔ وہ خوب ادیبوں کو معاوضہ دیتے ہیں (جو اچھی بات ہے) جس کی وجہ سے ادیب اپنی تخلیقات کی بجائے ترجموں میں منہمک ہو گئے ہیں ——— یہ اپنے ادب کے لیے کوئی نیک فال نہیں ——— ہماری بھی حکومت کو چاہیئے کہ وہ بھی بیرونی ممالک میں اپنے ملک کے ادیبوں، اپنے ملک کے ادب اور اپنے ملک کے کلچر کو روشناس کرانے کے لیے سوچے ——— ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد پاکستان میں بھی کوئی ایسا نجی ادارہ بن جائے جو اپنے سرمایے سے مکتبۂ فرینکلن ہی کی طرح اپنے ملک کی خدمت کرے۔

یورپ میں چار ہفتے: - از آغا شورش کاشمیری۔ کاغذ نفیس۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ سائز ۱۸×۲۲ حجم ۱۷۶ صفحات
قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ چٹان لاہور

آغا شورش کاشمیری مدیر ہفتہ وار چٹان لاہور، ایک مشہور صحافی اور شعلہ بیان مقرر ہیں۔ مئی ۵۹ء میں وہ چار ہفتے کے لیے یورپ کی سیاحت کو گئے تھے اور جرمنی، آسٹریا، فرانس، انگلینڈ، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور لبنان میں گھومے پھرے تھے۔ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ خطوں کی صورت میں اپنی بیٹی اور دوستوں کو لکھا۔ انہی خطوط کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔ اس میں دو چار خط ایسے بھی ہیں جو پوسٹ نہ کیے گئے اور اب اس کتاب کے ذریعے مکتوب الیہم تک پہنچائے گئے ہیں۔ یہ خطوط کہانی بھی ہیں رپورتاژ بھی اور روزنامچہ بھی۔ عبارت میں اتنی موہنی ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر دل نہیں مانتا۔ ایک دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے
۲۵ مئی ۵۹ء کو وی آنا سے بیٹی کو لکھتے ہیں:-

"آسٹریا یورپ میں ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ تمام یورپ چھوٹے بڑے ملکوں میں بٹا ہوا ہے بعض ملک ہمارے ہاں کے ایک دو ضلعوں کے برابر ہیں۔ بعض ایک آدھ کمشنری کی وسعت، رقبہ یا آبادی رکھتے ہیں آسٹریا کی کل آبادی ساڑھے اکہتر لاکھ ہے بلکہ اس سے بھی سولہ لاکھ کم، ۸۹ فی صد لوگ کیتھولک مذہب کے پیرو، باقی دوسرے مذاہب میں منقسم ہیں۔ کچھ مسلمان بھی ہیں لیکن آٹے میں نمک کے برابر۔ مسلمانوں نے ایک جمعیتہ الاسلام قائم کر رکھی ہے۔ ایک جلاوطن ترک جمعیتہ کا صدر ہے۔ سیکرٹری ایک انڈونیشی نوجوان ہے . . . . ہم دفتر جمعیتہ میں ان سے ملنے گئے۔ صدر اور سیکرٹری دونوں تپاک سے ملے۔ اسلام کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔ اسلام علیکم و رحمۃ اللہ کہتے ہی گویا برسوں کی شناسائی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خان (مرحوم و مغفور) کے الفاظ میں جمعیتہ کا دفتر گویا کلیسا کے قلب میں اللہ اکبر کی صدا ہے۔"

"قصر کا پائیں باغ حد درجہ طلسماتی ہے۔ رو رویہ قالینوں کی طرح مٹے ہوئے درختوں کی قطاریں دیواروں کی طرح کھڑی ہیں۔ سبزے کی ان بالا بلند دیواروں کی پاکستان یا ہندوستان میں کوئی سی نظیر نہیں ملتی — کوئی تشبیہہ یا استعارہ بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ مشرقی شاعری کے بیل بوٹے بھی یہاں مرجھا جاتے ہیں، چونکہ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ درختوں نے سبزے کی زبان میں قصیدے کہے ہیں۔"

"برلن —— ماسکو کے منہ پر ایک زناٹے کا طمانچہ ہے۔ خروشیف اور ان کے ساتھیوں کے دماغ میں ممکن ہے یہ خیال ہو کہ اس طرح وہ اپنی فتح کا غلغلہ بلند کیے ہوئے ہیں لیکن مشرقی برلن کی عمارتیں اور باشندے اس ساری صورت حال کے خلاف احتجاج کی صدائیں — کہیں کوئی رونق نظر نہیں آتی۔ سڑکوں پر افلاس میں پلے ہوئے بچے نظر آتے ہیں، یا سر نیہوڑائے ہوئے بڈھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس طرح چلے جاتے ہیں جیسے ابھی ابھی جوان اکلوتے بیٹے کی لاش دفنا کر آئے ہوں۔"
گٹ اپ کے لحاظ سے کتاب مثالی ہے اور تصاویر سے مزین۔

یورپ نامہ (جلد اول)

مصنف: حکیم محمد سعید دہلوی

کاغذ، لکھائی، چھپائی معیاری

سائز: ۱۸×۲۲

حجم: ۴۹۶ صفحات

قیمت فی جلد: آٹھ روپے

ناشر: ہمدرد اکیڈمی - نیو ٹاؤن کراچی نمبر ۵

پاکستان میں ہمدرد وقف کے متولی حکیم حافظ محمد سعید صاحب دہلوی کو ابتدا سے سیر و سیاحت سے طبعی مناسبت رہی ہے۔ وہ اس شوق کو پورا کرنے کے سلسلے میں آدھی دنیا کا سفر کر چکے ہیں۔ عام مسافروں کی طرح عیش و آرام ان کا مقصد کبھی نہیں رہا۔ وہ جہاں جاتے ہیں پورے انہماک کے ساتھ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجربات سے اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۹۵۶ء میں انھوں نے یورپ کا تین ماہہ سفر کیا۔ مغربی ملکوں کا یہ سفر ان کے دوسرے سفروں سے قدرے مختلف اور زیادہ مطالعاتی و مقصدی تھا۔

وہ روزانہ صبح سے شام تک جو قابلِ دید مقامات دیکھتے، جن کارخانوں، تعلیمی اداروں اور صحت و ثقافت کے مرکزوں میں جاتے اور جتنی معلومات وہاں سے حاصل کرتے رات کو اپنی قیام گاہ پر بیٹھ کر اس کی یادداشت قلم بند کر لیتے۔ اس طرح ایک مفید اور دلچسپ روزنامچہ تیار ہوا جس کا ایک حصہ جو ۲۲ اگست سے ۷ ستمبر ۱۹۵۶ء تک کے مختصر سے وقفے کا ہے، نہایت سلیقے سے مرتب ہو کر "یورپ نامہ" (جلد اول) کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں صرف ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے حالاتِ سفر ہیں جو ان ملکوں کے تاریخی، جغرافیائی، علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی، معاشرتی اور طبی حقائق کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ جگہ جگہ دو رنگی اور چار رنگی تصویریں دی گئی ہیں جن سے کتاب کے حسن میں بھی اضافہ ہوا ہے اور حالات و مطالب کے فہم و ادراک میں بھی مدد ملتی ہے۔ ذاتی تاثرات اور آنکھوں دیکھے حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی تفصیلات بھی مقامی تاریخوں اور گائڈوں کی مدد سے دی گئی ہیں۔ انداز بیان دلکش اور معلومات مفید ہیں۔ اچھے سفرنامے کی بہت سی خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں البتہ بعض جگہ ضرورت سے زیادہ طولِ کلام کھلتا ہے۔

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔

تین کتابیں

بلالؓ

بلالؓ رسول اللہ کے سچے جاں نثار تھے۔ رسولؐ اللہ بھی ان کی قدر کرتے تھے۔ کہنے کو تو بلالؓ حبشی تھے۔ ان کا رنگ سیاہ تھا لیکن دل نورِ ایمان سے منور تھا۔ رسولِ اکرمؐ اور صحابہ کرام انھیں جس احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس سے بڑے بڑے باجبروت فرمانروا بھی محروم تھے ——— بلالؓ کی شخصیت پر یہ پہلی کتاب ہے۔

قیمت ۲/۲۵

عہدِ نبوی کی اسلامی سیاست

ابتداً عالمِ انسانیت جہالت، ناانصافی، ظلم و جور، نسلی تفاخر کے دور سے گزر رہی تھی۔ رسولِ مقبولؐ نے دنیا کو ایک ایسی سیاست سے روشناس کرایا جس میں عدل و انصاف، اتحاد و اتفاق اور مساوات تھی۔ ——— یہ کتاب رسول اللہ کے دور کی سیاسی تاریخ ہے۔ قیمت -/۵

اسلام کا نظامِ عدل

اسلام نے ابتدا ہی میں بڑے بڑے عالموں کو اس لیے قاضی مقرر کر دیا تھا کہ عدل و انصاف ہر چھوٹے بڑے کے لیے ارزاں ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضیوں کے فیصلے حاکمانِ وقت بھی نہیں بدل سکتے تھے اور قاضی جو فیصلے صادر کرتے تھے وہ رسول اللہ صلعم کی تعلیمات اور قرآن کی ہدایتوں کے مطابق ہوتے تھے۔ یہ کتاب موجودہ عدالتی نظام میں بھی ہدایت کا موجب ہوگی۔ قیمت -/۴

اس سے پہلے اُردو میں اتنے اہم موضوعات پر قابلِ ذکر کتابیں ہی نہ تھیں

(تینوں کتابیں چھپ چکی ہیں)

ادارۂ فروغِ اُردو۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

پاک و ہند کے ادیبوں کا اعلان

اِنتخابی پرچوں کے مالکان کے نام

محترم تسلیمات!

آپ نے ہماری درخواست پر انتخابی پرچوں کے مضرت رساں پہلوؤں پر نہ صرف سوچا بلکہ ہمارا ساتھ دیا۔ اس عنایت کے لیے ہم آپ کے شکر گذار ہیں۔

پاک و ہند کے دانشوروں نے اس بات کو محسوس کر لیا ہے کہ انتخابی پرچوں کی بجائے ان رسائل کا ساتھ دینا چاہیے جن کی کچھ ادبی روایات ہیں اور جنھوں نے ماضی میں کچھ کر کے بھی دکھایا ہے۔

آپ کے تعاون سے اگر انتخابی پرچوں کی زیادتیوں کو بروقت نہ روک دیا گیا تو سارے ہی ادبی پرچے بند ہو جائیں گے۔ اب ضرورت ہے کہ آنے والے بُرے وقت کے لیے کچھ آج ہی سوچ لیں —— ہماری یہ جدوجہد اس لیے بھی ہے کہ ایک تو ہم اپنے بچاؤ کے لیے کوشش کریں۔ دوسرے اس لیے بھی کہ مستقبل کا قاری ہمیں موردِ الزام نہ گردانے۔

امید ہے کہ ہم اپنی اس جدوجہد میں ضرور کامیاب ہوں گے —— مگر آپ کے تعاون سے!

آپ کے مخلصانہ تعاون کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہیں۔

حکیم یوسف حسن (مدیر: نیرنگ خیال)
صلاح الدین احمد (مدیر: ادبی دنیا)
میرزا ادیب (مدیر: ادبِ لطیف)
اشفاق احمد (مدیر: لیل و نہار)
نذیر احمد چودھری (مدیر: سویرا)
محمد طفیل (مدیر: نقوش)

بڑے بڑے ادیبوں نے مندرجہ ذیل فارموں پر نہ صرف دستخط کر کے بھیجے ہیں۔ بلکہ اپنے عملی تعاون کا یقین بھی دلایا ہے۔

جنابِ والا!

میں نہیں چاہتا (چاہتی) کہ میرا کوئی مضمون، افسانہ، نظم، غزل، ناولٹ یا ناول کسی بھی انتخابی پرچے میں چھپے (یا بلا اجازت میری کوئی کتاب چھپے) اس لیے کہ اس میں میرا نقصان ہے۔ اگر کوئی رسالہ یا ناشر ایسا کرتا ہے تو میں محمد طفیل مدیر نقوش لاہور کو اس بات کی اجازت دیتا (دیتی) ہوں کہ وہ میرے حق کے لیے قانونی چارہ جوئی کرے[1]

نام کرشن چندر

پتہ [illegible] بمبئی

دستخط کرشن چندر

نوٹ: براہِ کرم یہ فارم پُر کر کے بھیج دیں۔ پھر میں جانوں اور میرا کام، میں اپنا وقت اور روپیہ ضائع کر کے بھی اس بڑے خطرے کو روکنے کی کوشش کروں گا جو مصنفین اور ادبی رسائل کو نقصان پہنچانے کا باعث بنے گا۔

ہندوستان کے مصنفین اگر اس فارم کو پاکستان ہائی کمشنر کی معرفت بھجوا دیں گے تو اس کے قانونی پہلو اور مضبوط ہو جائیں گے۔

— ہندوستان میں بھی کسی کو ایسا ہی قدم اٹھانا چاہیے۔ تاکہ پاکستانی مصنفین اور پبلشروں کے حقوق بھی محفوظ ہو جائیں۔

---

[1] انتخابی پرچوں کے مالکان نے مندرجہ بالا فارم کے سلسلے میں بہت شور بھی مچایا کہ اگر ادیبوں نے یہ فارم پُر کر دیے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ادیبوں نے اپنے تمام حقوق محمد طفیل کو دے دیے ——— اس سلسلے میں میں اعلان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میری حیثیت صرف ایک مختار کی ہے اور بس! (محمد طفیل)

میں نے اس سے پہلے ماہنامہ ... نقوش ... اور ماہنامہ ..... x . . کو اپنی تخلیقات چھاپنے کی اجازت دی تھی ۔ اسے موجودہ حالات میں اپنے لیے اور ادب کے لیے مفید نہیں پاتا ۔ لہٰذا آپ (محمد طفیل مدیر نقوش) میری طرف سے مندرجہ بالا رسائل کے مالکان کو آگاہ کر دیں کہ وہ آئندہ میری کوئی چیز شائع نہ کریں ۔

دستخط ...... شوکت تھانوی ....

پتہ ....

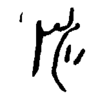
Editor
The Daily JANG Rawalpindi

نصیر الدین ہاشمی — محمد علم الدین سالک — صلاح الدین احمد

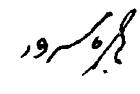
شکیلہ اختر — علی عباس حسینی — وزیر آغا

مہندر ناتھ — احمد جمال پاشا — محمد اسماعیل پانی پتی

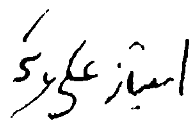
ممتاز شیریں — دیویندر ستیارتھی — شفیق الرحمٰن



رام لعل



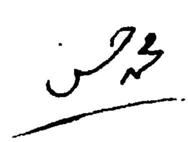
ہاجرہ مسرور



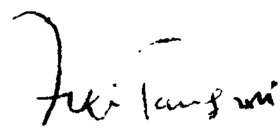
امتیاز علی عرشی



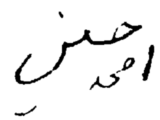
سید اختر احمد اختر اورینوی



ڈاکٹر محمد حسن



فکر تونسوی



امجد حسین



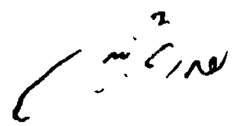
شوکت تھانوی



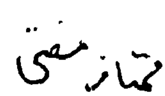
سید جلیل احمد



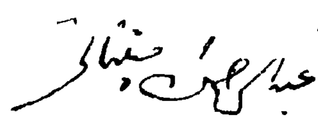
غلام رسول مہر



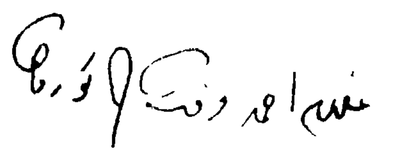
راجندر سنگھ بیدی



ممتاز مفتی



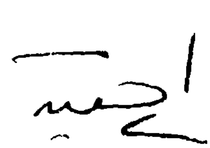
عبدالرحمن چغتائی



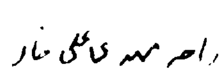
غلام احمد فرقت کاکوروی



احمد سعید



اے حمید



راجہ مہدی علی خاں

عبدالمجید حیرت — جلیل حشمی — آغا صادق — احمد شریف

ڈاکٹر اعجاز حسین — خاطر غزنوی — جمیل ملک — ضیاء الدین احمد برنی

مبارز الدین رفعت — ابن الحسن — نثار احمد فاروقی

اشفاق احمد — عبدالقادر سروری — نور بجنوری

اوپیندر ناتھ اشک — خدیجہ مستور — غلام ربانی تاباں

میرزا ادیب — ابوسعید قریشی — واحدہ تبسم — مجید امجد

رشید احمد صدیقی — امر سنگھ — رتن سنگھ — اقبال صفی پوری

احمد ندیم قاسمی — احمد ظفر — میکش اکبر آبادی

ساغر نظامی — احمد علیخاں شاد عارفی — کرشن چندر

ادیبوں کے بھرپور تعاون کی یہ پہلی قسط ہے۔ دوسری قسط آئندہ پیش کر دی جائے گی۔

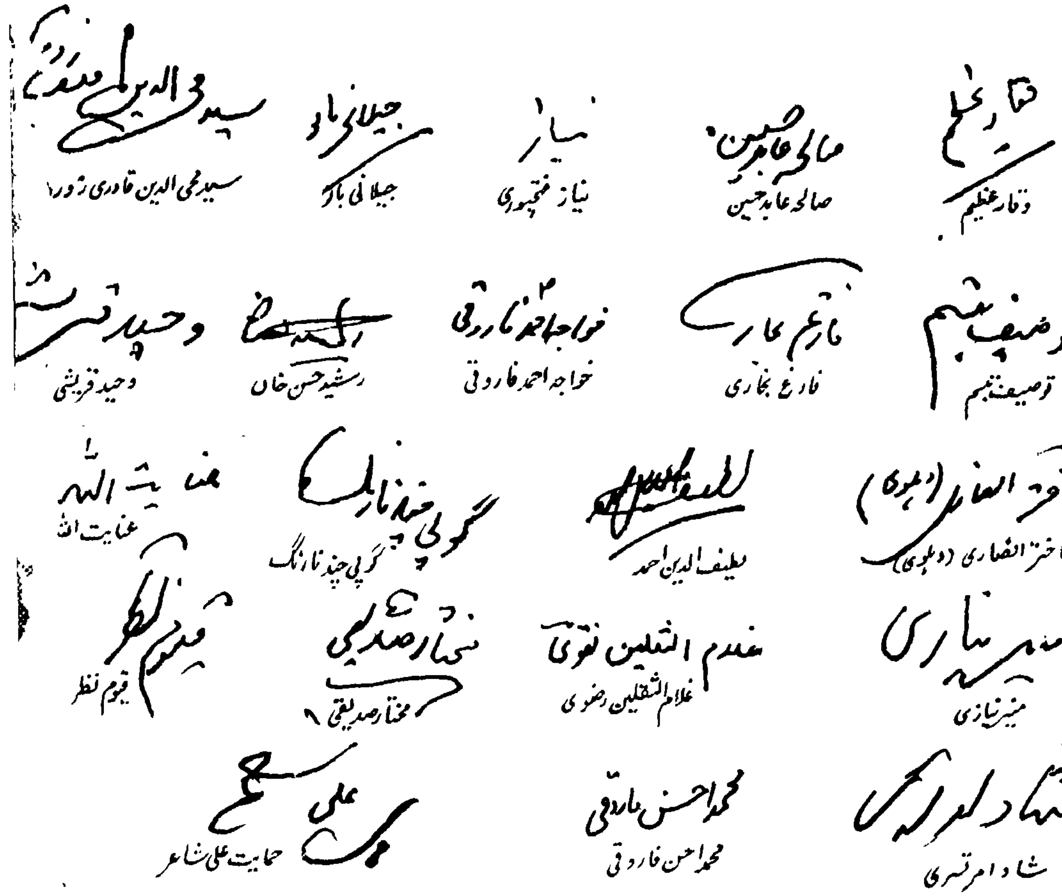
بعض ادیبوں کے نام ہم نے مصلحتاً ابھی نہیں دیے۔ انھیں بہ وقتِ ضرورت کام میں لائیں گے۔

بعض ادیب ابھی سوچ رہے ہیں کہ ہم کس طرح انتخابی پرچوں سے اپنا دامن چھڑائیں۔

بعض ادیبوں نے لکھا کہ اگر انتخابی پرچوں نے زیادتی روا رکھی تو آپ کی بجائے ہم خود مقدمہ کریں گے۔

بعض ادیبوں نے کہا۔ ہمیں آپ کے موقف سے ہمدردی ہے مگر ہمیں بیچ میں نہ لائیے۔ اس لیے کہ آپ کے مخاطب بڑے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں۔

بعض ادیبوں نے لکھا کہ ہم اس معاملے کو جماعتی طور پر سوچ رہے ہیں۔



مندرجہ بالا ادیبوں کے دستخطی اصل اقرار نامے اور تنسیخ نامے سیکرٹری رائٹرز گلڈ (مغربی پاکستان) کو دکھائے جا چکے ہیں۔ انتخابی پرچوں سے ہماری درخواست ہے کہ آئندہ ان کی چیزیں اپنے پرچوں میں شائع نہ کریں۔ اگر کسی پرچے کے پاس اس سے پہلے کوئی اجازت نامہ تھا تو اسے منسوخ سمجھا جائے۔ اگر کوئی ادیب ہمارے ساتھ کیے ہوئے اقرار نامے کو بدلنا چاہے تو سیکرٹری صاحب رائٹرز گلڈ (مغربی پاکستان) کو مطلع کر دے تاکہ وہ تمام متعلقہ اصحاب کو آگاہ کر دیں۔

ہم نقوش میں انتخابی پرچوں کے بارے میں اب کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتے۔

تین کتابیں

ت چور اور چاند۔ (بلونت سنگھ) آج تک اُردو میں کل تین چار ہی تو قابلِ ذکر ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں بھی اب جاکر ایک اور معرکے کے ناول کا اضافہ ہوا ہے۔ جسے بلونت سنگھ نے لکھا ہے۔ یہ ناول قسط وار نقوش میں شائع ہوتا رہا ہے جس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اُس میں بلونت سنگھ کا فن عروج پر ہے۔ جزئیات نگاری بلونت سنگھ پر ختم ہے۔ پنجاب کی زندگی کا بھرپور نقشہ جیسے بلونت سنگھ نے پیش کیا ہے۔ وہ انہی کا حصّہ ہے۔ قیمت سات روپے

ی کی مونا لزا (اے حمید) جتنے خوبصورت افسانے اے حمید نے لکھے ہیں کم کسی نے لکھے ہوں گے ـــ ساری ہی رومانوی فضا، سارے ہی رومانوی کردار ـــ یہ خاصہ صرف انہی کے افسانوں میں ملے گا۔ یہ مجموعہ اے حمید کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا ایک ایک افسانہ، دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ قیمت چار روپے

یک حمام میں ـــ یہ ڈرامہ ایک بڑے ہی معروف ڈرامے "لارنس" کا اُردو ترجمہ ہے جسے عشرت رحمانی نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ڈرامے کی رومانوی فضا اور اس کے جان دار کردار، پھر ان سب کا فنّی تجزیہ ـــ ان سب خصوصیات نے مل کر، اس ڈرامے کو ناقابلِ فراموش شاہکار بنا دیا ہے۔ ڈرامے کی ایک ایک سطر من موہنی ہے
قیمت ۳ روپے

یہ تینوں کتابیں چھپ چکی ہیں